مصنفہ

جناب قاضی محمد نذیر صاحب فاضل
ناظر اشاعت لٹریچر و تصنیف

ناشر

ارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ

فہرست مضامین "ازالۂ شبہات"

صفحہ	مضمون

صفحہ	مضمون
۲۵۰	کرنے کی وجہ سے خاتم النبیین کی تحدید سے باہر ہے۔
۲۵۱	معروف اصطلاحی تعریف نبوت کیوں قابل ترمیم قرار پائی۔
۲۵۴	حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر اپنی شان کے بارہ میں پہلے بیان سے مختلف انکشاف وحی الٰہی سے ہوا۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اپنی شان کے بارہ میں تدریجی انکشاف وحی الٰہی سے ہوا۔ لہٰذا عقیدہ میں تبدیلی کو حقیقی تناقض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اجتماع نقیضین کو چاہتا ہے۔
۲۸۷	آئندہ آنیوالا مسیح
۲۸۹	دابۃ الارض والی آیت کی دونوں تفسیروں میں مجازی دابہ ہی مراد ہے۔
۲۹۲	رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ایک آیت کی دو تفسیروں کا ثبوت۔
۲۹۶	کفر و ایمان کی بحث
۲۹۸	انبیاء معصوم ہیں۔ مگر بادشاہ معصوم نہیں
۲۹۹	غیر مسلم حکومت کی وفاداری سے اطاعت کے معنی یہ ہیں۔ کہ قانون شکنی نہ کی جائے۔
۳۰۱	یہودیوں اور عیسائیوں کو دلی نہ بنانے والی آیات کا مطلب۔
۳۱۰	حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی قانون نہیں توڑا تھا۔ نہ شاہِ مصر ان کے حق میں دستبردار ہوا تھا۔
۳۱۵	احکام القرآن کی تعداد

تمّت

حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

ازالۂ شبہات

ناشر

نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان

ربوہ

مصنّف :- قاضی محمد نذیر صاحب فاضل
ناشر :- نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف
طابع :- سید عبد الحی ایم-اے
مطبع :- ضیاء الاسلام پریس-ربوہ
تعداد :- ایک ہزار
تاریخ اشاعت :- دسمبر ۱۹۷۶ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ حال

کچھ عرصہ ہوا ایک صاحب مسمّی جمیل احمد صاحب نے حضرت امام جماعت احمدیّہ کی خدمت میں اپنے کچھ سوالات بھیجے۔ جوابات کا دیا جانا نظارت اصلاح وارشاد کے سپرد ہوا۔ اور نظارت کی اعانت کرتے ہوئے خاکسار اس کا جواب تیار کر رہا تھا کہ سائل کی ایک اور چٹھی مع بعض زائد باتوں کے موصول ہوئی۔ ان کا جواب مرتب کر کے فل سکیپ سائز کے ۲۲ صفحات پر مشتمل فوٹو سٹیٹ کر کے بھجوا دیا گیا۔ اس پر سائل نے ایک لمبی چوڑی تنقید لکھی اور اس میں کئی نئے سوالات درج کر دیئے جن میں سے بعض حقیقتاً غیر متعلق تھے۔ تاہم خاکسار نے فل سکیپ سائز کے ۱۱۰ صفحات پر اس کا جواب لکھا۔ گویا یہ ایک کتاب بن گئی۔ ابھی یہ جوابات بھجوائے نہیں گئے تھے کہ سوال کنندہ کی طرف سے ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں قبل از وقت یعنی ہمارا جواب پڑھے بغیر کئی نئے سوالات بھی کر دیئے گئے تھے۔ اس کا جواب بطور آخری چٹھی مرتب کر کے سائل کو بھجوا دیا گیا ہے

اس سائل نے اپنی پہلی چٹھی میں بعض سوالات تو پرانے ہی دُہرائے تھے جو عام طور پر لوگ کرتے رہے تھے۔ جن کا جواب احمدیّہ لٹریچر میں کئی بار آچکا ہے۔ لیکن ان کے بعض سوالات ان کے اپنے افکار کا نتیجہ تھے۔ ان کی

پہلی چٹھی سے عمومی تاثر یہ ملتا تھا کہ وہ درحقیقت تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی بعد کی چٹھیوں میں ان کا عناد کھل کر ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ ثابت ہو گیا کہ وہ حوالہ جات قطع و برید سے پیش کرتے ہیں۔ اور اب ایسی زبان استعمال کر رہے ہیں جو ایک متعصّب ہی استعمال کر سکتا ہے۔ ان کی آخری چٹھی سے تو یہ بات پورے طور پر کھل گئی۔ کہ ان کا مقصد تحقیق نہ تھا بلکہ اپنے افکار کی تبلیغ تھی۔ پھر بھی ہم نے اتمام حجّت کی خاطر ان سے سلسلہ مراسلت ختم نہ کیا اور ان کی آخری چٹھی کا جواب بھی بھجوا دیا۔

ہم اپنے جوابی مضامین اپنی جماعت کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہماری جماعت کے نوجوان اس سے کماحقہٗ استفادہ کریں گے۔ اور انہیں یہ رہنمائی حاصل ہو گی کہ اس قسم کے سوالات کے جوابات کس طرح دینے چاہئیں۔

فقط

والسّلام

قاضی محمدؐ نذیر

ناظر اشاعت لٹریچر و تصنیف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٭ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھُوَالنَّاصِرُ

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

مکرمی

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ

آپ کے سوالات حضرت امام جماعت احمدیہ کی طرف سے ہمارے دفتر میں آپ کو جواب دیا جانے کے لئے موصول ہوئے۔ ان سوالات کے جوابات آپ کو بھجوائے جا رہے ہیں۔

آپ نے حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام کی باتوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور آپؑ کی بعض تحریرات سے آپ یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں تناقض ہے۔ اور یہ کہ غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کے پیش کردہ امور میں کوئی حقیقی تضاد موجود نہیں۔ بظاہر اختلاف تو قرآن کریم کی بعض آیات میں بھی موجود ہے۔ لیکن محققین کے نزدیک ان میں تطبیق دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی تحریرات میں جہاں آپ کو اختلاف نظر آیا ہے ان میں بھی تطبیق دی جا سکتی ہے۔ سوال کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے ہم آپ کے سامنے قرآن میں بظاہر اختلاف کی چند مثالیں ذیل میں پیش کرتے ہیں تا آپ کو سمجھ آئے کہ ان میں تطبیق دینے کی ضرورت ہے۔

جو مختلف وجوہ سے ہی دی جا سکتی ہے۔

۱۔ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

(الحج آیت ۴۷) کے بالمقابل آیت تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ۔ (المعارج ۴) ہے پہلی آیت میں ایک دن ہزار سال کا، تو دوسری آیت میں پچاس ہزار سال کا بیان کیا ہے۔

۲۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ کے بالمقابل یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ اِنَّکَ لَتَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (شوریٰ آیت ۵۲) پہلی آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے اور اس کے بالمقابل دوسری آیت میں بیان فرمایا ہے کہ تو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

۳۔ اسی طرح فرمایا۔ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی (سورۃ الضحیٰ) اور ایک دوسری آیت میں فرمایا۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی (سورۃ النجم) پہلے ضال فرمایا اور دوسری آیت میں اس کی نفی کر دی۔

۴۔ ایسے ہی فرمایا۔ وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ۔ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ (سورۃ النساء آیت ۷۸) اس کے بالمقابل ہے آیت مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ

وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ (النساء آیت ۷۹)
پہلی آیت میں فرمایا کہ حسنہ اور سیّئہ سب اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں اور اگلی آیت میں فرمایا کہ حسنہ خدا کی طرف سے اور سیّئہ تیری طرف سے ہے۔

ان آیات میں بہ ظاہر تضاد اور تخالف نظر آتا ہے اور صرف امعانِ نظر سے ہی معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی حقیقی تضاد و تخالف تو موجود نہیں اور ان میں وجوہِ مختلفہ کے لحاظ سے تطبیق دی جا سکتی ہے۔

اسی طرح حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کے کلام میں جو آپ نے تضاد و تخالف دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ بھی حقیقی تضاد و تخالف نہیں۔ جس طرح مندرجہ بالا آیات کو وجوہِ مختلفہ کی بناء پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آپ کے کلام میں بظاہر جو اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بھی وجوہِ مختلفہ سے دُور ہو سکتا ہے آپ کے لئے صرف اُن وجوہ کا جاننا ضروری ہے جن کے نہ جاننے کی وجہ سے سطحی نظر میں آپ کو تخالف نظر آیا ہے۔

آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:۔

سوال نمبر ۱

(۱) لفظ دمشق کی تحقیق:۔ اب یہ بھی جاننا چاہیئے کہ دمشق کا لفظ جو حدیث میں وارد ہے یعنی صحیح مسلم میں جو لکھا ہے۔ کہ حضرت مسیح منارہ سفید مشرقی کے پاس اُتریں گے

یہ لفظ ابتداء سے محقق لوگوں کو حیران کرتا چلا آیا ہے۔ کیونکہ بظاہر کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مسیح کو دمشق سے کیا مناسبت ہے اور دمشق کو مسیح سے کیا خصوصیّت"۔

(حاشیہ ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۶۳ طبع اوّل۔ روحانی خزائن جلد سوم صفحہ ۱۳۴)

سوال :- جو محقق لوگ حیران ہوتے چلے آئے ہیں ان میں سے چند ایک کے نام اور ایک دو کی وہ عبارتیں جن سے ان کا حیران ہونا معلوم ہوتا ہو معہ حوالہ جات مہیا فرمائیں۔ اور یہ بھی لکھیں کہ وہ محقق کس زمانے میں گزرے ہیں؟

الجواب دمشق کی حدیث پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب ازالہ اوہام کے حاشیے کی بناء پر آپ نے ان محققین کے متعلق تاریخی ثبوت مانگا ہے جو اس بات سے پریشان رہے ہیں۔ کہ دمشق میں مسیحؑ کے نزول کی کیا مناسبت ہے۔ اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:-

اوّل :- محلِ نزول کے متعلق پانچ مختلف روایتیں آئی ہیں جن میں تطبیق دینا خالی از صعوبت نہیں۔ لہذا عقلاً اور طبعاً ان روایات کو پڑھ کر آپ بھی پریشان ہوں گے۔ ان روایات میں محلّ نزول پانچ بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابن ماجہ کے حاشیے پر جو نزول مسیحؑ کے بارے میں ایک طویل بحث بیان ہوئی ہے۔ اس کا متعلقہ اقتباس

درج ذیل ہے:۔

۱۔ وقد ورد فی بعض الاحادیث ان عیسٰی علیہ السّلام ینزل ببیت المقدس و فی روایۃ بالاردن و فی روایۃ بمعسکر المسلمین واللہ اعلم۔ (ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۲۰۶ حاشیہ)

۲۔ حدیث ابن عباس میں "جبل اُفیق" پر نزول بیان ہوا ہے۔ (حجج الکرامہ صفحہ ۴۲۲)

۳۔ مسلم میں نواس بن سمعان کی روایت سے ینزل عند المنارۃ البیضاء شرقي دمشق کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

کیا ان روایات کی موجودگی میں محققین کا حیران و پریشان ہونا عقلاً اور طبعاً لازم نہیں آتا؟

دوم:۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بعض محققین نے بیت المقدس والی روایت میں تطبیق دیتے ہوئے بیت المقدس کو دمشق کے مشرق میں بتایا ہے۔ جو واقعات اور مشاہدات کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے کہ بیت المقدس، دمشق سے جنوب مغرب میں ہے۔ نہ کہ مشرق میں! (ملاحظہ ہو نقشہ مندرجہ رسالہ ختم نبوت از مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) پس کیا یہ بعض محققین کی حیرانی اور پریشانی کا ثبوت نہیں؟ بیت المقدس، دمشق سے مشرق میں قرار دیا جانے کی عبارت،

حاشیہ ابن ماجہ سے درج ذیل ہے :-

" قال الحافظ بن کثیر وقد ورد فی بعض الاحادیث ان عیسٰی علیہ السلام ینزل بیت المقدس وفی روایۃ بالأردن وفی روایۃ بمعسکر المسلمین واللہ اعلم ، قلت حدیث نزولہ ببیت المقدس عند المصنف وھو ارجح ولا ینافی سائر الروایات لانّ بیت المقدس ھو شرقی دمشق "

(حاشیہ ابن ماجہ جلد ۲ ص۳۰۳ مطبع مجتبائی دہلی)

سوم :- ہمارے لئے ضروری نہ تھا کہ آپ کی خاطر تاریخی ثبوت مہیا کرتے کیونکہ یہ آپ کے علماء کی غلطی تھی کہ انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کی زندگی میں اُن سے ان محققین کے بارے میں دریافت نہ کر لیا جو دمشق والی حدیث سے پریشان رہے۔ کہ اس کو مسیحؑ کے نزول سے کیا مناسبت ہے۔ آج اسّی سال کے بعد آپ یہ سوال کر رہے ہیں تو کیا آپ نے اس بارے میں پوری تحقیق کر لی ہے۔ کہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کا بیان غلط ہے؟ اگر آپ نے تحقیق نہیں کی تو آپ نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی آپ نے صرف الزام قائم کرنا ہی اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔

چہارم :- ہمارے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت مسیح موعود

علیہ السلام پر الہاماً یہ منکشف ہوا ہو کہ محققین اس طرح پریشان رہے ہیں۔ اگر یہ بات الہامی ہو تو اس کا تاریخی ثبوت مہیا کرنا ہمارے نزدیک ضروری نہیں تھا۔ جیسا کہ حدیث نبوی مَا مِنْ نَبِیٍّ اِلَّا اَنْذَرَ قَوْمَهُ الدَّجَّال، کا مضمون بھی ہمارے نزدیک الہامی ہے۔ اور یہ علم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی خفی کے ذریعہ ملا تھا۔ اگر آپ کو ہمارے اس بیان سے اختلاف ہو تو سابقہ انبیاء کے بیان کے بارے میں تاریخی ثبوت مہیا کریں کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو الدجال سے ڈرایا ہے۔ مگر یہ بات آپ ہر نبی کے متعلق ثابت نہیں کر سکتے۔

سوال ۲

۲۔ چودھویں صدی کا امام :۔ "احادیثِ صحیحہ میں آیا تھا کہ وہ مسیح موعود صدی کے سر پر آئے گا اور وہ چودھویں صدی کا امام ہو گا۔" (ضمیمہ نصرۃ الحق ص۱۸۸ طبع اوّل)

سوال :۔ ان احادیث صحیحہ کا حوالہ مہیا فرمائیں جن میں چودھویں صدی کے امام اور مسیح موعود کا ذکر ہے۔ یعنی جن میں چودھویں صدی اور مسیح موعود کے الفاظ ہوں اور جن میں مندرجہ بالا بات کہی گئی ہو۔

الجواب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ حدیث میں چودھویں صدی کا لفظاً موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے، کہ واقعہ کے وقوع کے پیش نظر کچھ احادیث نبویہ سے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ

نے یہ استنباط فرمایا ہے کہ مسیح موعود کا ظہور چودھویں صدی میں ہونا چاہیئے تھا۔ استنباط کی صورت ہمارے نزدیک یوں ہے:۔

(الف) مسیح موعود بہر حال مجدّدین اسلام میں سے ایک مجدّد ہے اور مجدّدین کے متعلق جو حدیث ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ "انّ اللہ یبعث لھٰذہ الامّۃ علیٰ رأس کلّ مائۃ من یجدّد لھا دینھا" (ابوداؤد) اس سے ظاہر ہے کہ مسیح موعود اور مہدی معہود کی شخصیت کو بھی بہر حال کسی صدی کے سر پر آنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بھی ایک مجدد اسلام ہے۔

(ب) مسیح موعود کا کام بخاری و مسلم وغیرہ احادیث نبویّہ میں یکسر الصلیب کے الفاظ میں کسر صلیب بیان ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں صلیبی مذہب کو غلبہ حاصل ہوگا۔ جس کو توڑنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ چونکہ تیرھویں صدی کے آخر میں صلیبی مذہب دنیا میں غالب ہو چکا تھا۔ اس لئے پہلی حدیث کو اس سے ملا کر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ چودھویں صدی ہی مسیح موعود کا زمانہ ہے۔ کاسر صلیب مسیح موعود کو ہی صحیح بخاری میں امامکم منکم، اور صحیح مسلم میں فامّکم منکم اور مسند احمد بن حنبل جلد ۲ میں اماماً مھدیاً حکماً عدلاً قرار دیا گیا ہے۔ پس وہ اُمّت میں سے امّت کا امام ہے۔ پہلا مسیح بوجہ وفات پا چکا ہونے کے مراد نہیں۔ ان حدیثوں کی رُو سے مسیح موعود اور امام مہدی ایک ہی

شخص ہے۔

حضرت حذیفہؓ بن یمان سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اذا مضت الفٌ ومائتان واربعون سنۃً یبعثُ اللہُ المھدی (النجم الثاقب جلد دوم) کہ جب ۱۲۴۰ سال گذر جائیں گے۔ پھر خدا تعالےٰ مہدی کو مبعوث کریگا اس حدیث سے ظاہر ہے کہ مہدی ۱۲۴۰ سے پہلے نہیں آسکتا۔ ۱۲۴۰ سال کے بعد اس کا ظہور ہوگا۔ اس سے بھی استنباط ہوتا ہے کہ وہ شخص جو مہدی معہود ہے ۱۲۴۰ کے بعد یعنی تیرھویں صدی کے آخر میں بہر حال موجود ہونا چاہیئے۔ واقعہ کی شہادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مہدی معہودؑ کو چودھویں صدی کے شروع میں بھیجا۔ اس لئے اس واقعہ کے وقوع پر دونوں حدیثوں کی تشریح، مجدّدین والی حدیث کو ملا کر یہی ہوسکتی ہے کہ مسیح موعود کو چودھویں صدی کے شروع میں آنا چاہیئے۔ کیونکہ واقعہ کا وقوع، نصوص کی صحیح تشریح ہوتا ہے ٭

سوال ۳

(۳) ہر گورنمنٹ کی وفاداری۔ یہ ایک واقعی امر ہے کہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کا حکم ہے کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت ہوں وفاداری سے اس کی اطاعت کریں۔"

(کشف الغطا صفحہ طبع اوّل۔ صفحہ طبع چہارم)

سوال:- (۱) قرآن مجید کی وہ آیت اور وہ حدیث جس میں محض اجازت نہیں بلکہ مسلمانوں کو حکم ہو کہ وہ جس گورنمنٹ کے تحت بھی ہوں اس کی وفاداری سے اطاعت کریں پیش کی جائے۔

(۲) یہ وفاداری سے اطاعت کا حکم غیر مشروط ہے یا مشروط۔ اگر مشروط ہے تو قرآن و حدیث کی رُو سے وہ شرائط بتائی جائیں۔

(۳) جہاں تک میں سمجھتا ہوں قرآن مجید مسلمانوں کو اللہ رسول اور اولی الامر منکم یعنی وہ صاحب امر جو مسلمان ہو کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے دیکھئے آیت ۴/۵۹۔ منکم سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ جہاں تک مرزا صاحب کا تعلق ہے انہوں نے منکم کے متعلق خطبۂ الہامیہ صفحہ ۱ پر لکھا ہے "وہ تمہارا امام تم میں سے ہی ہو گا۔ یعنی تمہاری قوم سے نہ کسی دوسری قوم سے۔ اس قول میں کہ منکم ہے فکر کرو اور پرہیزگاروں کی طرح غور کرو" ایسا ہی کئی اور جگہ لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ صاحب انجیل امامکم منکم نہیں ہو سکتے تو غیر مسلموں یا انگریزوں کی حکومت کس طرح مسلمانوں کے لئے اولی الامر منکم ہو سکتی ہے اور مرزا صاحب نے کس بنیاد پر انگریزوں کی اطاعت کا حکم دیا؟

الجواب اپنے دوسرے خط میں آپ نے سوال ۳ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ "اجازت اور حکم میں جو فرق ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس لئے آپ قرآن و حدیث سے ایسے حوالہ جات مہیا فرمائیں۔ جن سے محض اجازت نہیں بلکہ وفاداری سے اطاعت کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ درحقیقت احمدی علماء بھی مرزا صاحب کو سچا نہیں سمجھتے"۔ آپ کا آخری فقرہ محض بدظنی پر مبنی ہے۔ کہ احمدی علماء بھی مرزا صاحب کو سچا نہیں سمجھتے۔ اس سے پہلے عبارت میں آپ نے اجازت اور حکم میں فرق ظاہر کر کے وفاداری سے اطاعت کا حکم کے لئے حوالہ طلب کیا ہے اجازت کے لئے نہیں۔

یہ خیال آپ کو کیوں پیدا ہوا کہ ہم اجازت دکھائیں گے نہ کہ حکم۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ غیر مسلم کی حکومت کی اطاعت کی اجازت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وفاداری سے اطاعت کا حکم تسلیم نہیں کرتے۔ تب ہی آپ کو یہ مطالبہ پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ کہ آپ کو اجازت کا ثبوت نہ دیا جائے۔ بلکہ وفاداری سے اطاعت کے حکم کا ثبوت دیا جائے۔ اب ہمارا سوال آپ سے یہ ہے کہ آپ کے نزدیک اسلام میں غیر مسلم حکومت کی اجازت کا ثبوت کسی آیت اور حدیث نبوی میں ملتا ہے ہے یا نہیں؟ اگر ملتا ہے تو آپ پر فرض ہے کہ وہ آیت اور حدیث پیش کریں۔ جس سے اجازت کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر جواب میں آپ یہ کہیں کہ میرے نزدیک، تو اجازت بھی ثابت نہیں تو پھر ہمارا سوال آپ سے یہ ہو گا

کہ کیا غیر مسلم حکومت کی بغاوت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہوگا۔ یہ کس آیت اور حدیث سے ثابت ہے؟ پھر اگر فی الواقعہ یہ امر آپ کے نزدیک ثابت ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ تو پھر ہر غیر مسلم حکومت کے حکام اپنی حکومت میں مسلمانوں کے وجود کو خطرناک وجود سمجھیں گے۔ بہرحال اطاعت کی اجازت یا بغاوت، دونوں میں سے جو امر آپ قرآن و حدیث کی رُو سے ضروری سمجھتے ہیں اس کی سند پیش کریں۔ تا آپ کے اسلام کا ہم جائزہ لے سکیں۔

ہمارے نزدیک تو آیت اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم میں وفاداری سے تینوں کی اطاعت مراد ہے۔ اللہ کی اطاعت بھی۔ رسول کی اطاعت بھی۔ اور اولی الامر کی اطاعت بھی۔ اور اطیعوا امر کا صیغہ ہے لہذا اولی الامر کی بھی وفاداری سے ہی اطاعت کا حکم ہے۔ کیونکہ نفاق کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ اولی الامر کا لفظ عام ہے اور مراد اس سے ہر وہ شخص ہے جس کے سپرد مسلمانوں کے کام ہوں عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں اولی الامر کے لفظ کے متعلق لکھا ہے:

"عامٌ فی کل من ولی امر شیٔ و ھو الصحیح والیہ مال البخاری بقولہ ذوی الامر"۔

(بخاری کتاب التفسیر جلد ۳ اور عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ۵۵۴)

اولوا الامر کا لفظ عام ہے ہر اس شخص کیلئے ہے جو کسی شئے کا ولی امر ہو اور یہی صحیح ہے اور اسی کی طرف البخاری کا اپنے قول ذوی الامر میں مائل ہے۔

لفظ منکم خاص معنے بھی دیتا ہے اور عام بھی۔ عام معنے یہ کہ نوع انسانی کا فرد ہیں۔ سورۃ زمر کی ایک آیت میں ہے۔ وسیق الذین کفروا الی جہنم زمرا حتی اذا جاؤھا فتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکم (زمر آیت ۷۱) کہ کافر گروہ در گروہ جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے جب وہ جہنم کے پاس جائینگے اسکے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے داروغے انہیں کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آتے۔

جناب من! اب رسول کافر تو نہیں ہوتا۔ اس لئے منکم سے اس جگہ بنی نوع انسان ہی مراد ہیں۔ پس منکم کا لفظ بنی نوع انسان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے یہی مفہوم اولی الامر منکم میں بھی مراد ہو سکتا ہے۔ کہ بنی نوع انسان میں سے جو تمہارا صاحب امر ہو۔ خدا کہتا ہے اس کی اطاعت کرو۔ اور خدا چونکہ نفاق نہیں سکھاتا۔ اس لئے اس اطاعت سے مراد وفاداری والی اطاعت ہی ہے۔

ماسوا اس کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف لا کر جب قوموں سے معاہدات کئے تو بنی عوف کے یہود کے متعلق فرمایا:۔

"ان یھود بنی عوف امۃ من المؤمنین یریدُ انھم فی الصلح الذی وقع بینھم وبین المؤمنین کجماعۃ منھم کلمتھم وایدیھم واحدۃ۔" (النھایۃ لابن الاثیر حصہ اول صفحہ ۲۳)

کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی عوف کے یہود کے متعلق فرمایا کہ وہ مومنوں سے ہی ایک گروہ ہے۔ شارح کہتا ہے آپ کی مراد یہ ہے کہ وہ لوگ صلح کی وجہ سے جو ان یہودیوں کے درمیان اور مومنوں کے درمیان واقع ہوئی۔ ان سے ہی ایک جماعت کی طرح ہو گئے اور ان کا کلمہ اور قوت ایک ہو گئی۔

اس جگہ منہم کا لفظ اور من المومنین کے الفاظ غیر مسلم یہودیوں کے لئے صلح کرنے کی وجہ سے استعمال ہوئے ہیں۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرزِ عمل ملاحظہ ہو۔ آپؐ نے صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا ارشاد فرمایا کہ وہاں انہیں امن ملے گا۔ وہاں کا بادشاہ عیسائی تھا۔ کیا حضورؐ نے ان کو بغاوت کی تعلیم دے کر بھیجا تھا۔ کہ اس کے ملک میں رہیں تو سہی۔ لیکن اس کے حاکم کا حکم نہ ماننا۔ یہ بات خلافِ عقل ہے۔ کہ آپؐ ایسا حکم دیں کیونکہ آپؐ تو خود ہی رائج الوقت قانون کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔ دلیل اس کی آپؐ کا اپنا عمل ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے تو مکہ کی حکومت نے آپؐ کی شہریت کے حقوق غصب کر لئے۔ اس پر آپؐ اُن کے قانون کے مطابق مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے آپؐ نے ان کے دوسرے قانون کی پابندی کی۔ اور ایک مکی کافر سے امداد لے کر آپؐ اس کے توسط سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بھی اپنے زمانہ کے بادشاہ کے قانون کے پابند تھے۔ حسب آیت ما کان لیأخذ اخاہ فی دین الملک (سورۂ یوسف) اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی رومی حکومت کے ماتحت رہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ اطاعت کا حکم مشروط ہے۔ یا غیر مشروط؟ اگر مشروط ہے تو قرآن وحدیث کی رُو سے وہ شرائط بتائی جائیں۔

واضح ہو کہ قرآن مجید میں یہ شرط بیان ہوئی ہے فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ اور رسول کا حکم مقدم ہے۔ اور حدیث نبوی میں وارد ہے لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق، کہ کسی مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے (مسلم ہو یا غیر مسلم) جس میں خالق کی نافرمانی پائی جاتی ہو۔ پس جہاں حکومت مذہبی معاملات میں دخل دیتی ہو وہاں بھی اسلام بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ ہجرت کی اجازت دیتا ہے اور بغاوت اس وقت جائز ہوتی ہے جب حکومت دین میں مداخلت بھی کرے اور ہجرت کی اجازت بھی نہ دے۔ مداخلت فی الدین سے مراد عبادات اور فرائض میں مداخلت ہے۔ سیاسی امور میں حکومت اور رعایا کے درمیان تعاون کا اصول مدنظر رہنا چاہیئے۔ اسلامی سیاست کے احکام وہاں نافذ ہوں گے جہاں خالصۃً اسلامی حکومت قائم ہو۔ چونکہ انگریزی حکومت کے ماتحت

دہنا مسلمانوں نے اپنے پرائیویٹ پرسنل لاء کی آزادی کے ساتھ قبول کرلیا تھا۔ اس لئے انگریزی حکومت سے سمجھدار اور عاقبت اندیش مسلمان وفادار رہے۔ اور پرسنل لاء کی آزادی کے حصول کے بعد بغاوت نہیں کی۔ اور انگریزوں سے آزادی بھی آئینی طریق سے حاصل کی نہ کہ بغاوت سے۔

آپ کے سوال کا دوسرا حصّہ یہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ صاحب انجیل اماماکم منکم نہیں ہو سکتے، تو غیر مسلموں یا انگریزوں کی حکومت کس طرح مسلمانوں کے لئے اولی الامر ہو سکتی ہے؟

اس کے جواب میں یہ واضح ہو کہ اُولو الامر منکم میں منکم سے مراد ہمارے نزدیک حقیقۃً تو مسلمان، یعنی امتِ محمدیہ کے افراد ہیں۔ اور حکماً غیر مسلم بھی، جو حاکمِ وقت ہوں۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ حدیثِ نبویؐ کیف أنتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم (البخاری) میں منکم سے مراد حقیقی منکم ہے۔ یا حکمی منکم؟ اس کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ اس جگہ منکم سے مراد حکماً منکم نہیں، بلکہ حقیقتاً منکم ہے، جو امتِ محمدیہ کا فرد ہو، جس پر ہمارے نزدیک قرآن مجید سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی وفات کا ثابت ہونا قرینہ حالیہ ہے، جو اس بات کی تائید کر رہا ہے کہ اس جگہ منکم سے مراد امتِ محمدیہ کا ہی فرد ہے۔ لاغیر۔ چونکہ حضرت مسیح ناصری علیہ السلام بوجہ وفات پا جانے کے حسب آیت فیمسك التی قضی علیها

الموت (سورۃ زمر) اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے۔ اس لئے حدیث ہذا میں ابن مریم سے بطور استعارہ ابن مریم مراد ہے نہ بطور حقیقت کے۔ اور منکم سے مراد حکماً منکم نہیں بلکہ حقیقتاً منکم ہے۔

ماسوا اس کے، آپ کو تو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اور خود ہی سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ ہماری طرف سے اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ آپ نے اولی الامر منکم کے معنوں میں لکھا ہے:۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں قرآن مجید میں مسلمانوں کو اللہ اور رسول اور اولی الامر منکم، یعنی وہ صاحب الامر جو مسلمان ہو، کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔"

جب آپ کے نزدیک منکم کے اس جگہ حقیقی معنی یہی ہیں تو حدیث نبویؐ زیر بحث میں اماماکم منکم کے الفاظ سے کیوں امت کا فرد مراد نہیں لیتے۔ اور اپنے تشریحی معنوں کو نظر انداز کر کے انصاف کو ہاتھ سے چھوڑ رہے ہیں۔

جناب من! ہمارے اور آپ کے درمیان اصل اختلاف اس بات میں ہے۔ کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں۔ اگر آپ ان کی حیات ثابت کر دیں تو اماماکم منکم میں بھی منکم کے حکمی معنے تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ پس آپ کو اصل بحث کی طرف آنا چاہیئے۔ تاکہ مسئلہ زیر بحث کی حقیقت کو سمجھنے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ اور وہ اصل بحث طلب مسئلہ وفات وحیات

مسیحؑ کا ہے اس کی طرف آئیں۔

ہمارے نزدیک قرآن کریم سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات روزِ روشن کی طرح ثابت ہے۔ بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کے اس بیان سے جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں موجود ہے۔ و کنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلمّا توفّیتنی کنت انت الرقیب علیھم۔ میں ان لوگوں کا نگران اس وقت تک رہا۔ جب تک میں ان میں موجود تھا اور جب تُو نے مجھے وفات دے دی۔ تو تُو ہی ان کا نگران تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ ایسا ہی بیان میں قیامت کے روز دونگا وکنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلمّا توفّیتنی کنت انت الرقیب علیھم۔ پس جس طرح فلمّا توفّیتنی کے الفاظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بیان میں آپ کی وفات کو ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بیان میں فلمّا توفّیتنی کے الفاظ ان کی وفات پر نصِ صریح ہیں۔

سوال ۱۴

۴۔ قرآن مجید کے حکم:- (۱) "اور یاد رکھو کہ قرآن کریم میں پانسوؔ کے قریب حکم ہیں"۔ (ازالہ اوہام حصہ اوّل ص۳۴۸ طبع اوّل۔ روحانی خزائن جلد سوم ص۳۲۵)

(۲) "قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ جن احکام پر اللہ جلّ شانہٗ انسان کو قائم کرنا چاہتا ہے وہ چھ ۶۰۰ سو ہیں۔ ایسا ہی اس کے مقابل پر جبرائیل علیہ السلام کے پر بھی چھ ۶۰۰ سو ہیں"۔
(روحانی خزائن جلد پنجم۔ دافع الوساوس صفحہ ۱۹۶)

(۳) "مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص قرآن کے سات ۷۰۰ سو حکم میں سے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی ٹالتا ہے وہ نجات کا دروازہ اپنے ہاتھ سے اپنے پر بند کرتا ہے"۔
(کشتی نوح صفحہ ۲۴ طبع اول صفحہ ۳۸ طبع موجودہ)

سوال نمبر ۱:۔ قرآن کریم میں کتنے حکم ہیں؟ پانسو۔ چھ سو۔ یا سات سو۔ اور اگر کم و بیش ہوتے رہتے ہیں تو آجکل کتنے ہیں۔ اور کمی بیشی کس بنیاد پر ہوتی ہے؟

سوال نمبر ۲:۔ قرآن مجید سے کیسے ثابت ہے کہ جن احکام پر اللہ جلّ شانہٗ انسان کو قائم کرنا چاہتا ہے ان کی تعداد چھ ۶۰۰ سو ہے؟

الجواب حکم کا لفظ فقہی اصطلاح ہے۔ جو فرض، واجب، مستحب، عزیمت اور رخصت وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے اصولی اور فرض احکام جو عبارۃ النص کے لحاظ سے مصرح ہیں پانسو کے قریب ہی ہیں۔ اور دلالۃ النص سے چھ سو ہیں اور اصولی اور فروعی احکام ملا کر سات سو ہیں۔

حکم کا لفظ فقہی اصطلاح میں صرف فرض احکام کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتا۔ جو امر و نہی کے صیغہ پر مشتمل ہو۔ سو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی مذکورہ بالا تینوں عبارات میں سے پہلی عبارت میں اصولی احکام مراد لیں۔ جو امر و نہی کتب و حرم وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اور دوسری عبارت میں فرائض اور واجبات مراد لئے جائیں۔ اور تیسری عبارت میں مجموعہ اصول و فروع مراد لیں۔ تو آپ کی ان تینوں عبارتوں میں ان وجوہ سے کوئی تناقض اور تضاد موجود نہیں۔ بعض ضروری حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔ جو اس مضمون پر مشتمل ہیں کہ آیات الاحکام پانچ سو ہیں۔ اور آیات قصص و امثال سے تو بہت سے احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ بعض نے الآیات المحکمات پانچ سو قرار دی ہیں۔ جو ام الکتاب ہیں اور جو فروعی احکام کے لئے جو ان سے مستنبط ہوتے ہیں بمنزلہ ماں کے ہیں:-

(۱) انّ أیات الاحکام خمسائۃ أیۃ وھذا ذکرہ الغزالی وغیرہ وتبعھم الرازی و لعلّ مرادھم المصرّح بہ وانّ أیات القصص والأمثال وغیرھا یُستنبط منھا کثیر من الاحکام" (البرہان فی علوم القرآن، للامام بدر الدین محمد بن عبد اللہ الزرکشی تحقیق ابو الفضل ابو ابراہیم، الجزء الثانی صفحہ ۳، دار الاحیاء الکتب العربیہ

الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۷۶ھ - ۱۹۵۷ء)

(۲) "هو الذی انزل علیک الکتاب منه اٰیات محکمات هنّ امّ الکتاب واخر متشابهات"
وقال مقاتل المحکمات خمس مائة اٰیة لانها تبسط مدانیها فکانت امّ فروع قیست علیها وتولدت منها کالامّ یحدث الولد ولذلك سماها امّ الکتاب" (تفسیر البحر المحیط جلد ثانی صفحہ ۳۸۱ اثیر الدین ابی عبد الله محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حیان الاندلسی ۶۵۴-۷۵۴ھ - مطبعۃ السعادہ مصر ۱۳۲۸ھ الطبعۃ الاولیٰ)

سوال ۵

۵- ۲۷/۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کا زلزلہ:- (۱) اس وقت تک جو ۲۲ر جولائی ۱۹۰۶ء ہے۔ اس ملک میں تین زلزلے آچکے ہیں یعنی ۲۸ر فروری ۱۹۰۶ء اور ۲۰ر مئی ۱۹۰۶ء اور ۲۱ر جولائی ۱۹۰۶ء۔ مگر غالباً خدا کے نزدیک یہ زلزلوں میں داخل نہیں۔ کیونکہ بہت ہی خفیف ہیں۔ شاید چار زلزلے پہلے ایسے ہوں گے جیسا کہ ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کا زلزلہ تھا۔ اور پانچواں قیامت کا نمونہ

ہو گا۔" (حاشیہ حقیقۃ الوحی صد ۹۳ طبع اوّل صد ۹۶ طبع پنجم)

(۲) "تب ۲۷؍ فروری ۱۹۰۶ء کی رات کو عین وسط بہار میں ایک بجے کے وقت ایسا سخت زلزلہ آیا کہ انگریزی اخبارات سول وغیرہ کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ یہ زلزلہ ۴؍ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے برابر تھا۔"

(تجلیات الٰہیہ صد ۱۳ طبع چہارم)

سوال:- ۲۷/۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کا زلزلہ بہت ہی خفیف اور ۴؍ اپریل ۱۹۰۵ء سے کم تھا یا ایسا سخت کہ ۴؍ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے برابر؟

(۲) اگر ۲۷؍ فروری عین وسط بہار ہوتا ہے تو ہندوستان میں بہار کا موسم کب شروع ہوتا ہے اور ختم کب؟

(۳) اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب کو پانچ زلزلوں میں کتنے زلزلے دکھائے۔ یا کیا کچھ دکھایا جا چکا ہے اور کیا کچھ باقی ہے؟

الجواب (الف) حقیقۃ الوحی اور تجلیات الٰہیہ سے، زلزلہ سے متعلقہ جو دو عبارتیں آپ نے پیش کی ہیں۔ اُن میں دراصل کوئی تضاد موجود نہیں۔ آپ توجہ کے ساتھ دونو عبارتوں کا پھر مطالعہ کریں۔ ان دونو عبارتوں میں ۲۷/۲۸ فروری کی رات کے زلزلہ کو، باوجود اس کے اپنی ذات میں غیر معمولی اور شدید ہونے کے، حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے عندیہ میں ایسا شدید نہیں سمجھا کہ اسے پانچ موعودہ شدید زلزلوں میں شمار فرماتے۔ گو اس کے متعلق بھی

الگ الگ پیشگوئی موجود تھی جس میں اسے اپنی ذات میں غیر معمولی قرار دیا گیا تھا۔ یہ زلزلہ بموجب اشتہار ۹؍اپریل ۱۹۰۶ء (مندرجہ اخبار الحکم ۳۰؍اپریل ۱۹۰۶ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق ۲۵؍فروری سے پہلے نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی ۲۷/۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کی رات کے زلزلہ سے شاندار طریق سے پوری ہوگئی۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام اسے ان پانچ زلزلوں میں شامل نہیں فرماتے جو ایک دوسری پیشگوئی میں موعود ہیں۔

پانچ مذکورہ زلزلوں کی پیشگوئی میں سے پہلے زلزلہ کے متعلق خطرہ، حضورؑ نے جنوری کے آخر سے قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض درختوں پر پتے نکل آتے ہیں۔ چنانچہ آپؑ "الوصیۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اور چونکہ آخر جنوری میں بعض درختوں کا پتہ نکلنا شروع ہو جاتا ہے اس لئے اسی مہینے سے خوف کے دن شروع ہوں گے اور غالباً مئی کے آخر تک وہ دن رہیں گے۔"

(ب) "الوصیت" کی اس عبارت سے یہ ظاہر ہے کہ پانچ موعود زلزلوں میں سے پہلے زلزلہ کے خطرہ کے لحاظ سے بہار کا موسم حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے نزدیک جنوری کے آخر سے شروع ہوتا ہے۔ اور مئی کے آخر تک خطرہ کے ایام ہیں۔ ۲۷/۲۸ فروری کی رات کے زلزلہ کو عین وسطِ بہار میں قرار دینے کے الفاظ کا مفہوم، عین اثناءِ بہار ہے یا عین دورانِ بہار ہے۔ اور ۲۸؍فروری کا دن یقیناً عین اثناءِ بہار یا دورانِ بہار کا

دن ہے۔ اس عبارت میں عین کے بعد "وسط" پڑھیے، "وشط" نہ پڑھیے
وسط کے معنے درمیان کے ہوتے ہیں اور وسط کا لفظ اس جگہ دوران
یا اثناء کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(ج) اس تحقیق کی رُو سے پانچ زلزلوں میں سے حضرت مسیح موعود
علیہ السلام کی زندگی میں کوئی زلزلہ نہیں آیا (ملاحظہ ہو حقیقۃ الوحی
ص۹۰ حاشیہ) جس سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک صرف تین زلزلے
آچکے تھے۔ جو اُن موعودہ پانچ زلزلوں میں شامل نہیں قرار دیئے گئے۔

سوال ۶

۶۔ حضرت عیسیٰؑ کے پرندوں کی پرواز:۔ (۱) "اور یہ بھی
یاد رکھنا چاہیئے کہ ان پرندوں کا پرواز کرنا قرآن شریف
سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا ہلنا اور جنبش کرنا
بھی بپایۂ ثبوت نہیں پہنچتا" (ازالہ اوہام حاشیہ ص۳۰۷
طبع اوّل۔ روحانی خزائن جلد سوم ص۲۵۶)

(۲) "اور حضرت مسیح کی چڑیاں باوجودیکہ معجزہ کے طور پر
اُن کا پرواز کرنا قرآن سے ثابت ہے مگر پھر بھی مٹی کی
مٹی تھے" (روحانی خزائن جلد پنجم دافع الوساوس ص۶۸)

سوال: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پرندوں کا معجزہ کے طور پر پرواز
کرنا قرآن سے ثابت ہے یا نہیں؟ کیونکہ پہلی عبارت کی رُو سے

ہرگز نہیں اور دوسری کی رُو سے ثابت ہے۔

الجواب آپ نے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کی دو عبارتیں نقل کی ہیں۔ جن میں سے عبارت اوّل میں پرندوں کی پرواز اور حرکت از رُوئے قرآن مجید ثابت نہیں قرار دی گئی اور عبارت دوم میں ان کی معجزانہ پرواز ثابت قرار دی گئی ہے۔

سو واضح ہو کہ ان دونوں مذکورہ عبارتوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ جس عبارت میں پرواز و حرکت کی نفی کی گئی ہے۔ اس میں پرواز و حرکت حقیقی اور واقعی مراد ہے۔ اور دوسری عبارت میں معجزہ کے طور پر پرواز تسلیم کی گئی ہے۔ جو عارضی تھی، نہ کہ حقیقی۔ کیونکہ حقیقی پرواز، حیاتِ حقیقی کو چاہتی ہے۔ جو گوشت و پوست اور خون و رگ والی حیات کی صورت میں ہو۔ اور یہ کیفیت معجزہ والی پرواز کو حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا پرواز کی نفی بھی مِنْ وَجْہٍ ہے۔ اور اثبات بھی مِن وجہٍ ہے۔ اور وجوہ مختلف ہونے کی وجہ سے تناقض کی شرط مفقود ہے۔

اگر اس جگہ پرندوں کی حقیقی پرواز مان لی جائے تو حضرت مسیح علیہ السلام کو صفتِ خلق میں خدا کا شریک قرار دینا پڑے گا۔ اور یہ امر قرآن کی آیت قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔ (رعد آیت ۱۶) کے خلاف ہے۔

——— فتنہ نمبر ———

سوال ۷

۷۔ اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان سوال وجواب۔

(۱) "افسوس کہ بعض علماء جب دیکھتے ہیں کہ توفی کے صحیح حقیقت میں وفات دینے کے ہیں تو پھر یہ دوسری تاویل پیش کرتے ہیں۔ کہ آیت فلما توفیتنی میں جس توفی کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰ کے نزول کے بعد واقع ہوگی۔ لیکن تعجب کہ وہ اس قدر تاویلات رکیکہ کرنے سے ذرہ بھی شرم نہیں کرتے۔ وہ نہیں سوچتے کہ آیت فلما توفیتنی سے پہلے یہ آیت ہے واذ قال اللہ یٰعیسیٰ ءَاَنتَ قُلتَ لِلنّاسِ الخ اور ظاہر ہے کہ قال کا صیغہ ماضی کا ہے اور اس سے اوّل اذ موجود ہے جو خاص واسطے ماضی کے آتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ وقت نزول آیت زمانہ ماضی کا ایک قصہ تھا نہ زمانہ استقبال کا۔" (ازالہ اوہام حصہ دوم ۶۰۲ طبع اوّل۔ روحانی خزائن جلد سوم ۴۲۵)

(۲) "حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سوال حضرت مسیح سے عالم برزخ میں ان کی وفات کے بعد کیا گیا تھا نہ یہ کہ قیامت میں کیا جائے گا۔ پس جس آیت کی

تفسیر کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود ہی کھول دیا
پھر اگر کوئی تفسیر نبویؐ کو سنکر شک میں رہے تو اس
کے ایمان اور اسلام پر افسوس اور تعجب نہ کریں تو اور
کیا کریں "
(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۰۶/۶۰۷ طبع اوّل - روحانی خزائن
جلد سوم صفحہ ۵۰۳)

(۳) "قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت
ہو چکے ہیں - اور پھر دوبارہ دنیا میں ہرگز نہیں آئینگے
جیسا کہ اللہ تعالے انہی کی زبان سے فرماتا ہے فلمّا
توفّیتنی کنت انت الرقیب علیھم - پہلی
آیتوں کو ساتھ ملا کر ترجمہ یہ ہے - کہ خدا تعالیٰ قیامت
کو حضرت عیسےٰؑ سے پوچھے گا کہ کیا تو نے ہی یہ تعلیم دی
تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے ماننا اور ہماری
پرستش کرنا " (لیکچر لاہور صفحہ ۴۶ - نیز حقیقۃ الوحی
صفحہ ۳۳ طبع پنجم - نیز اسلامی نظریہ صفحہ ۹۸ میں بھی زمانہ مستقبل
مراد لیا گیا ہے نہ کہ زمانہ ماضی)

سوال :- (۱) حضرت عیسےٰ سے سوال و جواب زمانہ ماضی کا قصہ ہے
یا قیامت یعنی مستقبل کا؟ کیونکہ پہلی دو عبارتوں کی رُو سے
قیامت کا قصہ نہیں ہو سکتا اور تیسری کی رُو سے ہے۔

(۲) مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ صیغہ ماضی سے پہلے اِذْ موجود ہونا عام طور پر نہیں بلکہ خاص واسطے ماضی کے آتا ہے درست معلوم نہیں ہوتا۔ دیکھئے آیت ۲/۱۲۶ - ۶/۲۰ - ۲/۳۰ اور ۳۴/۵۱ اور آیت زیر بحث یعنی فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِی سے پہلے اِذْ قَالَ اللّٰہ کا ترجمہ تو وہ خود بھی ماضی کی بجائے مستقبل کے لئے کر گئے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

الجواب | اس آیت کے معنے کے بارے میں علماءِ امّت کے نزدیک دو احتمال ہیں:۔

(۱) کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال وجواب عالمِ برزخ میں ہو چکا ہے۔

(۲) کہ یہ سوال وجواب قیامت کے روز ہوگا (ملاحظہ ہو تفسیر حسینی)

(الف) ازالہ اوہام میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے احتمالِ اوّل کو لیا ہے۔ جو قواعد عربیہ کے عین مطابق ہے۔ یعنی جب ماضی پر اِذْ داخل ہو، تو فعل زمانہ ماضی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ اس سے آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ مسیح کی وفات ہو چکی ہے کیونکہ اپنی وفات پا جانے کا عالمِ برزخ میں ذکر کر چکے ہیں۔

(ب) کئی مفسرین کے نزدیک، اس جگہ اس بات کا احتمال ہے، کہ یہ سوال وجواب قیامت کے دن ہوگا۔ اور اِذْ قَالَ کا استعمال بصیغہ ماضی بطور پیشگوئی کے ہے۔ اس لئے ایسے مفسرین کے مسلمات کی رو سے

بھی حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو ان احتمالی معنوں پر بھی بحث کرنا پڑی ہے۔ آپ نے ان معنوں کے لحاظ سے بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ جب قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ جواب دیں گے تو اُس سے بھی اُن کی وفات ہی ثابت ہے۔ جس پر ان کے بیان کے الفاظ "وکنتُ علیھم شہیدًا مّا دمتُ فیھم فلمّا توفّیتنی کنتَ انتَ الرقیب علیھم" شاہد ناطق ہیں۔ کہ ان کی قوم اُن کی زندگی میں نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد بگڑی۔ قیامت کے دن تک انہیں اپنی قوم کے بگاڑ کا مشاہداتی علم نہیں ہوگا۔ اس کے متعلق لاعلمی اس بات پر روشن دلیل ہے کہ وہ دوبارہ قوم میں نہیں آئینگے

اصل قاعدہ تو یہی ہے کہ لفظ اِذْ ماضی پر داخل ہو کر فعل کو زمانۂ ماضی کے لئے مخصوص کر دیتا ہے۔ لیکن چونکہ پیشگوئی قرار دیکر مستقبل کے معنوں کا بھی احتمال مفسّرین نے مراد لیا تھا اس لئے ان احتمالی معنوں کی بناء پر بھی آپ نے ان معنوں کے اختیار کرنے والوں کے لئے ثابت کر دکھایا۔ کہ اس احتمال کی صورت میں بھی حضرت مسیحؑ کی وفات ہی ثابت ہے۔ پس آپؑ کے کلام میں کوئی تضاد نہیں۔ بلکہ آیت کے دونوں معنوں کی رُو سے آپ نے اپنا مقصد ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ حضرت مسیح ناصریؑ وفات پا چکے ہیں۔

مکرمی! آپ نے قرآن مجید سے ماضی پر اِذْ داخل ہونے کی صورت میں مستقبل کا معنی دینے والی جو آیات پیش کی ہیں اُن میں

قرینہ کے لحاظ سے مستقبل مراد لیا جاتا ہے۔ بلا قرینہ نہیں پس جب پیشگوئی کی صورت قرار نہ دی جا سکے۔ تو چونکہ اصل قاعدہ یہی ہے کہ فعل ماضی پر اِذْ داخل ہو تو وہ فعل زمانہ ماضی کے لئے قرار پاتا ہے۔ لہذا اس قاعدہ کے موافق معنے لئے جائیں گے۔ اور قواعدِ عربیہ کو ہی ملحوظ رکھا جائے گا۔ آپ کی پیش کردہ آیات میں مستقبل کے معنوں کے لئے واضح قرینہ ساتھ ہی موجود ہے۔ چنانچہ ان آیات میں سے پہلی آیت (۱) ولو ترٰی اذ وقفوا علی النار فقالوا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَ لا نکذب بأیٰت ربّنا ونکون من المؤمنین (سورۃ الانعام آیت ۲۸) میں ولو ترٰی اور النّار کا قرینہ موجود ہے۔ اور دوسری آیت (۲) ولو ترٰی اذ وقفوا علٰی ربّھم قال الیس ھٰذا بالحق قالوا بلٰی وربّنا قال فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون (سورۃ الانعام آیت ۳۱) میں ولو ترٰی اور علٰی ربّھم کا قرینہ ہے۔ اور تیسری آیت (۳) ولو ترٰی اذ فزعوا فلا فوت واُخذوا من مکان قریب (سورۃ سبا آیت ۵۲) سے ملحقہ آیت ۵۲، ۵۳ کے الفاظ وقالوا اٰمنّا بہٖ واَنّٰی لھم التناوش من مکان بعید ۝ وقد کفروا بہٖ من قبل ویقذفون بالغیب من مکان بعید ۝ میں ولو ترٰی اور قد کفروا بہٖ من قبل، قرینہ ہے۔ اور

چوتھی آیت (۴) لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولًا من انفسھم (سورۃ آل عمران آیت ۱۶۵) میں اذ بعث کے ماضی کے ہی معنے ہیں نہ کہ مستقبل کے۔ خدا جانے آپ نے یہ آیت کیوں پیش کر دی۔

صحیح بخاری شریف کی مشہور حدیث ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب قیامت کے دن میری امّت کے بعض افراد کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو میں انہیں دیکھ کر کہوں گا اصیحابی اصیحابی۔ تو آپ کو بتایا جائے گا۔ انّك لا تدری ما احدثوا بعدك، تو آپؐ فرمائیں گے فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلمّا توفّیتنی کنت انت الرقیب علیھم ....
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ازالہ اوہام میں جو معنے حضرت مسیح موعودؑ نے لئے ہیں وہ اس حدیث نبویؐ کے عین مطابق ہیں، لہذا یہی معنے اقرب الی الصواب اور راجح ہیں۔ لیکن چونکہ دوسرے مرجوح معنے بھی مفسّرین نے مراد لئے ہیں۔ ان معنوں کی رُو سے بھی آپؑ نے وفاتِ مسیح ثابت کر دکھائی تا کہ حیاتِ مسیح کے [illegible] کا پورے طور پر قلع قمع کر دیا جائے۔

سوال ۸

۸۔ یاجوج ماجوج :۔ (۱) "اور یاجوج ماجوج کی نسبت تو فیصلہ ہو چکا ہے جو یہ دنیا کی دو بلند اقبال قومیں ہیں۔ جن میں سے ایک انگریز اور دوسرے روس ہیں"
(ازالہ اوہام حصہ دوم ص۵۰۲ طبع اوّل۔ روحانی خزائن جلد سوم ص۳۶۹ نیز ص۳۷۳)

(۲) انّ یاجوج وماجوج ھم النصاری" (ترجمہ۔ بیشک یاجوج ماجوج عیسائی ہیں) (حاشیہ خطبہ الہامیہ ص۲۰)

(۳) "جیسا کہ قرآن شریف میں عیسائیت کے فتنہ کا ذکر ہے ایسا ہی یاجوج ماجوج کا ذکر ہے اور اس آیت میں کہ ھم من کل حدب ینسلون ان کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام زمین پر اُن کا غلبہ ہو جائے گا۔ اب اگر دجال اور عیسائیت اور یاجوج ماجوج تین علیحدہ قومیں سمجھی جائیں جو مسیح کے وقت ظاہر ہوں گی تو اور بھی تناقض بڑھ جاتا ہے مگر بائبل سے یقینی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یاجوج ماجوج کا فتنہ بھی درحقیقت عیسائیت کا فتنہ ہے۔" (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۶۲-۶۳ طبع اوّل ص۴۹۸ طبع پنجم)

سوال ۱۱ :- یاجوج ماجوج دو قومیں ہیں یا ایک؟ کیونکہ پہلی عبارت کی رُو سے دو قومیں ہیں اور باقی دو کی رُو سے صرف عیسائی۔

سوال ۱۲ :- یہ فیصلہ کس نے اور کس بنیاد پر کیا تھا کہ یاجوج ماجوج دو بلند اقبال قومیں انگریز اور رُوس ہیں؟

الجواب یاجوج ماجوج اور الدّجال، فتنہ عیسائیت ہونے کی وجہ سے ایک ہی قوم کے حکم میں ہیں۔ لیکن حقیقتاً دو قومیں ہیں۔ اور مسیح موعود کے زمانہ کے فتنہ کی بنیاد دراصل بگڑی ہوئی عیسائیت ہے۔ اس بگڑے ہوئے عیسائی مذہب سے ہی بیزار ہو کر روس نے نہ صرف اپنے مذہب کو ہی بالکل ترک کر دیا۔ بلکہ مذاہب عالم کا ہی سرے سے انکار کر دیا۔ اور دہریّت اختیار کر لی۔ پس ان کے فتنہ کی جڑھ بھی عیسائیت ہی ہوئی۔ اس لئے فتنہ کی جڑھ کے لحاظ سے تو یہ ایک ہی قوم اور الدّجّال ہیں۔ اور اسی عیسائیت کے فتنہ نے دراصل دو سیاسی بلاک پیدا کر دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دو قومیں بنی ہیں۔ اس میں سے ایک کا بلاک ابھی بظاہر عیسائیت سے چمٹا ہوا ہے اور دوسرا بلاک اس سے بیزار ہو چکا ہے۔

البتہ الدّجال کے لفظ میں عیسائیت کے مذہبی فتنے کی طرف اہم اشارہ ہے۔ اس لئے مسیح موعود کا کام حدیثوں میں کسرِ صلیب بیان ہوا ہے۔ اور یاجوج ماجوج کے الفاظ میں الدّجال کے دو سیاسی بلاکوں کا ذکر ہے اس لحاظ سے یہ دو قومیں ہیں۔ غالبًا انہی کے متعلق

حدیث نبویؐ میں بتایا گیا ہے۔ انی قد اخرجت عبادا لی لا ید ان لاحد بقتالھم۔ پس من وجہٖ وہ ایک قوم ہیں اور من وجہٖ دو قومیں ہیں۔ فاندفع الوھم۔

سوال ۹

۹۔ انجیل کی رُو سے قسم کھانا کیسا ہے؟ (۱) جب عیسائی آتھم نے یہ کہکر قسم کھانے سے انکار کیا کہ میرے مذہب میں قسم کھانا جائز نہیں تو مرزا صاحب نے کہا۔ "وہ ایک جھوٹا عذر کر رہے ہیں۔ کہ ہمارے مذہب میں قسم کھانا ممنوع ہے۔" (اشتہار انعامی چار ہزار صـ۲) نیز آتھم نے کہا کہ "میں نہیں ڈرا۔ اور قسم کھانے سے بھی انکار کیا۔ حالانکہ عیسائی مذہب کے سارے بزرگ قسم کھاتے آئے ہیں۔" (حاشیہ حقیقۃ الوحی صـ۲۱۳ طبع اوّل صـ۲۲۲ طبع پنجم)

(۲) "اور قرآن تمھیں انجیل کی طرح یہ نہیں کہتا کہ ہرگز قسم نہ کھا۔ بلکہ بیہودہ قسموں سے تمہیں روکتا ہے۔ کیونکہ بعض صورتوں میں قسم فیصلے کے لئے ایک ذریعہ ہے۔" (کشتی نوح صـ۲۷ طبع اوّل۔ صـ۴۲ طبع موجودہ)

سوال و۔ عیسائی مذہب میں یعنی انجیل کی رُو سے قسم کھانا جائز ہے

یا ناجائز؟ آتھم فیصلے کے لئے قسم کھانے سے انکار کرکے انجیل پر عمل کر رہا تھا یا اس کے خلاف؟

الجواب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں عیسائی چونکہ انجیل کی رُو سے قسم کھانے کو ممنوع قرار دیتے تھے۔ اس لئے آپ نے ایک جگہ ان کے اس خیال کے پیش نظر، قسم کے بارے میں قرآن کریم کی فضیلت بیان کی ہے۔ ورنہ درحقیقت انجیل کا مقصد بھی قسم کھانے سے مطلق منع کرنا نہ تھا۔ لہذا حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے عبداللہ آتھم کے اس الزام کو رد کیا۔ کہ انجیل ہمیں قسم کھانے سے منع کرتی ہے پس آپ کے بیان میں کوئی تناقض نہیں۔

انجیل کی رُو سے قسم کھانا منع ہے نصاریٰ کی غلط خیالی کی بناء پر۔ اور حقیقت میں انجیل کی رُو سے قسم کھانا جائز ہے اہم ضرورت کے وقت۔ چنانچہ آپ نے بتایا کہ خود حضرت مسیحؑ اور پولوس اور پطرس نے قسمیں کھائی ہیں۔ الغرض دونوں بیانوں کی وجوہ اور شرائط مختلف ہیں۔ فاندفع التناقض۔

سوال ۱۰

۱۰۔ **مرزا صاحب اور دوسرے مسیح**:۔ (۱) "مَیں نے صرف مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور میرا یہ بھی

دعویٰ نہیں کہ صرف مثیل ہونا میرے پر ہی ختم ہو گیا ہے
بلکہ میرے نزدیک ممکن ہے کہ آئندہ زمانوں میں میرے جیسے
دس ہزار بھی مثیل مسیح آجائیں۔ ہاں اس زمانے کے
لئے میں مثیل مسیح ہوں اور دوسرے کی انتظار بے سُود
ہے اور یہ بھی ظاہر رہے کہ یہ کچھ میرا ہی خیال نہیں کہ مثیل
مسیح بہت سے ہو سکتے ہیں بلکہ احادیث نبویہ کا بھی یہی
منشاء پایا جاتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں۔ کہ دنیا کے اخیر تک قریب تیس ۳۰ کے دجّال
پیدا ہونگے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تیس دجّال کا آنا
ضروری ہے تو بحکم لکل دجال عیسٰی۔ تیس مسیح بھی
آنے چاہئیں۔ پس اس بیان کی رُو سے ممکن ہے اور
بالکل ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کوئی ایسا مسیح بھی آجائے
جس پر حدیثوں کے بعض ظاہری الفاظ صادق آسکیں۔
کیونکہ یہ عاجز اس دنیا کی حکومت اور بادشاہت کے
ساتھ نہیں آیا۔ درویشی اور غربت کے لباس میں آیا ہے
اور جبکہ یہ حال ہے تو پھر علماء کے لئے اشکال ہی کیا
ہے۔ ممکن ہے کسی وقت ان کی یہ مراد بھی پوری ہو جائے۔"
(ازالہ اوہام حصہ اوّل صفحہ ۱۹۹/۲۰۰ طبع اوّل۔ رُوحانی خزائن
جلد سوم صفحہ ۱۹۷۔ اسلامی نظریہ یعنی اس دستاویز کا ابتدائی

حصہ جو تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب (۱۹۵۳ء) میں صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے داخل کی گئی تھی۔ ص۱۷۲)

(۲) صحیح اور راست صرف اس قدر ہے۔ کہ ایک شخص عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر آنے والا بیان کیا گیا ہے جو نہ لڑے گا۔ اور نہ خون کرے گا۔ اور غربت اور مسکینی اور حلم اور براہین شافیہ سے دلوں کو حق کی طرف پھیرے گا۔"

(کشف الغطاء ص۱۲ طبع اوّل ص۲۱ طبع چہارم)

(۳) "پس میرے سوا دوسرے مسیح کے لئے میرے زمانہ کے بعد قدم رکھنے کی جگہ نہیں۔ اگر فکر کرو اور ظلم اختیار نہ کرو۔ پس میں صاحب زماں موعود ہوں اور میرے بعد کوئی زمانہ نہیں۔ اور اے جھوٹو! وہ کونسا زمانہ ہوگا جس میں تم اپنے فرضی اور خیالی مسیح کو اتارو گے۔"

(ترجمہ خطبہ الہامیہ ص۲۴۳)

سوال :۔ مرزا صاحب کے بعد ان جیسا مثیل مسیح آنا ممکن ہے یا نہیں؟ پہلی عبارت کا "ممکن" ابھی قائم ہے یا نہیں یا یہ عبارت منسوخ ہو چکی ہے۔ اگر منسوخ ہو چکی ہے تو عدالت میں کس مقصد کے لئے پیش کی گئی؟ یعنی اگر مرزا صاحب کے بعد اب کسی مثیل مسیح کا آنا ممکن نہیں جیسا کہ دوسری اور تیسری عبارات سے ظاہر ہے تو پہلی عبارات کو جو، ایسے مثیلِ مسیح کے آنے کو بالکل ممکن قرار دیتی ہے۔ عدالت

میں کیوں پیش کیا گیا؟

الجواب اس زمانے میں مسیح موعود، بانی سلسلہ احمدیہ ہی ہیں۔ ازالہ اوہام کی عبارت کی رُو سے مثیل مسیح اس کے بعد بھی آسکتے ہیں۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام اصالتاً نہیں آسکتے۔ یہ بھی ازالہ اوہام میں مذکور ہے۔ خطبہ الہامیہ میں بھی آپ نے ایسے مسیح کے آنے کی نفی کی ہے۔ جو مسلمانوں کا خیالی اور فرضی مسیح ہے۔ جس کو زندہ سمجھا گیا ہے۔ اور اصالتاً اس کا آسمان سے اُترنا مانا جاتا ہے۔ ازالہ اوہام پڑھ کر دیکھیں۔ اس کی نفی ازالہ اوہام میں بھی موجود ہے آئندہ کے لئے مطلق مثیل مسیح کی آمد کے امکان کی خطبہ الہامیہ میں نفی نہیں کی گئی۔ کیونکہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے اس کے بعد "لیکچر سیالکوٹ" میں فرمایا ہے:۔

"اس (مسیح موعود۔ ناقل)، کے بعد کوئی امام نہیں اور نہ کوئی مسیح۔ مگر وہ جو اس کے لئے بطور ظل کے ہو"

(لیکچر سیالکوٹ ملک، روحانی خزائن جلد ۲۰ ص ۲۰۶)

پس مثیلِ مسیح کی آمد کا امکان خطبہ الہامیہ کے بعد بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ کے اس سوال نمبر۱ میں مندرجہ تینوں اجزاء کے جوابات بطور خلاصہ یہ ہیں:۔

۱۔ کوئی اور مثیلِ مسیح آسکتا ہے۔ یعنی اس کا امکان موجود ہے۔

۲۔ کوئی عبارت مذکورہ عبارتوں میں سے منسوخ نہیں۔

۲- عدالت میں اس لئے پیش کی گئی کہ ہم امکان کو مانتے ہیں۔

ایک طعن کا جواب

آپ نے اپنی دوسری چٹھی میں نمبر ۳ کے ذیل میں احمدی علماء پر طعن کرتے ہوئے لکھا ہے :-

" درحقیقت احمدی علماء بھی مرزا صاحب کو سچا نہیں سمجھتے "

آپ نے اس الزام کی بزعم خود تائید میں ایک عبارت بانی سلسلہ احمدیہ کی، اور دوسری عبارت حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کی پیش کرکے دونوں میں تناقض دکھانے کی کوشش کی ہے۔

آپ کے اس طعن کے رد میں واضح ہو کہ آپ نے دونوں عبارتوں میں غور نہیں فرمایا۔ اور اُن میں محض سطحی نگاہ سے اختلاف سمجھ کر تناقض پایا جانے کا اعتراض کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مطیع کا لفظ، دونو بزرگوں کی عبارت میں الگ الگ مفہوم کا حامل ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عبارت میں جو قرآنی آیت وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ کی تفسیر میں یہ لکھا ہے۔ کہ ہر رسول مطاع اور امام بننے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس غرض کے لئے نہیں بھیجا جاتا کہ دوسرے نبی کا مطیع اور تابع ہو۔ ہاں محدّث جو مرسلین سے ہے امتی بھی ہوتا ہے اور ناقص طور پر نبی بھی۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم ص۵۶۹ طبع اول)

اس عبارت میں مطیع اور تابع کا لفظ امتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیئے کہ کوئی نبی امتی نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کی عبارت کا تعلق ہے جو آپ نے ان کی کتاب تبلیغ ہدایت سے پیش کی ہے۔ اس میں تابع نبی سے غیر امتی تابع نبی مراد ہے۔ ہارون علیہ السلام ان معنوں میں ہرگز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امتی نہ تھے۔ جن معنوں کی رُو سے ایک مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہوتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا امتی آپ کی پیروی والی اطاعت کے بعد ہی کمال حاصل کرتا ہے پس صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب نے ہارون علیہ السلام کو تابع تو مانا ہے لیکن موسیٰؑ کا امتی قرار نہیں دیا۔ پس مطیع اور تابع کی دو حیثیتیں ہوئیں ایک تابع امتی کی، اور دوسری حیثیت ہارونؑ کی جو مستقل نبی تو تھے مگر امتی نبی نہ تھے۔ کیونکہ انہوں نے موسےٰ علیہ السلام کی پیروی سے نبوت حاصل نہیں کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے جب دُعا کی کہ میرے بھائی ہارون کو نبی بنا دیا جائے۔ کیونکہ مجھ سے افصح ہیں۔ تو ان کی دُعا سُنی گئی۔ اور خدا تعالےٰ نے فرمایا۔ لقد اوتیت سؤلک یٰموسیٰ۔ پس ہارون حضرت موسیٰؑ کی پیروی سے نبی نہیں بنے۔ قرآن مجید کی آیت وما ارسلنا من رسول میں جتنے پہلے نبی گذرے ہیں۔ وہ صرف مطاع تھے یعنی ان معنوں میں مطیع نہ تھے کہ کسی دوسرے نبی کی پیروی سے انہوں نے مقام نبوت پایا۔

بلکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک ان کی نبوت براہ راست اور مستقلہ تھی۔ پس حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے تابع تو تھے۔ لیکن نبوت ان کی مستقلہ تھی۔ یعنی وہ امتی نبی نہ تھے جیساکہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ امتی نبی ہیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کلام میں تابع اور مطیع کی نفی ایک رسول کے لئے امتی ہونے کی نفی ہونے کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔ اور صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے کلام میں حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے تابع ہونے کے اثبات سے مراد غیر امتی تابع ہے۔ کیونکہ وہ مستقل نبی تھے۔ اسی طرح اگر حضرت موسیٰؑ زندہ ہوتے اور وہ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوتے اور امتی نہ بنتے تو پھر ان کی پوزیشن کامل طور پر ہارونؑ والی بنتی۔ جو موسےؑ کی نسبت سے ہارونؑ کو حاصل تھی۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے کلام میں کوئی تناقض نہیں۔ سطحی نظر سے جو اختلاف نظر آتا ہے۔ درحقیقت اس کی جہت الگ الگ ہے۔

آپ نے یہ طعن بھی کیا ہے کہ :-

"مرزا صاحب جن لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے اُن کے مطاع نہیں بلکہ مطیع بن کر رہے۔ اور اپنی اطاعت کا یقین دلاتے رہے۔ اور قرآن وحدیث سے ان کی کافرانہ حکومت کی وفاداری سے اطاعت کو حکم قرار دیتے رہے۔"

اولی الامر کی تشریح میں ہم بتا چکے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم دونو کی اطاعت کا حکم اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں موجود ہے۔ لیکن لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق، کی شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ پس انگریزوں کی اطاعت کا حکم مشروط تھا نہ کہ غیر مشروط۔ مشروط طور پر نبی مطیع ہو سکتا ہے غیر مشروط طور پر نہیں۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ عند اللہ مطاع سب کے لئے تھے۔ مسلم اور غیر مسلم دونو کے لئے۔ خواہ انہیں مانیں یا نہ مانیں لیکن انگریزوں کی اطاعت کا حکم قرآن وحدیث کی رو سے مشروط طور پر ہے۔ اور یہ نبوت میں حارج نہیں۔ کیونکہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی جن کے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ مثیل ہیں۔ غیر حکومت یعنی رومی حکومت کے ماتحت تھے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﷺ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

هُوَالنَّـــــاصِرُ

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

مکرمی!

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَعَلٰی من لدیکم وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُہٗ

ھداك اللّٰہ الی سواء السبیل۔

آپ کا جواب الجواب جو ہمارے مرسلہ جواب پر تنقید اور جرح ہے، موصول ہؤا ۔ آپ کی اس جرح اور تنقید کا جواب ذیل میں عرض ہے۔

دمشق میں مسیحؑ کے نزول کی حدیث

دمشق میں مسیح کے نزول کے متعلق صحیح مسلم کی حدیث کے بارہ میں آپ نے ازالہ اوہام صفحہ ۶۳ طبع اوّل حاشیہ سے جو عبارت پیش کی تھی اس کی صحت کے متعلق آپ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کے سوال پر ہم نے محققین کے بارے میں "مسیح کو دمشق سے کیا مناسبت ہے اور دمشق کو مسیح سے کیا خصوصیت" کے متعلق محققین کے حیران ہونے کے ثبوت کے لئے بعض حوالہ جات پیش کئے اور ان حوالوں کے علاوہ بعض اَور امور بھی بیان کئے تھے۔

آپ نے ہمارے پہلے مضمون پر جو جرح کی ہے اس کا مطالعہ

کرنے اور حوالہ جات چیک کرنے پر ہم نے یہ تاثر لیا ہے ۔ کہ آپ حوالہ جات کے پیش کرنے میں محتاط نہیں بلکہ دیگر معاندین احمدیت کی طرح آپ بھی ان کو قطع و برید سے پیش کرتے ہیں ۔ اور سیاق کلام کو چھپاتے ہیں ۔ اس لئے آپ کے بارے میں ہمارے اعتماد کو بہت ٹھیس لگی ہے ۔ لہذا ضروری سمجھا گیا کہ دمشق کے بارے میں ازالہ اوہام ص۶۳ کے حوالہ کو بھی چیک کر لیا جائے جو آپ نے پیش کیا تھا ۔ اگرچہ آپ کے سوال کے مطابق ہمارا جواب غلط نہیں ہے لیکن حوالہ چیک کرنے پر اس کی پوری حقیقت یہ معلوم ہوئی ہے ۔ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی اور اس زمانہ کے ایک بزرگ کی حیرانی اور بالعموم محقق لوگوں کی اس بارے میں خاموشی سے کہ "مسیح کو دمشق سے کیا مناسبت ہے اور دمشق کو مسیح سے کیا خصوصیت" یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس بارے میں دمشق کا لفظ ابتداء سے محقق لوگوں کو حیران کرتا چلا آیا ہے ۔ چنانچہ زیر بحث حوالہ کی پوری عبارت یوں ہے :۔

"اب یہ بھی جاننا چاہیئے کہ دمشق کا لفظ جو مسلم کی حدیث میں وارد ہے ۔ یعنی صحیح مسلم میں یہ جو لکھا ہے ، کہ حضرت مسیح دمشق کے منارہ سفید شرقی کے پاس اتریگے یہ لفظ ابتداء سے محقق لوگوں کو حیران کرتا چلا آیا ہے کیونکہ بظاہر کچھ معلوم نہیں ہوتا ۔ کہ مسیح کو دمشق سے کیا مناسبت ہے ۔ اور دمشق کو مسیح سے کیا خصوصیت ۔

ہاں اگر یہ لکھا ہوتا کہ مسیح مکہ معظمہ میں اُترے گا۔ یا مدینہ منوّرہ میں نازل ہو گا تو ان ناموں کا ظاہر پر حمل کرنا موزوں بھی ہوتا۔ کیونکہ مکّہ معظمہ خانہ خدا کی جگہ اور مدینہ منورہ رسول اللہ کا پایۂ تخت ہے۔ مگر دمشق میں تو کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں جس کی وجہ سے تمام امکنہ متبرکہ چھوڑ کر نزول کے لئے صرف دمشق کو مخصوص کیا جائے۔ اس جگہ بلاشبہ استعارہ کے طور پر کوئی مرادی معنے مخفی ہیں۔ جو ظاہر نہیں کئے گئے۔ اور یہ عاجز ابھی اس بات کی تفتیش کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ معنے کیا ہیں۔ کہ اسی اثناد میں میرے ایک دوست اور محبِ واثق مولوی حکیم نورالدین صاحب اس جگہ تشریف لائے۔ اور انہوں نے اس بات کے لئے درخواست کی کہ جو مسلم کی حدیث میں لفظ دمشق و نیز ایسے چند مجمل الفاظ ہیں۔ اُن کے انکشاف کے لئے جناب الٰہی میں توجہ کی جائے۔"

(ازالہ اوہام طبع اوّل ص ۶۳-۶۴)

اس عبارت میں دمشق کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ یہ لفظ ابتداد سے محقق لوگوں کو حیران کرتا چلا آیا ہے کے ثبوت کے طور پر اس کی دلیل ان الفاظ میں دی ہے:۔

"کیونکہ بظاہر کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مسیح کو دمشق سے

کیا مناسبت ہے اور دمشق کو مسیح سے کیا خصوصیت،
ہاں اگر یہ لکھا ہوتا کہ مسیح مکہ معظمہ میں اُترے گا یا مدینہ
منورہ میں نازل ہوگا۔ تو ان ناموں کا ظاہر پر حمل کرنا
موزوں بھی ہوتا"۔

پس دمشق کے لفظ کے متعلق حضرت بانی سلسلہ احمدیہ خود حیران تھے۔ اور حضرت مولوی نورالدین صاحب بھی حیران تھے۔ تبھی انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں درخواست کی کہ جناب الٰہی میں اس بارے میں انکشاف کے لئے توجہ کی جائے۔ جب انسان خود حیران ہوتا ہے تو طبعی بات ہے کہ بالعموم وہ اس سے قیاس کرے گا کہ دوسرے لوگ بھی حیران ہوں گے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ بالعموم ان کی طرف سے مناسبت اور خصوصیت کی وجہ منقول نہ ہو۔ پس اس جگہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی حیرانی پر مختلف لوگوں کو قیاس کیا ہے کہ وہ حیران رہے ہیں۔ جن میں سے بعض کی پریشان خیالی اور روایات میں صحیح تطبیق نہ دے سکنے کو ہم اپنے پہلے مضمون میں تاریخی ثبوت کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ گو یہ تاریخی ثبوت آپ کے سوال کے جواب میں دیا گیا تھا۔ مگر حوالہ چیک کرنے سے معلوم ہوا کہ اصل عبارت کے متعلق ہمیں تاریخی ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اصل عبارت تاریخی ثبوت نہیں چاہتی بلکہ ایک قیاس پر مبنی معلوم ہوتی ہے اگر مسیح کے نزول کا ذکر روایات میں یوں ہوتا کہ وہ مکہ معظمہ میں نازل

ہوں گے۔ یا مدینہ منوّرہ میں نازل ہوں گے۔ تو اس پر حیرانی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن دمشق میں نزول کے متعلق جب بظاہر کوئی مناسبت اور خصوصیت معلوم نہیں ہوتی تو اس پر اہل علم کی حیرانی کا استدلال بعید از قیاس نہیں۔ بلکہ قیاس کا عین تقاضا ہے کہ وہ ضرور حیران ہوئے ہوں گے۔

ہم نے اپنے پہلے مضمون میں نزول مسیح کی حدیثوں کے بارے میں یہ تناقض دکھایا تھا۔ کہ ان میں نزول کے مقامات چار مختلف بیان ہوئے ہیں۔ جو حیران کن بات ہے اور ان میں تطبیق دینا خالی از صعوبت نہیں۔ اور اسی سلسلہ میں حافظ ابن کثیر کی ایک عربی عبارت بھی پیش کی تھی جس میں بیت المقدس، اُردن، اور معسکر المسلمین میں مسیح کے نزول کا ذکر ہے۔ اور اس میں یہ درج تھا کہ بیت المقدس والی روایت مصنف کے نزدیک ارجح ہے۔ اور باقی ساری روایات کے منافی بھی نہیں۔ کیونکہ بیت المقدس دمشق کے مشرق ہی ہے۔ اس بیان سے ظاہر تھا کہ بیت المقدس کی روایت کو دوسری روایات سے ترجیح دیتے ہوئے مصنف نے بیت المقدس کو دمشق کے مشرق میں قرار دینے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے جو دمشق کی مناسبت کے بارے میں اس کی پریشان خیالی کا قطعی ثبوت ہے ہر محقق بھی جس نے یہ پڑھا ہو گا حیران ہو گا۔

آپ نے لفظ "دمشق کی تحقیق" کے عنوان کے تحت لفظ کراچی

کی تحقیق" کا بغلی عنوان قائم کر کے اسلامی کانفرنس کے متعلق چار روائتیں گھڑی ہیں کہ

"بطور مثال فرض کرلیں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ اسلامی کانفرنس کراچی میں ہوگی۔ دوسرا کہتا ہے کہ لاہور میں مینارِ پاکستان کے قریب ہوگی۔ تیسرا کہتا ہے کہ کوئٹہ میں ہوگی۔ چوتھا کہتا ہے کہ راولپنڈی میں ہوگی پانچواں کہتا ہے اخباری نمائندوں کی موجودگی میں ہوگی۔ چھٹا کہتا ہے لاہور کراچی سے فلاں جانب واقع ہے۔ ان سب اشخاص کی باتیں سننے کے بعد (یا اگر لکھی ہوئی ہوں تو پڑھنے کے بعد) ایک بزرگ اگر یہ فرمائیں کہ ان اشخاص کو لفظ کراچی پر حیرانی ہو رہی ہے کیونکہ بظاہر کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلامی کانفرنس کو کراچی سے کیا نسبت ہے تو ایسے بزرگ کی عقل اور ذہن دانی یا فصاحت و بلاغت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

محترم! آپ کے یہ سارے راوی فرضی ہیں اور ان میں سے کوئی روایت بھی نہیں لیکن نزولِ مسیح کے متعلق مسیح موعود دمشقی روایت کو سچا سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ اسلامی کانفرنس کے متعلق من گھڑت روایات پیش کر کے حق کو چھپانا چاہتے ہیں۔ آپ کی

یہ ساری عبارت پڑھ کر کوئی بزرگ ان میں سے کسی روایت کو سچّا نہیں سمجھ سکتا۔ تا اسے یہ کہنے کی ضرورت پیش آئے کہ لفظ کراچی پر یہ لوگ حیران ہیں۔ جب ان روایتوں کا کوئی وجود ہی نہیں۔ تو ان کے بارے میں حیرانی کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

جناب مَن! آپ نے اس کے بعد یہ سوال کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ لفظ بیت المقدس ابتداء سے محقق لوگوں کو حیران کرتا چلا آیا ہے تو کیا آپ اسے درست سمجھیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اسے درست نہیں سمجھیں گے۔ کیونکہ جو لوگ حیاتِ مسیح کے قائل چلے آئے ہیں۔ ان کے لئے اس میں کوئی وجہ حیرانی نہیں۔ کیونکہ بیت المقدس قبلہ اوّل رہا ہے۔ اور یہ مناسبت اور خصوصیت ان کے لئے کافی ہے۔ کہ وہ بیت المقدس والی روایت سے حیران نہ ہوں۔ البتہ بیت المقدس اور دمشق کی حدیث کو تطبیق دینے والے بزرگ ضرور پریشان ہوئے ہیں۔ اور وہ دمشق سے مسیح کے نزول کی کوئی مناسبت اور خصوصیت بیان نہیں کر سکے۔ اور ہمارے نزدیک تو نزولِ مسیح کی تین حدیثوں کے بارے میں حیرانی کی وجہ ضرور موجود ہے ہاں حضرت مسیح موعودؑ نے دمشق والی حدیث کی تشریح کر دی ہے جسے ہم درست مانتے ہیں۔

جناب من! آپ نے یہ احساس تو کر لیا ہے۔ کہ علماء کو اتنی سال تک آپ والا پہلا سوال پیدا نہ ہوا۔ اس سے اس سوال کی اہمیّت

رگ جاتی ہے۔ جو آپ کو پیدا ہوا ہے۔ اور اب اصل عبارت چیک کرنے پر آپ کے سوال کی اہمیت تو ختم ہی ہو گئی ہے۔ غالباً اسی لئے ان علماء نے سوال نہیں کیا کہ یہ سوال ان کے نزدیک بھی اس عبارت سے پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔

ہم نے آپ کی بات کو الزام برائے الزام قرار دیا تھا۔ تو اس پر آپ نے بلاوجہ ایک نیا اعتراض کر دیا ہے اور اسے مثال کا رنگ دیا ہے۔ حالانکہ دراصل وہ آپ کا ایک نیا اعتراض ہے اس اعتراض پر آپ حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۹۰ کی عبارت پیش کرتے ہیں۔ جس میں مجدد صاحب سرہندی کے متعلق یہ لکھا ہے کہ :۔

"اگرچہ اس امت کے بعض افراد مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ سے مخصوص ہیں اور قیامت تک مخصوص رہیں گے لیکن جس شخص کو بکثرت اس مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف کیا جائے وہ نبی کہلاتا ہے۔"

اس عبارت پر آپ کو یہ اعتراض ہے کہ "یہ بات مرزا صاحب نے خود ہی گھڑ لی ہے۔" اور پھر آپ نے کتاب الحق المبین کے صفحہ ۱۹۲ پر مصنف کتاب ہذا کی طرف سے پیش کردہ مجدد صاحب سرہندی کے ایک حوالہ کا ترجمہ نقل کیا ہے جس میں انبیاء کے بعض کامل متبعین سے بھی خدا تعالیٰ کے بالمشافہ کلام کرنے کا ذکر ہے۔ اور جس کے ساتھ وہ اس قسم کا کلام بکثرت کرتا ہے اس کا نام محدث رکھا جانے کا بیان ہے۔

مصنفِ "الحق المبین" نے یہ عبارت اس بات کے ثبوت میں پیش کی ہے کہ محدّث سے خدا کا بالمشافہ کلام بھی شک و شبہ اور حدیث النفس اور دخل شیطان سے مبرّا ہوتا ہے۔ اس عبارت کو یہ دکھانے کے لئے درج نہیں کیا گیا کہ حقیقۃ الوحی صفہ ۳۹ پر حضرت مسیح موعودؑ نے اسی عبارت کو مجدّد صاحب کی طرف سے نبی کی تعریف قرار دیا ہے۔ کہ محدّث کے لفظ کو نبی کے لفظ سے بدلنے کا سوال پیدا ہو۔ پس آپ کا یہ اعتراض بھی محض اعتراض برائے اعتراض کی حیثیت ہی رکھتا ہے۔ اور آپ الزام برائے الزام کے طریق کو ہی نبھا رہے ہیں۔ "الحق المبین" کے مصنف نے مجدّد صاحب سرہندی کی جو عبارت پیش کی ہے۔ اس کا تعلق مجدّد صاحب کی مکتوبات جلد ۲ سے ہے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مدّنظر مجدّد صاحب کی جو عبارت ہے جس کا مفہوم آپ نے حقیقۃ الوحی صفہ ۳۹ پر لکھا ہے۔ اس کا تعلق ہمارے نزدیک مکتوبات جلد اوّل کے مکتوب نمبر ۳۱۰ سے ہے۔ جس میں یہ الفاظ آئے ہیں:" چنانچہ بر علمِ غیب کہ مخصوص باوست سبحانہٗ تعالیٰ خواص رسل را اطلاع مے بخشد"۔ اس جگہ آیت لَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ کا مفہوم بیان کیا گیا ہے جو قرآن مجید کے بیان کے مطابق نبی کی تعریف ہے۔

ہم نے اس امر کا امکان بھی لکھا تھا کہ دمشق کے بارے میں

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی جس عبارت پر آپ کو اعتراض ہے امکان ہے کہ وہ وحی خفی ہو۔ جیسا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا ہے وحی خفی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک تاریخی حقیقت پر مشتمل ہے۔ جس کا تاریخ سے ثبوت دینا ہر مسلمان کے لئے مشکل ہے۔ آپ ہماری اس بات کو یہ کہکر رد کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو اُمی تھے۔ اور مرزا صاحبؑ پڑھے ہوئے تھے۔ مگر اس سے ہماری بات رد تو نہیں ہوجاتی۔ اگر تو پڑھے ہوؤں کے لئے الہام کا دروازہ بند ہوتا۔ تب تو آپ کا اعتراض درست ہوسکتا۔ لیکن اگر الہام کا دروازہ پڑھے ہوئے کے لئے بھی کھُلا ہے۔ تو آپ کے خواندہ اور ناخواندہ ہونے کا فرق بیان کرنے سے ہماری توجیہ غلط نہیں ہوجاتی۔

ہم آپ کی اس ذہنیت پر حیران ہیں کہ آپ اعتراض برائے اعتراض کی سپرٹ کو بار بار قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی معمولی عبارتوں کو بھی صحیح طور پر سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اس بحث کے سلسلہ میں آپ نے چشمہ معرفت ص۲۶۹ ایڈیشن اوّل سے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے بعد نزول اس آیت "قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا" دنیا کے بڑے بڑے

بادشاہوں کی طرف دعوتِ اسلام کے خط لکھے تھے"۔
اس عبارت سے آپ یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں "مرزا صاحب کے عقیدے کے مطابق آنحضرت لکھنا پڑھنا جانتے تھے"۔ اور پھر اس بارے میں ہمارا خیال دریافت کیا ہے۔ سو واضح ہو کہ اس عبارت سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا جانتے تھے بلکہ صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے اس زمانہ کے بڑے بڑے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کے خط ارسال کئے تھے۔ اور محاورہ میں خط لکھنا بمعنی ارسال کرنا معروف ہے۔ اور یہ مجازی اطلاق ہے۔ ایک لفظ کے مجازی اطلاق میں بہت وسعت ہوتی ہے۔ اور خط لکھنا تو خط بھیجنے کے معنوں میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ ہماری نصیحت آپ کو یہ ہے کہ الفاظ سے نہ کھیلا کریں۔ بلکہ حقیقت پر نگاہ رکھا کریں۔ دیکھئے، حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے آگے چل کر اسی کتاب چشمۂ معرفت کے صفحہ ۲۵۳ (ایڈیشن اوّل) میں آیت قرآنیہ وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (عنکبوت) درج فرما کر آگے صفحہ ۲۵۴ پر اس کا ترجمہ یہ درج فرمایا ہے:۔

اور اے پیغمبر قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھتے تھے اور نہ تم اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا

ہوتا۔ تو ان بے دین لوگوں کو شبہ کرنے کی کوئی گنجائش
ہوتی۔ مگر اب تو ان کا شبہ سراسر ہٹ دھرمی ہے یعنی
جبکہ یہ امر ثابت شدہ ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم
محض ناخواندہ اور اُمّی تھے۔ اور کوئی ثابت نہیں
کرسکا کہ آپ لکھ سکتے یا پڑھ سکتے تھے۔ تو پھر ایسے شبہات
ایمانداری کے برخلاف ہیں۔

مکرمی! آپ نے خدا کے حکم سے دعویٰ کے عنوان کے ذیل میں حضرت
مسیح موعود علیہ السلام کی یہ عبارت پیش کی ہے:-

"نبوّت کا دعویٰ نہیں۔ محدثیت کا دعویٰ ہے جو بحکمِ خدا
کیا گیا ہے۔" (ازالہ اوہام ص۴۲۲ طبع اوّل)

اور براہین احمدیہ ص۵۹۵ طبع اول حاشیہ نمبر ۴ کے حوالہ سے الہام:
"أنت محدث الله فیك مادة فاروقیة" درج کرکے یہ سوال
کیا ہے کہ "مرزا صاحب اپنی اس وحی جلی کے مطابق محدّث تھے یا نہیں؟
اور محدّثیت سے انکار کرکے نبوّت اختیار کرنے سے کوئی تاویل یا اجتہاد
نہیں بلکہ یہ وحی جلی غلط ثابت ہوتی یا نہیں؟"

جواباً عرض ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے محدثیت
سے بکلّی انکار کبھی نہیں کیا۔ البتہ ازالہ اوہام میں جس نبوّت سے انکار
کیا ہے۔ وہ معروف اصطلاحی نبوّت ہے۔ معروف اصطلاح میں نبی
آپ کے نزدیک وہی نہیں ہوسکتا تھا۔ اور سن۱۹۰۱ء میں جس نبوّت

کا آپ نے اقرار کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک پہلو سے نبی اور ایک
پہلو سے امتی ہیں۔ سابق اصطلاحی تعریف نبوت کی رُو سے آپ نے
تادمِ واپسیں ایسی نبوت سے انکار ہی کیا ہے جس کے لیے شارع یا
مستقل نبی ہونا ضروری ہے۔ ہاں خدا کی متواتر وحی سے چونکہ ۱۹۰۱ء
میں آپ کو اپنی نبوت کے متعلق صراحت ہو گئی۔ اور آپ نے الہامِ الٰہی
سے سمجھ لیا کہ آپ کو صریح طور پر نبی کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس لیے
سابق عرفی تعریفِ نبوت جامع ثابت نہ ہوئی۔ لہٰذا اس میں تبدیلی وقوع
میں آئی اور تبدیلی والی شق کی رُو سے آپ نے اپنے تئیں نبی سمجھا۔ اور امتی کے نبوتِ
مطلقہ کا حامل ہونے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ پس جس نبوت کے بالمقابل
آپ نے امتی نبی ہونے کا دعویٰ کیا وہ نبوتِ تشریعیہ یا مستقلہ
تھی۔ جس کا دعویٰ آپ نے کبھی نہیں کیا۔ گو آپ نے ۱۹۰۱ء سے
اپنا مقام محدث سے بالا سمجھا۔ لیکن ہر نبی پر محدث کا اطلاق نبی کے
علیٰ وجہ الکمال محدث ہونے کی وجہ سے جائز ہے لہٰذا اب بھی آپ کے
لئے محدث اللہ کا استعمال جائز ہے۔ (ملاحظہ ہو حمامۃ البشریٰ صفحہ ۸۲)
اس طرح آپ نے بحکم خدا اپنے محدث اللہ ہونے سے بکلّی انکار کبھی نہیں کیا۔
آپ کے اجتہاد میں جو غلطی تھی اُسے خدا نے الہام سے درست کر دیا۔
اور وہ غلطی ناقص نبی ہونے کے متعلق تھی۔ لہٰذا "اللہ تعالیٰ کو غلطیاں
درست کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں" کے عنوان کے تحت آپ نے جو
پانچ سوالات لکھے ہیں ان کا الگ جواب دینے کی ہمیں ضرورت نہیں رہی

البتہ آپ کے آخری سوال کے جواب میں یہ لکھنا کافی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تعریفِ نبوت میں تبدیلی بارش کی طرح وحی الٰہی سے صریح طور پر نبی کا خطاب پانے پر کی ہے اس لئے آپ کا پانچواں اور چھٹا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

آپ کے پہلے سوالوں کے جواب میں ہم آپ کو سورۃ المؤمن کی آیت النار یعرضون علیہا غدوًا وعشیًا کی تفسیر ابن کثیر سے پڑھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس میں آپ کو یہ لکھا ملے گا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے النار یعرضون علیہا غدوًا وعشیًا کی آیت سے جو مکی تھی۔ یہ استدلال نہ کیا کہ برزخ میں عذابِ قبر بھی ہوتا ہے۔ اور جب ایک یہودیہ کی دعا سُنکر کہ خدا تمہیں عذابِ قبر سے بچائے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ نے پوچھا۔ کیا عذابِ قبر بھی ہے؟ کیونکہ یہودیہ نے ایسا کہا ہے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہودیوں نے اللہ پر جھوٹ بولا ہے۔ قیامت کے دن کے سوا کوئی عذاب نہیں۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے لوگو! اگر تم جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم روتے بہت اور ہنستے تھوڑا۔ اے لوگو! اللہ کے ذریعہ عذابِ قبر سے پناہ مانگو۔ کیونکہ عذابِ قبر برحق ہے۔ یہ روایت حضرت عائشۃ الصدیقہ سے مروی ہے۔ اس واقعہ میں آپ کو آپ کے سوالوں کا حل مل جائے گا۔

بشرطیکہ نیت بخیر ہو۔ ہمارے نزدیک تدریجی ترقی یا تدریجی انکشاف الٰہی کوئی قابلِ اعتراض امر نہیں۔ مجدّد صاحب سرہندی نے اپنے مکتوبات میں نبوّت کے حصول کا ایک طریق یہ بھی لکھا ہے۔ کہ ولایت کا مقام طے کر لینے کے بعد مقامِ نبوّت ملے - اور یہ طریق اللہ تعالےٰ نے بعث سے انبیاء کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ ان کی اصل عبارت یہ ہے :-

"راہ دیگر آنست کہ بتوسطِ حصول ایں کمالاتِ ولایت حصول بکمالاتِ نبوت میسّر گردد راہ دوئم شاہراہ است واقرب است بوصول کہ بکمالاتِ نبوّت رسد الّا ماشاء اللہ ایں را رفتہ است از انبیائے کرام علیہما الصلوٰۃ والسلام واصحابِ ایشاں بتبعیت و وراثت ۔" (مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اوّل مکتوب نمبر ۳۰۱)

پس جب تدریجی ترقی جائز ہے تو تدریجی انکشاف بدرجۂ اولیٰ جائز ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالےٰ کو نبی کی غلطیوں کو درست کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ایک بے معنٰی بات ہے۔ لہٰذا آپ کے پیش کردہ سوالات قابلِ اعتناء نہیں ہیں۔ کیونکہ مسیح موعود علیہ السلام کے اجتہاد کو کہ آپ نبی نہیں بحکم الٰہی محدّث ہیں - اللہ تعالےٰ نے خود اپنی وحی سے بدل دیا ہے۔ پس ان سوالات کے بعد آپ کا یہ کہنا :۔ بتایئے کہ اب مرزا صاحب کے جھوٹا نبی ہونے میں کیا شک رہ گیا۔ مان لیجئے کہ اللہ تعالےٰ کو مرزا صاحب کی غلطیوں کو درست کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی :۔ ایک

باطل خیال ہے۔ جس سے آپ کو توبہ کرنی چاہیئے۔ علماء اسلام کا مسلک اس بارہ میں یوں ہے :" قَالَ الْجَوِینِی وَ ذَهَبَ کَثِیْرٌ مِنَ الْاَئِمَّةِ فِیْمَا اِذَا نُقِلَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فِعْلَانِ مُؤَرَّخَانِ مُخْتَلِفَانِ فَاِنَّ الْوَاجِبَ اَلتَّمَسُّكُ بِاٰخِرِهِمَا وَ اِعْتِقَادُ کَوْنِهٖ نَاسِخًا لِلْاَوْلٰی"

(ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول" للعلامہ شوکانی البحث الخامس فی تعارض الافعال ص۳۴)

یعنی جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف تاریخی فعل منقول ہوں تو پھر آخری فعل سے تمسک کرنا واجب ہوگا۔ اور پہلے کے متعلق منسوخ ہونے کا عقیدہ رکھا جائے گا۔ علامہ جوینی اور بہت سے ائمہ کا مذہب ہے۔ فتدبر۔

آپ نے اپنے تیسرے خط میں لفظ دمشق کی تحقیق کے نیچے ازالہ اوہام کے صفحہ ۴۰۷ سے جو پہلی عبارت پیش کی ہے وہ سیاق برید ہ ہے۔ اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت تک پیشگوئی پیش ہی نہیں کرتے تھے۔ جب تک خدا تعالےٰ نے تمام مراتب کسی پیشگوئی کے آپ پر نہ کھولے۔ بلکہ دعویٰ کی نفی کا تعلق کسی شق خاص سے ہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ اجتہادی غلطی آپ سے بھی سرزد ہوئی۔ چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ ۴۰۷ پر لکھا ہے کہ ایسا ہی آپ نے اُمت کے سمجھانے کے لئے بعض پیشگوئیوں کے سمجھنے میں

خود اپنا غلطی کھا نا بھی ظاہر فرمایا - اب کیا یہ تعلیم نبوی کافی نہیں اور کیا یہ تعلیم بآوازِ بلند نہیں بتلا رہی کہ پیشگوئیوں پر اجمالی ایمان لاؤ اور ان کی اصل حقیقت حوالہ بخدا کرو - امتِ محمدیہ میں تفرقہ مت ڈالو - اور تقویٰ کا طریق اختیار کرو "

دوسری عبارت صفحہ ۶۹۱ کی بھی آپ نے ادھوری اور سباق بریدہ پیش کی ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ :-

"غلطی کا احتمال صرف ایسی پیشگوئیوں میں ہوتا ہے، جن کو اللہ تعالےٰ خود اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے مبہم اور مجمل رکھنا چاہتا ہے اور مسائل دینیہ سے ان کا کچھ علاقہ نہیں ہوتا "

اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام لکھتے ہیں :-

"یہ ایک نہایت دقیق راز ہے - جس کے یاد رکھنے سے معرفت صحیحہ مرتبۂ نبوّت کی حاصل ہوتی ہے - اور اسی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں - کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ابنِ مریمؑ اور دجّال کی حقیقت کاملہ بوجہ نہ موجود ہونے کسی نمونہ کے منکشف نہ ہوئی ہو ..... اور ایسے امور میں اگر وقتِ ظہور کچھ جزئیات غیر معلومہ ظاہر ہو جائیں تو شانِ نبوّت پر کچھ جائے حرف نہیں مگر قرآن اور حدیث پر غور کرنے سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا ہے

کہ ہمارے سیّد و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تو یقینی اور قطعی طور پر سمجھ لیا تھا کہ وہ ابن مریم جو رسول اللہ نبی ناصری صاحب انجیل ہے وہ ہرگز دوبارہ دُنیا میں نہیں آئے گا۔ اور اس کا کوئی سمیّ آئے گا۔ جو بوجہ مماثلتِ رُوحانی اس کے نام کو خدا تعالےٰ کی طرف سے پائے گا۔"

تیسری عبارت آپ نے آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۵۲ سے پیش کی ہے۔ کہ:۔

"کبھی نبی کی اس قسم کی وحی جس کو دوسرے لفظوں میں اجتہاد بھی کہتے ہیں۔ مسّ شیطانی سے مختلط ہوجاتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب نبی کوئی تمنّا کرتا ہے کہ یوں ہوجائے۔ تب ایسا ہی خیال اس کے دل میں گذرتا ہے۔ جس پر نبی مستقل رائے قائم کرنے کے لئے ارادہ کرلیتا ہے۔ تب فی الفور وحیٔ اکبر جو کلام الٰہی اور وحی متلو اور مہیمن ہے نبی کو اس غلطی پر متنبّہ کردیتی ہے۔" (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۵۲)

افسوس ہے کہ آپ کی پیش کردہ یہ عبارت بھی سیاق بریدہ ہے اس سے پہلے عبارت یوں ہے:۔

"اب اللہ جل شانہٗ آیتِ موصوفہ ممدوحہ میں فرماتا ہے کہ اس ادنیٰ درجہ کی وحی میں جو حدیث کہلاتی ہے۔ بعض

صورتوں میں شیطان کا دخل بھی ہو جاتا ہے"۔

جنابِ من! اس قسم کی وحی کو دوسرے لفظوں میں اجتہاد سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا جب اجتہاد کے ساتھ مسِ شیطانی کا اختلاط بھی ہو جائے۔ تو تب ضرورت پیش آتی ہے۔ کہ وحیٔ متلو کے ذریعہ فی الفور نبی کو اس کی غلطی پر متنبہ کیا جائے۔

پس آپ کی پیش کردہ اس عبارت کا تعلق ایسے اجتہاد سے ہرگز نہیں جو مسِ شیطان سے پاک ہو۔ مسِ شیطان سے مخلوط اجتہاد کی غلطی کو فوراً وحیٔ متلو کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے۔ نہ کہ ہر ایک اجتہادی غلطی کو فی الفور دُور کیا جاتا ہے۔ پس آئینہ کمالاتِ اسلام کی اس عبارت کی بناء پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہام شَاتَانِ تُذْبَحَانِ کے متعلق آپ کے کسی پہلے اجتہاد میں غلطی واقع ہونے کو دخلِ شیطان سے مخلوط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ فی الفور اس غلطی پر آپ کو متنبہ کر دیا جاتا۔ چونکہ متنبہ نہیں کیا گیا۔ اور یہ الہام بھی وحی خفی نہ تھا۔ اس لئے یہ دخلِ شیطانی سے پاک ہے۔ اس الہام کے بارہ میں اب آپ کا آخری اجتہاد ہی درست سمجھا جائے گا۔ یہی علماء اُمّت کا مسلک ہے۔ کہ نبی سے اس کی آخری بات لی جائے گی۔ اور پہلی منسوخ ہو گی۔

مکرمی! جو پہلی عبارت میں یہ لکھا ہے کہ یہ حکم متلو شیطان کے دخل سے بکلّی منزّہ ہوتی ہے۔ آئینہ کمالات اسلام ص۳۵۲ اور بریکٹ میں کہ جنت نا قل کے آپ نے جو یہ نوٹ دیا ہے "اسی لئے

اجتہادی غلطی کو وحی متلوّ کے ذریعہ دُور کیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ شیطانی دخل کا احتمال نہ رہے"۔ آپ کی اس عبارت کو ہم درست نہیں جانتے۔ کیونکہ ہر اجتہادی غلطی کا وحی متلوّ سے دُور کرنا ضروری نہیں وہ غلطی وحی خفی سے بھی دور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اجتہادی غلطی وحیٔ خفی سے بھی دُور ہوتی ہے۔ اور وحیٔ متلوّ سے بھی۔ اس لئے ہر اجتہادی غلطی کا فوری طور پر دور ہونا ضروری نہیں۔ البتہ جہاں پر اجتہادی غلطی میں دخل شیطان ہو۔ اس غلطی کو فی الفور وحی متلوّ یا وحی جلی سے ہی دُور کیا جا سکتا ہے۔ لہذا اس جگہ آپ کا یہ اعتراض کہ مرزا صاحب نے محدّثیت سے انکار کرکے اپنی وحی متلوّ یا وحی جلی (انت محدّث اللہ) سے انکار کر دیا ہے۔ اور ثابت کر دیا کہ یہ وحیٔ شیطانی تھی"۔ درست اعتراض نہیں ہے۔ "اَنْتَ مُحَدِّثُ اللہ" کی وحی وحیٔ شیطانی نہ تھی۔ وحیٔ رحمانی تھی۔ اور ہم اسے آج بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ برحق وحی مانتے ہیں۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو امتی نبی ماننے کے باوجود آپ کے محدّث اللہ ہونے کے منکر نہیں۔ کیونکہ ہر نبی پر محدّث ہونے کا اطلاق جائز ہے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خود بھی اَنتَ محدّث اللہ والے براہین احمدیہ میں مندرج الہام سے کئی سال بعد اپنی کتاب حمامۃ البشریٰ کے صفحہ ۹۶ پر لکھا ہے:۔

" وَجَازَ عَلٰى هٰذَا اَنْ الْقَوْلُ النَّبِىَّ مُحَدَّثٌ

عَلیٰ وَجْہِ الْکَمَالِ لِاَنَّہٗ جامع لجمیع کمالاتہ
علی الوجہ الاَتَمِّ الاَبْلَغِ بِالْفِعْلِ وَ
کَذٰلِکَ جَازَ ان نقول انّ المحدَّث
نَبِیٌّ بناءً علیٰ استعداد ہ الباطنی
اَعْنی اَنّ المحدَّث نَبِیٌّ بالقوّۃ ؎

ترجمہ :- اس بناء پر جائز ہے کہ ہم کہیں کہ نبی علیٰ وجہ الکمال محدّث ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کے تمام کمالات کا اتمّ اور ابلغ طور پر بالفعل جامع ہوتا ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ ہم کہیں کہ بے شک محدّث اپنی استعدادِ باطنی کے لحاظ سے نبی ہے۔ یعنی یہ کہ محدث بالقوۃ نبی ہے۔

اور اس سے پہلے اپنی تیسری کتاب توضیح مرام ص۱۹ میں بھی تحریر فرماتے ہیں :-

اعلم ارشدك الله تعالٰے انّ النّبیّ محدّث
والمحدّث نبیّ باعتبار حصول نوع من
انواع النبوّۃ -

کہ جان تو خدا تجھے ہدایت دے بے شک نبی محدث ہے اور محدّث نبوّت کی قسموں میں سے ایک قسم کی نبوّت رکھنے کی وجہ سے نبی ہے۔

پس جب نبی کو محدّث کہنا جائز ہوا ۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ایسے محدّث ضرور ہیں ۔ جو امتی نبی بھی ہیں ۔ لہذا اَنْتَ مُحَدَّثُ اللّٰہِ والا الہام اگر شیطانی ہوتا تو اس کو فوراً منسوخ کر دیا جاتا ۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام تو اس الہام کے کئی سال بعد بھی نبی کو محدّث کہنا جائز سمجھتے ہیں ۔ جیسا کہ ۱۹۰۱ء سے پہلے محدّث کہنا جائز سمجھتے رہے ہیں ۔ پس محدّث اللہ والے الہام میں اگر دخل شیطانی ہوتا تو یہ منسوخ کیا جاتا ۔ جن الہامات سے آپ نے اپنا صریح طور پر نبی ہونا لکھا ۔ وہ بھی رحمانی الہامات ہیں ۔ محدّث اللہ کے لغوی معنیٰ ایسا شخص ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف رکھتا ہو ۔ ان معنوں میں محدّث کا لفظ ہر نبی پر صادق آتا ہے ۔ پس حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ پر ان معنوں میں محدّث اللہ کا لفظ اب بھی منطبق ہے ۔ فتدبّر !

کفر و ایمان

آپ نے اپنے تیسرے خط کے صفحہ پر "مرزا صاحب کو نہ ماننے والا شخص کافر ہے یا نہیں" کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے :-

"مرزا صاحب نے تریاق القلوب میں لکھا ہے " ابتداء سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعویٰ کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا " کافر نہ ہونے کی وجہ یہ بتائی ۔ اور لکھا ہے " یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ

اپنے دعویٰ کے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف
ان نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالےٰ کی طرف سے شریعت
اور احکام جدیدہ لاتے ہیں" لیکن اربعین میں اپنی
بیعت میں شامل نہ ہونے والوں کو نجات سے محروم
قرار دیا اور لکھا کہ" اب دیکھو خدا نے میری وحی اور
میری تعلیم اور میری بیعت کو نوح کی کشتی قرار دیا ہے
اور تمام انسانوں کے لیے اس کو مدار نجات ٹھہرایا
ہے" چنانچہ کسی شخص نے مرزا صاحب کی توجہ ایسی
تحریروں میں تناقض کی طرف دلائی تو مرزا صاحب
نے نہ تو تناقض سے انکار کیا اور نہ ہی تناقض کو
رفع کیا بلکہ لکھا:۔ "یہ عجیب بات ہے کہ آپ کافر کہنے
والے اور نہ ماننے والے کو دو قسم کے انسان ٹھہراتے
ہیں۔ حالانکہ خدا کے نزدیک ایک ہی قسم ہے کیونکہ
جو مجھے نہیں مانتا وہ اسی وجہ سے نہیں مانتا کہ وہ مجھے
مفتری قرار دیتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَ
مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِب
اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ۔ یعنی بڑے کافر دو ہی ہیں ایک
خدا پر افتراء کرنے والا۔ دوسرا خدا کے کلام کی تکذیب
کرنے والا۔ پس جبکہ مَیں نے ایک مکذّب کے نزدیک

خدا پر افترا کیا ہے تو اس صورت میں نہ صرف میں کافر
بلکہ بڑا کافر ہوا۔ اور اگر میں مفتری نہیں تو بلاشبہ
وہ کفر اس پر پڑے گا" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳ طبع اوّل)
آپ سے گذارش ہے کہ اس تناقض کو آپ ہی رفع
کر دکھائیں۔ اور یہ بھی لکھیں کہ ایسا بڑا کافر دائرہ
اسلام سے خارج ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر دائرہ اسلام
سے خارج نہیں ہوتا۔ تو کیا دائرہ اسلام سے خارج
ہونے کے لئے اس سے بھی بڑا کافر ہونے کی ضرورت
ہوتی ہے جبکہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ اس سے بڑا کافر
نہیں ہوتا۔"

الجواب (۱) آپ نے تریاق القلوب کا حوالہ ادھورا پیش کیا ہے
آپ کی پیش کردہ عبارت سے آگے لکھا ہے:-
"لیکن صاحب الشریعت کے ماسوا جس قدر ملہم اور
محدّث ہیں۔ گو وہ کیسی ہی جناب الٰہی میں اعلیٰ شان
رکھتے ہوں اور خلعتِ مکالمہ الٰہیہ سے سرفراز ہوں،
ان کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔ ہاں بدقسمت
منکر جو ان مقربانِ الٰہی کا انکار کرتا ہے۔ وہ اپنے انکار
کی شامت سے دن بدن سخت دل ہوتا جاتا ہے یہانتک
کہ نورِ ایمان اس کے اندر سے مفقود ہو جاتا ہے"
(تریاق القلوب صفحہ ۱۳۰ طبع اوّل حاشیہ)

جناب من! سوچئے! جس سے نورِ ایمان مفقود ہوجائے وہ مسلوب الایمان ہوگا یا نہیں؟ کیا وہ مومن ہی رہے گا!! اور مسلوب الایمان ہو کر نجات سے محروم نہیں ہوگا؟ اگر محروم ہوگا اور یقیناً محروم ہوگا۔ تو کشتی نوح کی عبارت کا اس سے کیا تناقض رہا۔

(۲) حقیقۃ الوحی کی جو عبارت آپ نے پیش کی ہے اس کے سیاق سے ہرگز یہ ثابت نہیں کہ کسی شخص نے تریاق القلوب اور کشتی نوح کی عبارت سے تناقض ہونے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ پس آپ کا اوپر کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ کسی شخص نے مرزا صاحب کی توجہ ایسی تحریروں میں موجود تناقض کی طرف دلائی "

جناب من! سائل کا سوال یہ تھا کہ:۔

"حضور عالی نے ہزاروں جگہ تحریر فرمایا ہے کہ کلمہ گو اور اہل قبلہ کو کافر کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علاوہ ان مومنوں کے جو آپ کی تکفیر کر کے کافر بن جائیں۔ صرف آپ کے نہ ماننے سے کوئی کافر نہیں ہو سکتا۔ لیکن عبدالحکیم خاں کو آپ لکھتے ہیں کہ ہر ایک شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا۔ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بیان اور پہلی کتابوں کے بیان میں تناقض ہے۔ یعنی پہلے آپ تریاق القلوب وغیرہ میں لکھ چکے ہیں کہ میرے نہ ماننے سے

کوئی کافر نہیں ہوتا۔ اور اب آپ لکھتے ہیں کہ میرے انکار
سے کافر ہو جاتا ہے۔"

(حقیقۃ الوحی ص۱۶۳ طبع اول)

مکرمی! اس کا جو جواب آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف سے نقل کیا ہے جو سائل پر تعجب کے اظہار سے شروع ہوتا ہے وہ بھی آپ نے پورا درج نہیں کیا۔ آپ کی پیش کردہ عبارت سے آگے حضرت مسیح موعود علیہ السلام لکھتے ہیں:۔

"جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں خود فرمایا ہے۔
علاوہ اس کے جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی
نہیں مانتا۔ کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیشگوئی
موجود ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا انکار بالواسطہ کفر ہے کیونکہ رسول کریمؐ کے انکار کو مستلزم ہے۔ پس یہ لزومًا بڑا کفر ہے نہ کہ التزامًا۔ آگے چل کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ
اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا
وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ یعنی عرب
کے دیہاتی کہتے ہیں۔ کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہہ دو۔

تم ایمان نہیں لائے اور یوں کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار
کر لی۔ اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا
پس جبکہ خدا اطاعت کرنے والوں کا نام مومن نہیں
رکھتا تو پھر وہ لوگ خدا کے نزدیک کیونکر مومن ہو سکتے ہیں
جو کھلے کھلے طور پر خدا کے کلام کی تکذیب کرتے ہیں۔
اور خدا تعالےٰ کے ہزار ہا نشان دیکھ کر جو زمین و آسمان
میں ظاہر ہوئے پھر بھی میری تکذیب سے باز نہیں آتے
وہ خود اس بات کا اقرار رکھتے ہیں۔ کہ اگر میں مفتری
نہیں اور مومن ہوں تو اس صورت میں وہ میری تکذیب
اور تکفیر کے بعد کافر ہوئے۔ اور مجھے کافر ٹھہرا کر اپنے
کفر پر مہر لگا دی۔" (حقیقۃ الوحی ص۱۶۳)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ دراصل اس جگہ زیر بحث مسئلہ ایمان کا ہے نہ اسلام یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے اقرار کا۔ پس مسیح موعودؑ کی دعوت کا انکار کرنے والے مسلمان کو "مسلمان نہیں" کہنے سے مراد یہ ہے کہ کامل مسلمان نہیں یعنی مومن نہیں۔ عرب کے دیہاتیوں کو ایمان سے محروم کہکر خدا تعالےٰ نے اس آیت میں ظاہری مسلمان بھی قرار دیا ہے جو قُولُوْٓا اَسْلَمْنَا کے لفظ سے ظاہر ہے۔ اسی طرح جو مسلمان مسیح موعودؑ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی ظاہری چار دیواری سے خارج نہیں ہو جاتے۔ لیکن وہ ایمان کی

چار دیواری میں بھی نہیں رہتے۔ اس لئے تغلیظاً ایسے لوگوں کے لئے اگر اسلام سے خارج ہونے کا ذکر بھی کیا جائے۔ تو مراد اس سے یہی ہوگی کہ وہ حقیقتِ اسلام کو سمجھنے اور پانے سے قاصر رہے ہیں۔ نہ یہ کہ وہ اسلام کی ظاہری چار دیواری سے بھی خارج ہیں۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ مَن مشٰی مع ظالمٍ لیقوّیہ وھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الاِسْلَامِ (مشکوٰۃ) کہ جو شخص ظالم کے ساتھ اس کو قوّت دینے کے لئے چل پڑا یہ جانتے ہوئے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔ اب دیکھیو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ظالم کا اسلام سے نکل جانا قرار دیا ہے۔ تو یہ بلحاظ ظاہر کے نہیں بلکہ بلحاظ اس روح اسلام کے ہے جو اسلام ایمان کے لحاظ سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کہ عدل و انصاف قائم کیا جائے نہ کہ خود کسی ظالم کے ساتھ ہو کر ظلم کیا جائے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔ تغلیظاً ہی نہ کہ اسلام سے حقیقتاً اور التزاماً کا خروج مراد ہے۔ تغلیظاً فتویٰ کفر بُرے فعل کو بھیانک دکھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔

اوپر کی آیات میں ایمان کا دعویٰ کرنے والے عرب کے دیہاتیوں کو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ تم ایمان نہیں لائے۔ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اس طرح خدا نے انہیں مومن تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان خرج من الاسلام تغلیظاً سمجھا جائے گا۔ ورنہ خدا اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام میں تناقض ماننا پڑے گا۔ کہ خدا کہتا ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ ایسا ظالم خارج از اسلام ہے۔ ایسے معنی نہیں کہ وہ بالکل مسلمان ہی نہیں۔ فَافْهَمْ وَتَدَبَّرْ۔

اب رہا سائل کے سوال کا معاملہ۔ سو سائل اپنے سوال میں مکفرین مسیح موعودؑ کو کافر قرار دیتا ہے اور صرف نہ ماننے والوں کے متعلق یہ نتیجہ نکالتا ہے۔ کہ وہ آپ کی بعض عبارتوں کی رُو سے کافر نہیں ہو سکتے مگر عبدالحکیم خان کو لکھی گئی عبارت میں وہ مسلمان نہیں کے الفاظ کو اس کے خلاف خیال کرتا ہے۔ اور دونوں میں تناقض محسوس کرتا ہے اور تریاق القلوب کی عبارت کو بھی اس بات کی تائید میں پیش کرتا ہے۔ کہ آپ کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہو جاتا۔

اس سائل کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس کے اس فرق کرنے پر حیران ہیں۔ کہ مجھے کافر کہنے والے کو تو وہ کافر جانتا ہے اور نہ ماننے والے کو کافر نہیں جانتا۔ اور اس تعجب کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جو بھی مجھے نہیں مانتا وہ مجھے مفتری قرار دیتا ہے اور مفتری علی اللہ اور مکذّبِ آیات اللہ کو خدا نے اَظْلَمُ یعنی بڑا کافر کہا ہے۔ پس بات تو دراصل یہ ہوئی کہ آپ کو نہ ماننا بھی کافر کہنے

کے مترادف ہے۔ یعنی جس طرح کافر کہنے والا کافر ہے مومن نہیں اسی طرح انکار کرنے والا بوجہ آپ کو مفتری علی اللہ قرار دینے کے در اصل کافر کہنے والا ہی ہے۔ لہذا مومن نہیں۔ پس تریاق القلوب کا بیان سچا ہے۔ کہ فتویٰ کفر کسی پر آپ نہیں لگا سکتے یہ شارع نبی کا کام ہے۔ اور شارع نبی کی تعلیم سچے کو مفتری علی اللہ قرار دینے والے کو اَظلم یعنی کافر اکفر ٹھہراتی ہے۔ پس جو مسلمان ایسی بات کا مرتکب ہو تو یہ اسلام کے اندر ہو کر اس کا سب سے بڑا کفر ہو گا۔ البتہ وہ کفر جو اسلام کے دائرہ سے بالکل خارج کر دیتا ہے جس سے انسان غیر مسلم ہو جاتا ہے وہ کفر اسلام کا دعویٰ کرنے والے کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ وہ کفر تو اسلام یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صاف انکار کا نتیجہ ہے جو شارع نبی ہیں۔ پس تریاق القلوب اور آپ کے بعد کے کلام میں کوئی تناقض نہیں۔

عبدالحکیم خان کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو خط لکھا ہے اس میں مسلمان نہیں ہیں "نہیں" کا لفظ نفی کمال کے لئے ہے نہ کہ علی الاطلاق مسلمان ہونے کی نفی کے لئے۔ یعنی مومن ہونے کی نفی ہے یہ بات ہم اس لئے لکھ رہے ہیں کہ اسی کتاب حقیقۃ الوحی کے ص۱۷۹ پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام لکھتے ہیں:۔

"ہاں چونکہ شریعت کی بنیاد ظاہر پر ہے اس لئے ہم منکر کو مومن نہیں کہہ سکتے۔ اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مواخذہ سے بری ہے۔ اور کافر منکر کو ہی کہتے ہیں۔ کیونکہ کافر کا

لفظ مومن کے مقابل پر ہے اور کفر دو قسم پر ہے۔
(اوّل) ایک یہ کفر کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا
ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہیں
مانتا (دوم) دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں
مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے۔
جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول
نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید
پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے
فرمان کا منکر ہے۔ کافر ہے " (حقیقۃ الوحی ص۱۷۹)

اس عبارت سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک کفر کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار ہے اور قسم دوم مثلاً مسیح موعود کا انکار ہے اور دو قسمیں حقیقۃً ایک نہیں ہوا کرتیں۔ وہ جنس میں ایک ہو سکتی ہیں یا مؤاخذہ میں ایک۔ اس لئے پہلی قسم کا کفر غیر مسلموں کا کفر ہے اور مسلمان اگر مسیح موعود کا انکار کریں تو وہ پہلی قسم کے کافر نہیں ہوں گے۔ بلکہ دوسری قسم کے کافر ہوں گے۔ اور دوسری قسم کے کفر کا فتویٰ بھی مسیح موعود نہیں لگا سکتے اس لئے کہ وہ شارع نبی نہیں۔ فتویٰ آپ کے منکرین پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے انکار کے واسطہ سے لگے گا۔ اسی لئے تو آپ نے فرمایا ہے میرا انکار

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا انکار ہے پس آپ کے کلام میں اس جگہ کوئی تناقض موجود ہی نہیں۔

مکرمی! آپ نے ان عبارتوں کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے تناقض کا اعتراض پیش کر دیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان دو نو قسم کی عبارتوں پر سائل کے سوال پر تعجب کا اظہار اسی لئے کیا ہے کہ تناقض موجود ہونے کی نفی کریں۔ اور سائل کی اس غلط فہمی کو دُور کریں۔ کہ ان عبارتوں میں تناقض ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کرنے والے مسلمان بموجب حدیث نبوی امّت کے ۷۲ فرقوں میں داخل ہیں۔ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام شارع نبی نہیں بلکہ امتی نبی ہیں۔ اس لئے آپ کا انکار یا تکذیب کرنے والے مسلمان امتی کافر ہی ہوں گے اور امت کے اندر ہوتے ہوئے ان کا یہ کفر سب سے بڑا کفر ہو گا۔ کیونکہ مکذّب آیات اللہ کو بھی مفتری علی اللہ کی طرح خدا تعالےٰ نے اَظْلَم یعنی اکفر قرار دیا ہے۔ اور صیغہ اسم تفضیل کے معنے نسبت سے قائم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا صریح انکار کرنے والا اَکْفَرُ الْکُفَّارْ ہو گا۔ اور مسلمان مسیح موعودؑ کا انکار کرنے والا اَکْفَرُ الْمُسْلِمِیْن۔ وَاللّٰہُ اَعْلَم بالصّواب وَھُوَ المرجع والمآب۔

چودھویں صدی کا امام

آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی ایک عبارت ان الفاظ میں پیش کی تھی :-

"احادیث صحیحہ میں آیا تھا کہ وہ مسیح موعود صدی کے سر پر آئیگا۔ اور وہ چودھویں صدی کا امام ہوگا"

ہم نے آپ کو جواب میں لکھا تھا۔ کہ یہ استنباطی مضمون ہے اور ہم نے مسیح موعود علیہ السلام کے چودھویں صدی کے سر پر آنے اور چودھویں صدی کا امام ہونے کا ثبوت احادیث نبویہ سے پیش کر دیا تھا۔ جب استنباط کے لحاظ سے یہ مضمون ثابت ہے تو چاہیئے تھا کہ آپ خشیۃ اللہ کو مدّ نظر رکھتے ہوئے حقیقت کو پالینے کی کوشش کرتے۔ مگر آپ نے بحث برائے بحث کو جاری رکھنا چاہا ہے۔ اور پھر یہ سوال کر دیا ہے کہ کس حدیث میں آیا ہے کہ مسیح موعود صدی کے سر پر آئے گا۔ یا مسیح موعود مجدّدوں میں سے ایک مجدّد ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک مسیح موعود مجدّد اسلام نہیں۔ گویا آپ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السّلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہوکر آنے والے نہیں بلکہ مستقل نبی کی حیثیت میں نازل ہوں گے۔ اگر یہ بات ہو تو اس صورت میں وہ مسلمانوں کے امام کیسے ہو سکتے ہیں کیا وہ مسلمانوں کو انجیل کی دعوت دیں گے۔ اگر ایسا نہیں بلکہ قرآن کی دعوت دیں گے۔

توبحیثیت امام وہ اسلام کے مجدد ہی ہو سکتے ہیں مستقل رسول کی حیثیت سے وہ نہیں آسکتے۔ علماء اسلام نے یہی لکھا ہے۔ یحکم بشریعۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ شریعت محمدیہ کے مطابق حکم کرے گا۔ پس وہ امتی بھی ہوگا۔ اور نبی بھی۔ پس اس کا مقصد تجدید اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں نبوت کی بحث میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے انبیائے بنی اسرائیل کو دین موسوی کے مجدد ہی قرار دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسیح موعود کے متعلق فرمایا ہے اَلَا اِنَّہٗ خلیفتی فی اُمتی۔ پس اس کا کام احیائے دین ہی ہو سکتا ہے۔ جو مجدد دین کا کام ہے۔ اور ابو داؤد کی حدیث ہر صدی کے سر پر مجدد کے آنے کی ہی خبر دے رہی ہے۔ لہذا اگر آپ کو ان کے مجدد ہونے سے انکار ہے تو پھر آپ کو انہیں مستقل نبی قرار دینا پڑے گا۔ اس حیثیت میں وہ امت کے امام نہیں ہو سکتے اور اس صورت میں ان کی آمد صریح اور کھلے طور پر ختم نبوت کے منافی ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں صرف ایک حدیث ہی پیش نہیں کی۔ بلکہ تین مختلف حدیثوں سے استنباط کیا ہے۔ کہ مسیح موعود کو چودھویں صدی کے سر پر آنا چاہیئے اور مجدد دین والی حدیث سے اس کے مجدد ہونے کا استدلال کیا ہے۔ پس ان احادیث کو ملا کر یہ مشترک مضمون ثابت ہے کہ مسیح موعود کو چودھویں صدی کے سر پر آنا چاہیئے تھا اور

وہ چودھویں صدی کا امام ہے۔ اس کی امامت کے بارے میں بھی ہم نے تین حدیثیں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند احمد بن حنبل سے پیش کی تھیں صحیح بخاری میں الفاظ یہ ہیں امامکم منکم اور صحیح مسلم میں فامکم منکم اور مسند احمد میں اماماً مھدیاً حکماً عدلاً بھی مذکور ہے۔ پس وہ مہدی خدا سے ہدایت یافتہ ہو کر تجدید دین کے لئے ہی مامور ہے۔ نہ شریعتِ جدیدہ لانے کے لئے۔ یہ سب احادیث جو پیش کی گئی ہیں صحیح ہیں اور واقعہ کا وقوع ان کا مصدق ہے۔

صحیح حدیث کی تعریف ہمارے نزدیک وہی ہے۔ جو ائمہ اہل حدیث نے بیان کی ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک اگر کسی حدیث میں ضعف بھی موجود ہو لیکن واقعہ اس کے مطابق وقوع میں آجائے تو وہ خبر صادق ہوگی۔

نکتۂ معرفت ایک نکتۂ معرفت سنیئے، رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابنِ مریم کے نزول کی پیشگوئی فرمائی ہے۔ قرآن مجید سے اصل ابن مریم کی وفات ثابت ہے لہذا مثیل ابن مریم کا آنا مراد ہوا۔ ابن مریم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے بعد چودھویں صدی میں آئے تھے، مماثلت کا یہ پہلو بھی متقاضی تھا کہ امتِ محمدیہ کا موعود ابنِ مریم یعنی مثیل مسیح، امتی نبی بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے چودھویں صدی میں آئے۔ لہذا آپ کے بعد مثیل مسیح تو آسکتے ہیں، مگر جو چودھویں صدی میں نہ آئیں وہ چودھویں صدی میں آنے کی مماثلت سے محروم ہوں گے۔ فتدبر!

بہت سے نام اس عنوان کے تحت آپ نے یہ سوال کیا ہے۔ عیسیٰ بن مریم، مسیح موعود، مثیل مسیح، اماماً منکم، اماماً مہدیاً حکماً عدلاً۔ نبی اللہ ایک ہی شخص کے مختلف نام یا القاب ہیں یا ایک سے زیادہ اشخاص کے۔ یعنی کیا ہر مثیل مسیح (اور مثیل مسیح بہت سے ہو سکتے ہیں) کو ان تمام ناموں یا القابوں سے پکارا جا سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگر بالفرض آئندہ کوئی مثیل مسیح آئے تو جن ناموں سے پکارا جانے کا وہ مستحق ہوگا۔ وہ خود ان کا اعلان کرے گا۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ لہذا آپ کا یہ سوال غیر متعلق اور قبل از وقت ہے۔

ہر گورنمنٹ کی وفاداری اس عنوان کے تحت آپ نے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی یہ عبارت پیش کی ہے۔

"یہ ایک واقعی امر ہے کہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کا حکم ہے کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت ہوں وفاداری سے اس کی اطاعت کریں"

جناب من! اس کی اجازت تو آپ کو بھی مسلم تھی۔ اس کے حکم ہونے سے انکار تھا۔ ہم نے آیتِ قرآنیہ کے لفظ واُولی الامر منکم سے آپ کو اللہ کا حکم دکھا دیا۔ پھر لا طاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق

کی حدیث کے حکم سے یہ ثابت کر دیا کہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ کی ہو سکتی ہے نہ کسی اور مخلوق کی۔ گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کوئی غیر معروف حکم نہیں دے سکتے تھے۔ تاہم بیعت میں شرط امرِ معروف میں اطاعت کی بھی رکھی گئی۔ ہم نے آپ سے غیر مسلم کی حکومت کی اطاعت کی اجازت کے لئے (اجازت بھی فقہی اصطلاح میں احکام میں سے ایک حکم کی ہی قسم ہے) قرآنی ثبوت مانگا تھا۔ آپ نے سورۃ نساء کی آیات ۹۷ تا ۹۹ پیش کی ہیں۔ ان میں تو غیر مسلم حکومت میں صرف کمزور بچوں اور عورتوں کے مجبوراً ہجرت نہ کر سکنے کا ذکر ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس وجہ سے انہیں عذاب نہیں ہوگا۔ ان آیات میں کہاں بتایا گیا ہے کہ غیر مسلم حکومت کے ماتحت اطاعت کرنے کی اجازت ہے۔ ان آیتوں میں تو کوئی ایسے الفاظ نہیں جن میں اس سے زیادہ کوئی ذکر ہو جو ہم نے بیان کیا ہے۔

پھر آپ نے اپنی ذیل کی عبارت میں یہ مان لیا ہے کہ :-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل، یعنی صحابہ کرام کو جان بچانے کی خاطر وقتی طور پر حبشہ کو ہجرت کر جانے کے ارشاد سے اجازت ثابت ہے۔"

جناب من! آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ حکم ثابت ہے۔ صحابہ کرامؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے جب ہجرت فرمائی تھی تو حکم ثابت ہو گیا۔ کیا آپ کی لغت میں نبی کا ارشاد حکم نہیں ہوتا۔ ارشاد صرف اجازت ہی ہوتی ہے؟

پس حبشہ کے والی کی اطاعت، نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ثابت ہو گئی یا نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ حبشہ کا والی شریف آدمی تھا۔ اور اس کی رعایا پُر امن زندگی گذار رہی تھی۔ اس لئے صحابہ کرام کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے ہی اس پُر امن مُلک میں بھجوا دیا۔ جہاں کا والی عیسائی تھا۔ اس سے ثابت ہُوا کہ اگر غیر مسلم حکومت ایسی ہو کہ مسلمانوں کو وہاں جان و عزت کی امان مل سکے اور وہ مسلمانوں کے دین میں مداخلت کرنے والی نہ ہو تو اس کی اطاعت کا حکم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ وَ هٰذَا هوالمرام۔

جناب من! آپ نے غیر مسلم حکومت کی اطاعت کے ثبوت میں تیسری وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ:۔

> "انبیاء علیہم السلام کے طرزِ عمل سے جو قرآن میں درج ہے ثابت ہے کہ تبلیغ اسلام کی خاطر اور دار الکفر کو دار الاسلام میں تبدیل کرنے کی خاطر، دار الکفر میں بسنے کی اجازت ہے۔ لیکن کسی غیر مسلم حکومت کی وفا داری سے اطاعت کا حکم نہیں"

جناب من! اگر حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ کے مطیع نہ تھے تو خدا نے یہ کیوں فرمایا۔ "ماکان لیأخذ اخاہ فی دین الملک"؟ کہ وہ اپنے بھائی کو شاہی قانون کے مطابق اپنے پاس

نہیں رکھ سکتے تھے۔ کیوں نہیں رکھ سکتے تھے؟ اس لئے کہ وہ اس مُلک کے قانون کے پابند تھے۔ اور اس پابندی کو لازم سمجھتے تھے۔ اور اس طرح مُلکی قانون کے وفادار تھے۔ اگر وفادار نہ ہوتے تو مُلکی قانون توڑ کر بھائی کو رکھ لیتے۔

جنابِ من! آپ کو غیر مسلم حکومت کی اطاعت کی اجازت تو مسلّم ہے۔ مگر وفاداری سے اجازت مسلّم نہیں۔ ہم نے آپ سے پوچھا تھا کہ غیر مسلم حکومت کی اطاعت اگر وفاداری سے نہیں تو کیا بغاوت کرنی چاہیئے۔ آپ نے اپنی ہوشیاری ظاہر کرتے ہوئے ہم سے یہ دریافت کیا ہے کہ آپ کے نزدیک جو شخص زار و قطار رو نہیں رہا وہ ضرور قہقہے مار کر ہنس رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کوئی تیسری صورت بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ کہ جب انسان نہ رو رہا ہو نہ ہنس رہا ہو۔

جنابِ من! یقیناً ان دو صورتوں کے درمیان ایک تیسری صورت سکون کی حالت کی ہے۔ مگر وفاداری سے اطاعت اور بغاوت کے درمیان تیسری صورت منافقت کی ہے۔ کیا اسے آپ پسند کرنا چاہتے ہیں۔ مکرمی! اطاعت کا مفہوم ہے قانون شکنی نہ کرنا۔ اور غیر مسلم حکومت آپ سے اتنی ہی وفاداری چاہتی ہے۔ کہ قانون شکنی اور بغاوت نہ ہو۔ پس وفاداری کی دو صورتیں ہو گئیں۔ ایک صورت مسلم حکومت کی وفاداری کی اور دوسری غیر مسلم حکومت کی وفاداری کی۔ اطاعت و وفاداری کے ساتھ ارادت کا حق خلافت راشدہ کا ہے۔ یا

انبیاء و ائمہ دین کا۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے جو غیر مسلم حکومت کی وفاداری کی تعلیم بیان فرمائی ہے اس کی حد یہی ہے کہ قانون شکنی نہ ہو اور پُرامن زندگی بسر کریں۔ اور بلاوجہ حکومت کے لئے تشویش کا باعث نہ ہوں۔

جناب من! آپ کے نزدیک غیر حکومت میں تبلیغ اسلام کے لئے رہنے کی اجازت ہے تو حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ اور اُن کی جماعت کا کام تو تبلیغِ اسلام ہی ہے۔ وہ اگر انگریزی حکومت میں پُرامن رہے ہیں۔ اور قانون شکنی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ تو یہ تو انبیاء کے طریق پر عمل ہوا لہذا آپ کو اس پر اعتراض کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ خدا کے انبیاء اور ان کی جماعتیں منافقانہ زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام رومی حکومت کے ماتحت رہے، نہ بغاوت خود کی، نہ اپنی قوم کو بغاوت کی تعلیم دی۔ بلکہ سبق اطاعت کا ہی دیا۔ منافقت کا نہیں۔ پس ایک مسلمان کس طرح منافقانہ زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ اور پھر تبلیغ اسلام کے مقدس کام کے لئے۔ آپ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ اور بلاوجہ اس بات میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ کے طرزِ عمل کو غلط قرار دینے کی کوشش نہ کریں۔

"اُولی الامر منکم کی اطاعت ایمان کا تقاضا ہے"

اس عنوان کے تحت آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمیں مسلّم ہے۔ جبکہ

اُولی الأمر مومنوں میں سے ہو۔ لیکن اگر غیر مسلم حکومت مسلمانوں پر مسلّط ہو جائے اور غیر مسلم ملک، کا ولیٔ امر بن جائے تو سورۃ آل عمران کی آیت ۲۸ کے مطابق اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔ کی شرط کے مطابق اس سے پورا بچاؤ کر لینے کے بعد اسے وَلیٔ امر تسلیم کر لینا جائز ہے۔ کیونکہ آیت میں اولیاءؔ کا لفظ جو ولی کی جمع ہے عموم رکھتا ہے۔ اور اس سے دوست بھی مراد ہو سکتا ہے اور ولیٔ امر بھی۔ اس سے آپ کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہاں بچاؤ کر لینے کے بغیر کافروں سے دوستی اور ان کی ولایت جائز نہیں۔ پس اگر غیر مسلم حکومت مداخلت فی الدین نہ کرے یعنی فرائض، عبادات اور معاشرتی مسائل شادی بیاہ طلاق اور ورثہ کے اسلامی مسائل میں دخل نہ دے۔ تو اس کی حکومت تسلیم کی جائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کی شرط پوری ہو جائے گی۔ اور مسلمان ظلم سے بچ جائیں گے۔ پس غیر مسلم حکومت میں ایسے ظلم سے بچاؤ ہو جانے پر جس کا تعلق مداخلت فی الدین یعنی فرائض دینیہ اور معاشرتی امور سے ہو۔ غیر مسلم حکومت کی اطاعت کا حکم بھی اسی آیت سے اخذ ہو سکتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ غیر مسلم کسی مسلمہ کا بصورت خاوند ولیٔ امر نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق معاشرتی امور سے ہے۔ اور قرآن مجید مسلمہ کے غیر مسلم کے نکاح میں آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس مسئلہ میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً والی صورت یہی ہے۔ کہ ایک مسلم،

غیر مسلم یہودی اور عیسائی عورت سے بلاشک نکاح کر سکتا ہے۔ اور مودت کی حد تک اُن میں باہم ولایت پائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کا اُلٹ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس سے خدا نے حکماً روک دیا ہے۔

قرآن کریم ایک کامل کتاب ہے اس لئے ضروری تھا کہ وہ غیر مسلم حکومت میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے راہِ عمل بتاتی۔ چنانچہ جب غیر مسلم حکومت مذہبی آزادی دیتی ہو اور تبلیغ دین میں روک نہ ہو، تو اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کی شرط کے مطابق اس حکومت کا والی امر ایسی آزادی دینے کی وجہ سے اُولی الامر منکم میں لفظ منکم کی وسعت کے لحاظ سے شامل سمجھا جانا چاہیئے۔ لفظ منکم میں وسعت، قرآن و حدیث میں بھی مسلم ہے۔ بموجب آیت قرآنیہ سورۃ زمر وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ (آیت ۷۱) میں آپ نے منکم کے معنے انسان تسلیم کر لئے ہیں اور یہود بنی عوف سے متعلقہ حدیث نبویہ کی بناء پر بھی بنی عوف اور مسلمانوں میں معاہدہ صلح کی وجہ سے منہم کے لفظ سے یہود کا مسلمانوں سے متحد ہو جانا بھی تسلیم کر لیا ہے اور ان کے کلمہ اور قوت کا ایک ہو جانا مان لیا ہے۔ تو اس وسعت کو تسلیم کر لینے کے بعد ایک مذہبی آزادی دینے والی غیر مسلم حکومت کے لئے جس کی اطاعت کا جواز آپ تبلیغی ضرورت کے لئے بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ اُولی الامر ہونے کا جواز تسلیم کرنے سے

آپ کو کس طرح انکار ہو سکتا ہے۔ اختلاف آپ کو صرف وفاداری سے طاعت میں ہے حالانکہ قانون شکنی نہ کرنا بھی وفاداری ہے۔ اور جب غیر مسلم حکومت مسلمان سے اسی کی توقع رکھ سکتی ہے۔ تو پھر غیر مسلم حکومت کی وفاداری سے اطاعت کے جواز پر آپ کے لیئے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اور جواز بھی ایک شرعی حکم ہی ہے۔ اور جب غیر مسلم حکومت کی رعایا ہونا قبول کر لیا۔ اور ہجرت نہ کی تو یہ امر اطاعت کو اپنے لئے ضروری قرار دینے پر ہی منتج ہوگا۔ کیونکہ بغاوت کو آپ بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اور عدم وفاداری سے اطاعت، اطاعت نہیں بلکہ منافقت ہے جسے کوئی شریف مسلمان پسند نہیں کر سکتا۔

دین اور سیاست

اس میں کچھ شک نہیں کہ جہاں صحیح اسلامی حکومت قائم ہو وہاں سیاسی امور بھی دینی امور ہی قرار پاتے ہیں۔ اور ان کے درمیان کسی حدِ فاصل قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی گو حدِ فاصل ہے ضرور۔ لیکن جہاں اسلامی حکومت نہ ہو بلکہ غیر مسلم حکومت ہو اور مسلمان بھی اس حکومت کے تحت رہتے ہوں۔ یا تبلیغ کے ذریعہ وجود میں آئیں تو وہاں دینی امور اور سیاسی امور میں حدِ فاصل مقرر کرنا ضروری امر ہوگا اور وہاں دینی امور میں اگر حکومت دخل دے۔ تو وہاں سے ہجرت کر جانا مسلمان کا فرض ہوگا۔ تاکہ اپنے دین کو بچا سکے۔ لیکن اگر غیر مسلم حکومت

دین میں آزادی دیتی ہو۔ تو وہاں سے ہجرت ضروری نہیں ہو گی۔ بلکہ سیاسی امور میں حکومت کی اطاعت ہی ضروری ہو گی حسبِ آیت اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وہاں مسلمان غیر مسلم حکومت کی دینی امور میں مداخلت سے محفوظ ہوں گے۔ چونکہ ہماری قائم کردہ حدِّ فاصل دینی اور سیاسی امور میں آپ کو مسلم نہیں اس لئے آپ پر فرض ہے کہ وہ حدِ فاصل قائم کریں۔ مگر عجیب بات ہے کہ آپ غیر مسلم حکومت کی اطاعت بھی بعض صورتوں میں تسلیم کرتے ہیں لیکن پھر سیاسی امور کو بھی دینی امور قرار دے کر آپ کوئی حد فاصل قائم کرنا نہیں چاہتے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو مخمصہ میں ڈال کر انہیں غیر مسلم حکومت میں منافقانہ زندگی گذارنے کو گویا جائز سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کے اس طریق پر کوئی عمل کرے۔ اور اسی کی غیر مسلم حکومت میں تلقین کرے۔ تو یقیناً غیر مسلم حکومت ایسے مسلمانوں کے وجود کو اپنے لئے خطرہ سمجھکر ملک بدر کر دے گی۔ اور دنیا میں مسلمانوں کے رلیئے تبلیغ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ حالانکہ تبلیغ تو ان کی زندگی کا ایک اہم مقصد ہے۔ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو بدامنی پیدا کرنا نہیں سکھاتا۔ خصوصًا جبکہ غیر مسلم حکومت میں اسے مذہبی آزادی بھی حاصل ہو۔ جیسا کہ آیت اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کا مفاد ہے۔ کہ اپنا بچاؤ کر لینے کے بعد غیر مسلموں کی ولایت اور ان کا دلی امر تسلیم کر لینا جائز ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلمانوں کا ولیُ امر اگر مسلم نہ ہو بلکہ غیر مسلم ہو تو وہاں سیاسی امور میں اسی حکومت کی اطاعت کی جائے گی۔ تاکہ خلفشار اور بدامنی پیدا نہ ہو۔ اس حکومت کے سیاسی اُمور میں اطاعت کا فعل خلافِ اسلام نہیں سمجھا جائیگا یعنی اطاعت کنندہ معصیت کا مرتکب نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ وہ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کی شرط کے مطابق ایسا کرے گا۔ غیر مسلم حکومت میں اُس کا سیاسی دین یہی ہوگا۔ کہ حکومتِ وقت کی اطاعت کرے۔ پس اس طرح غیر مسلم حکومت از روئے تعلیم قرآن مجید مسلمانوں کیلئے اولی الامر قرار پائے گی۔ گو یہ صورت اضطراری ہوگی۔ اور اس حکومت میں رہنے والے مسلمانوں کی کوشش یہی ہونی چاہیئے۔ کہ وہ تبلیغ اسلام پر زور دے کر غیر مسلم حکومت کو مسلمان بنائیں۔ یہ ان کا جہادِ کبیر ہے۔ جس پر انہیں کاربند ہونا چاہیئے۔ تا دنیا کی زندگی ہی ان کا مقصد نہ بن جائے پس اسلامی تعلیم میں خدا نے لچک رکھی ہے۔ اور یہ امر اس کی تعلیم کے کامل ہونے کا ثبوت ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کا طرزِ عمل

جناب من! انبیاء علیہم السلام کا طرزِ عمل کے عنوان کے تحت آپ کا پہلا سوال ہجرتِ حبشہ کے متعلق یہ ہے کہ کیا ان کو (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کو۔ ناقل) حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے وفاداری سے اطاعت کا حکم دیکر بھیجا تھا؟

جواباً عرض ہے کہ اس بارہ میں مروی ہے۔ اَمَرَ صلی اللہ علیہ وسلّم اصحابَہٗ بالخروج الی ارض الحبشہ وَ قال ان بھا مَلِکًا صالحًا لَا یَظْلِمُ وَ لَا یُظْلَمُ عِنْدَہٗ اَحَدٌ۔

(تفسیر خازن جلد اول صہ ۵۱۸ زیر آیت قسیین و رہبانًا)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حبشہ کی زمین کی طرف نکل جانے کا حکم دیا اور فرمایا۔ وہاں ایک نیک بادشاہ ہے۔ جو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اور نہ ظلم ہونے دیتا ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حبشہ میں ہریں وجہ ہی جانے کا امر کیا تھا یعنی حکم دیا تھا کہ وہ حبشہ چلے جائیں۔

صحابۂ کرام جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے واقف تھے۔ ان کی طرف سے حبشہ میں کوئی قانون شکنی ثابت نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کا حکومت سے تعاون اور خیر خواہی کا ثبوت ہی ملتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ عن ابیہ سے مروی ہے۔

قَالَ نَزَلَ بالنجاشی عدوٌّ من اَرضِھِمْ فَجَاءَہٗ المھاجرونَ فقالوا اِنّا نُحِبُّ اَنْ نخرجَ اِلَیْھِمْ حتّٰی نقاتلَ مَعَکَ وَ تَرٰی جُرْئَتَنَا وَ نَجزیکَ بِمَا صَنَعْتَ بِنَا۔ یعنی نجاشی پر اُن کی زمین میں کوئی دشمن آ اُترا۔ تو مہاجرین نے نجاشی کے پاس آکر کہا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ

مل کر ان سے لڑیں اور تو ہماری جرأت ملاحظہ کرے۔ اور
ہم آپ کو اس نیکی کا بدلہ دیں جو آپ نے ہمارے ساتھ
کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۴۴۳)

اس سے ظاہر ہے کہ صحابہؓ حبشہ میں نہ صرف پُر امن رہے۔ بلکہ نجاشی کے دشمن سے لڑنے کے لئے بھی تیار تھے۔ تاکہ نجاشی کی نیکی کا بدلہ دیں۔

تاریخ طبری میں ہے صحابہ کرام۔ نجاشی کی دشمن پر فتح کے لئے دعائیں بھی کرتے رہے۔ جو کہ حکومت ہذا کی وفاداری سے بڑھ کر بہبودی اور خیر خواہی کا ثبوت ہے۔

(۲) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی شہریت کے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جو کوشش کی تھی۔ وہ وہاں کی حکومت کے قانون کے مطابق تھی۔ جناب من! آپ لکھتے ہیں میرے نزدیک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ایسا کیا تو وہ بامرِ مجبوری کیا۔ جناب من! مجبوری تو بے شک تھی مگر قانون شکنی بھی تو نہیں کرنا چاہی۔ اور قانون شکنی نہ کرنا بھی قانون سے ایک نوع کی وفاداری ہی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

نمبر (۳) میں آپ ہم سے پوچھتے ہیں:۔

"سوال یہ ہے کیا حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کے قانون
کے مطابق عمل نہ کر کے اور اللہ تعالےٰ نے عمل نہ کروا کر
بادشاہ کے قانون سے وفاداری سے اطاعت کا ثبوت مہیا

فرمایا یا اس کے خلاف؟

جنابِ من! اطاعت کا ثبوت ہی مہیا فرمایا ہے۔ قانون نہ توڑنا ہی اطاعت ہے۔ انہوں نے قانون شاہی کی پابندی کی اور خدا نے بھی پابندی کروائی۔ البتہ خدا نے اپنی ایک تدبیر سے انکی اس خواہش کو بھی پورا کر دیا۔ کہ ان کا بھائی ان کے پاس رہ جائے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ۔ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (سورۂ یوسف آیت ۷۶) اسی طرح ہم نے یوسفؑ کے لئے تدبیر کر دی۔ وہ اپنے بھائی کو شاہی قانون کے مطابق اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ پس خدا نے توان کو قانون شکنی سے بچایا۔ لیکن آپ اسے اُلٹا سمجھ رہے ہیں۔ بے شک حضرت یوسفؑ پر ظلم ہوا تھا۔ اور انہیں کسی ماتحت حاکم نے قید میں ڈال دیا تھا۔ لیکن خدا تعالےٰ نے پھر بھی حضرت یوسفؑ کو قانون شکنی سے بچایا۔ اور قانون شکنی نہ کرنا ہی قانون کی وفاداری ہے۔ اس کا التزام تو آپ سے خود خدا تعالےٰ نے کرایا۔ اور اپنی تدبیر سے قانون شکنی نہ ہونے دی۔ کیونکہ یہ بات اس کی مشیّت کے اس وقت خلاف تھی کہ قانون شکنی وقوع میں آئے۔

(۴) حضرت عیسیٰ نے نہ خود رومن حکومت کے کسی قانون کو توڑا تھا نہ ہی اپنی جماعت کو یہ تعلیم دی تھی۔ لیکن جب ان پر ظلم حد سے بڑھ گیا۔ تو پھر وہ فلسطین سے ہجرت کر گئے۔ لہٰذا بعد ازاں وفاداری

سے رومن حکومت کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انگریزوں سے آزادی کس طرح حاصل کی؟

ہم نے لکھا تھا کہ عاقبت اندیش اور سمجھدار مسلمان انگریزی حکومت کے وفادار رہے۔ اور انہوں نے اپنے پرسنل لاء کی آزادی کے حصول کے بعد بغاوت نہیں کی۔ اور انگریزوں سے آزادی بھی آئینی طریقے سے حاصل کی نہ کہ بغاوت سے۔ ہم اپنے بیان کی صحت پر اب بھی قائم ہیں۔ مگر آپ پوچھتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کو جو آزادی دی تو کیا وہ یہاں کے لوگوں کی وفاداری سے متاثر ہو کر دی تھی یا اس خوف سے کہ اگر آزادی نہ دی تو بغاوت ہو جائیگی اور آپ کے نزدیک انگریزوں کے خلاف کانگریس اور مسلم لیگ نے جو تحریکیں شروع کی تھیں کیا وہ بھی وفاداری سے اطاعت کا کا اظہار تھیں یا بغاوت؟

جواباً عرض ہے کہ مسلم لیگ نے آزادی تو آئینی طریق سے ہی حاصل کی۔ بغاوت نہیں کی۔ اور آئین کے اندر رہ کر آزادی حاصل کرنا قانون شکنی نہیں ہے۔ چونکہ قانون شکنی نہ کرنا ایک نوع کی وفاداری ہی ہے اس لئے مسلم لیگ کی طرف سے بغاوت وقوع میں نہیں آئی۔ انگریزوں نے اپنے وعدہ کے مطابق ہندوستانیوں کو حقوق دینا چاہا تھا۔ انہی حقوق کا مطالبہ بالآخر آزادی پر منتج ہوا۔

انگریز کو اگر کوئی خطرہ تھا بھی تو اس کے لئے مسلم لیگ ذمہ دار نہیں۔ جس کا اقدام آئینی تھا۔ کانگریس میں جو مسلمان شامل تھے۔ وہ اکھنڈ بھارت چاہتے تھے۔ مسلم لیگ نے مرکز میں تیس کی تیس نشستیں جیت لیں اور صوبجات میں بھی نشستوں کی اکثریت حاصل کر لی۔ تو انگریزوں کے لئے ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہو گئی۔ گو ہندو کو اس سے بہت صدمہ ہوا۔ اور اس نے چالبازی سے پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ کروالیا اور جاتے ہوئے انگریز مسلمانوں پر یہ ظلم ضرور کر گیا۔ جس میں اس کے اپنے کچھ سیاسی مقاصد تھے۔

اگر کانگریسی مسلمانوں کی خواہش پوری ہو جاتی تو اکھنڈ بھارت بنتا۔ اور سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا وہی حال ہوتا۔ جس سے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان دوچار ہیں۔ بھارت کی حکومت گو اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہے مگر اس کے باوجود وہاں مسلمان بیچارے پس رہے ہیں۔ اور آئے دن فسادات کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھارت کی حکومت کو سمجھ دے۔ آمین۔

باطل کے خلاف جنگ اور مسلسل جنگ

اس عنوان کے ذیل میں آپ نے نظریاتی جنگ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک فریق اپنے دین کے سچا ہونے کی وعظ و تبلیغ کرتا ہے اور جب بعض دفعہ یہ نظریاتی جنگ، افراد کے خلاف جنگ کی شکل اختیار کر لیتی

ہے چنانچہ حالات۔ موقع اور محل کے لحاظ سے ایک مومن کا کردار جو ہو سکتا ہے وہ اس حدیث میں سمٹ آیا ہے۔ کہ "تم میں سے جو کوئی برائی ہوتا دیکھے تو اُسے چاہیئے کہ ہاتھ سے روکے۔ اگر اتنی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اور اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں ہی برا جانے"۔

جنابِ من! ہمیں آپ کے اس مضمون سے اتفاق ہے۔ لیکن آگے آپ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سلیمانؑ کا واقعہ پیش کرتے ہیں۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے دوسروں کے عبادت خانوں میں داخل ہو کر ان کے خود ساختہ معبودوں کا کلہاڑے سے صفایا کر دیا۔ جنابِ من! ہمارے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تو خانہ کعبہ کے بُت مکہ فتح کرنے کے بعد توڑے اور ہمیں قرآن مجید کی یہی ہدایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ پر عمل کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے کیوں ابراہیمی طریق اختیار نہ کیا؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ جن بتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توڑا تھا۔ وہ ان کے گھر یلو تیجانہ کے بُت تھے۔ نہ کہ کسی قومی بت خانہ کے بُت۔ ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنہیں ابراہیمی ملّت کے اتباع کا حکم تھا۔ مکہ میں رہتے ہوئے بھی کعبہ کے بُت توڑ دیتے۔ خواہ آپ کی جان پر بن جاتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پوزیشن میں نہ تھے کہ قومی بُت خانہ کے بتوں کو توڑتے۔

رہا سلیمان علیہ السلام کا بلقیس کے ملک پر چڑھ جانے کا معاملہ، اس

کا سبب حضرت سلیمانؑ کے خط میں اَلَّا تَعْلُوا عَلَیَّ بیان ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس ملک والے حضرت سلیمانؑ کے خلاف تیاری کر رہے تھے۔ اور حضرت سلیمانؑ اپنی سرحد کو مضبوط کرنے کے لئے نکلے تھے۔ چونکہ ملکِ سبا کی ملکہ بلقیس نے آپ کی اطاعت قبول کر لی اس لئے لڑائی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پس اس چڑھائی کی وجہ سیاسی تھی، مذہبی نہ تھی۔ حضرت سلیمانؑ کی نبوّت تو بنی اسرائیل کے لئے تھی، مگر چونکہ وہ بادشاہ بھی تھے اس لئے اپنی سرحدوں کا مضبوط رکھنا اُن کا فرض تھا، جو وہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔

اتمامِ حجّت

اس بحث کے آخر میں بطور اتمام حجت ہم علماء اسلام کی بعض عبارتیں پیش کرتے ہیں جو غیر مسلم حکومت کی اطاعت کا بعض شرائط کے ساتھ فتویٰ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب غیر مسلم، مسلمانوں کے بعض ممالک پر قابض ہوئے تو اُس وقت دارالاسلام اور دارالحرب کا سوال پیدا ہوا۔

۱۔ فتویٰ بزازیہ میں لکھا ہے:۔

"اَمّا البلاد التی علیھا وُلاۃٌ کُفّارٌ فیجوز فیھا ایضًا اِقامۃ الجُمُعِ والاَعیادِ والقاضی قاضٍ بتراضی المسلمین و قد تُقرِّرَ اَنَّ بِبَقاءِ شیءٍ من العِلّۃِ یبقی الحُکمُ وَقَدْ

حَكَمْنَا بِلَا خَلَافٍ بِاَنَّ هٰذِهِ الدِّيَارَ
قَبْلَ اِسْتِيْلَاءِ التَّتَارِ كَانَ مِنْ دِيَارِ
الاسْلَامِ وَبَعْدَ استيلاءِ هُمْ اعلانُ
الاذان والجُمُعِ والجماعات والحُكْمُ
بمقتضٰى الشرع والفتوٰى والتدريس
شَائِعٌ بِلا نَكِيْرٍ مِنْ مُلُوكٍ فالحُكْمُ بَانَّهَا
مِنْ دَارِ الحربِ لاجِهَةَ لَـهُ۔

ترجمہ:- وہ ملک جن کے والی کافر ہوں ان میں جمعہ اور عیدین
جائز ہیں۔ اور مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی بھی فیصلہ
دے گا۔ تو یہ بات قرار یافتہ ہے کہ علت میں سے اگر
کچھ باقی رہے تو حکم باقی رہتا ہے۔ اور ہم نے یہ متفقہ
فیصلہ دیا ہے کہ یہ ملک تا تاریوں کے اس پر غلبہ پا جانے
سے قبل دار الاسلام کے ملکوں میں سے تھا۔ اور
ان کے غالب آجانے کے بعد اذان۔ جمعہ اور جماعتیں
اور شرع کے مطابق حکم اور فتوٰی اور درس و تدریس
عام تھی۔ ان کے بادشاہوں کو اس سے انکار نہیں
تھا۔ لہٰذا تا تاریوں کی سلطنت کے دار الحرب ہونے
کی کوئی وجہ نہیں ۔

(۲) مولانا حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں۔ اور ان کا یہ بیان

اصولی رنگ رکھتا ہے کہ :-

"اگر کسی ملک کا اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو۔ لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی اور دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب (حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث قدس سرہ۔ ناقل) کے نزدیک بلاشبہ دارالاسلام ہو گا۔ اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔ (نقش حیات جلد ۲ صلا)

(۳) مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا فتویٰ ملاحظہ ہو۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"ہندوستان بلاشبہ اُس وقت دارالحرب تھا، جب انگریزی حکومت یہاں اسلامی سلطنت کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مسلمانوں پر فرض تھا کہ یا تو اسلامی سلطنت کی حفاظت میں جانیں لڑاتے یا اس میں ناکام ہونے کے بعد یہاں سے ہجرت کر جاتے لیکن وہ مغلوب ہو گئے اور انگریزی حکومت قائم ہو چکی اور مسلمانوں نے اپنے پرسنل لا بلا (خانگی مذہبی قوانین۔ ناقل)

پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ یہاں رہنا قبول
کرلیا تو اب یہ ملک دار الحرب نہیں"
(سود حصہ اوّل حاشیہ صفحہ ۷۸۔ شائع کردہ مکتبہ جماعت
اسلامی لاہور طبع اوّل)

(۴) مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اہل حدیث۔ انگریزوں کی سلطنت
کے متعلق لکھتے ہیں :-

"سلطانِ روم ایک اسلامی بادشاہ ہے لیکن امن عام
اور حسنِ انتظام کے لحاظ سے (مذہب سے قطع نظر)
برٹش گورنمنٹ ہم مسلمانوں کے لئے کچھ کم فخر کا موجب
نہیں ہے۔ اور خاص کر گروہِ اہلِ حدیث کے لئے تو
یہ سلطنت بلحاظ امن اور آزادی اس وقت کی اسلامی
سلطنتوں سے بڑھ کر فخر کا محل ہے"
(اشاعۃ السنہ جلد ۶ نمبر ۱۰ صفحہ ۲۹۲)

آگے صفحہ ۲۹۳ پر لکھا :-

"اہلِ حدیثِ ہند اس سلطنت کو از بس غنیمت سمجھتے ہیں
اور اس سلطنت کی رعایا ہونے کو اسلامی سلطنتوں کی
رعایا ہونے سے بہتر جانتے ہیں"
(اشاعۃ السنہ جلد ۶ نمبر ۱۰ صفحہ ۲۹۳)

(۵) السیّد علی الحائری شیعہ مجتہد، انگریزوں کے مذہبی آزادی

دینے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"ہر شیعہ کو اس احسان کے عوض میں صمیم قلب سے برٹش حکومت کا رہینِ احسان اور شکر گزار ہونا چاہیئے اور اس کے لئے شرع بھی اس کو مانع نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر اسلام علیہ وعلیٰ آلہ السلام نے نوشیروان عادل کے عہد سلطنت میں ہونے کا ذکر مدح اور فخر کے رنگ میں بیان فرمادیا" (موعظہ تحریفِ قرآن صفحہ ۶۷و۶۸ - شائع کردہ ینگ مین سوسائٹی خواجگانِ نارو وال)

آپ نے اپنی تیسری چٹھی میں لکھا ہے کہ اگر کوئی گورنمنٹ اپنے ملازمین کو جمعہ پڑھنے کی اجازت نہ دے تو وہ مداخلت فی الدین کی مرتکب ہوتی ہے یا نہیں؟

جواباً عرض ہے کہ اگر گورنمنٹ کوئی ایسا قانون بنا دے کہ مسلمان اس کی حکومت میں جمعہ نہیں پڑھ سکتے تو یہ مداخلت فی الدین ہوگی اور اگر ماتحت افسر کسی مسلمان کو جمعہ پڑھنے سے روکتے ہوں تو حکومت کے پاس اپیل کرنی چاہیئے۔ اگر حکومت اپیل نامنظور کرے تو اس کی ملازمت چھوڑ دینی چاہیئے۔ اور کوئی اور کاروبار کرنا چاہیئے۔ کوئی دُور اندیش حکومت اپنے سارے ملازمین کو ناراض نہیں کرسکتی۔

تناقضات کی بحث

ہم نے آپ کی طرف سے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے بیانات میں پیش کردہ آپ کے خیالی تناقضات کے حل کی وجوہ اپنے جواب میں پیش کر کے ان میں باہم تطبیق ثابت کر دی تھی۔ لیکن آپ نے اپنی جرح میں ہم پر یہ الزام قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

"استاد کی تحریروں میں تطبیق کی وجہ کو شاگرد نے اپنے ذہن سے ایجاد کیا ہے"

جنابِ من! یہ آپ کا مفروضہ ہے۔ جس پر عمارت قائم کر کے آپ آگے لکھتے ہیں:۔

"چنانچہ معلوم ہوا کہ بظاہر تناقض کو دُور کرنے کی یا تطبیق کی وجہ خود تحریر کے اندر ہی یا سیاق و سباق میں موجود ہوتی ہے۔ یا کسی ایسی حقیقت میں ہوتی ہے جو سب کو معلوم ہو لیکن حقیقی تناقض میں ایسی کوئی وجہ موجود نہیں ہوتی بلکہ اگر تناقض کو دور کرنا ہو تو تطبیق کی وجہ کو ایجاد کرنا پڑتا ہے"

مکرمی! آپ نے اپنی تحریر میں جو بظاہر تناقض کی مثالیں حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں تو حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے بظاہر تناقض بھی تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ان میں تناقض

سمجھنے کے فعل کو حماقت قرار دیا ہے۔ آپ یہ بات ہرگز نہیں دکھا سکتے کہ ان مثالوں میں حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے بظاہر تناقض تسلیم کیا ہو۔ البتہ جو مثالیں ہم نے قرآن کریم سے اپنے پہلے مضمون میں دی تھیں۔ ان کو ہم اور آپ دونوں بظاہر تناقض کی مثالیں جانتے ہیں۔ اب اس جگہ آپ کی خدمت میں بظاہر تناقض پر مشتمل دو حدیثیں اور دو آیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "لَا عَدْوٰی" جس سے ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام کے نزدیک امراض متعدیہ کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ کیونکہ لا نفی جنس کا "عَدْوٰی" پر داخل ہے۔ پھر ایک دوسری حدیث میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ فِرَارَكَ مِنَ الْاَسَدِ۔ کہ کوڑھی سے اس طرح بھاگ جس طرح تو شیر سے بھاگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جذام میں تعدیہ نہیں تو مجذوم کے پاس جانے سے کیوں روکا گیا۔ اور اس کے پاس جانا کیوں خطرناک قرار دیا گیا ہے؟

اس جگہ سیاق وسباق میں کوئی وجہ تطبیق موجود نہیں۔ نہ عرفِ خاص وجہ تطبیق بن سکتا ہے نہ عرفِ عام۔ کیونکہ طبیب اور ڈاکٹر بھی اور عام لوگ بھی یہی جانتے ہیں۔ کہ امراض متعدیہ بھی ہوتی ہیں۔ پس امراض میں تعدیہ ایک حقیقت عرفیہ عامہ وخاصہ ہے۔ لہذا دونوں حدیثوں میں وجہ تطبیق عقل وفکر سے ہی دریافت کرنا پڑے گی۔

آپ کے بیان کردہ تینوں طریقوں میں سے کسی طریق سے وجہ تطبیق اس جگہ موجود نہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہ لا یغفر ان یُشرک بہٖ ویغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء۔ (النساء ۴۸)

اور دوسری آیت میں آیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعًا (۵۳)

دونوں آیتوں میں تطبیق کی وجہ سوچئے۔ پہلی آیت میں ہے۔ شرک نہیں بخشا جائے گا۔ دوسری میں ہے کہ یقیناً سب گناہ بخش دے گا۔

ہمیں آپ کی اس عبارت پر بھی اعتراض ہے کہ "تناقض کی وجہ یا کسی ایسی حقیقت میں ہوتی ہے جو سب کو معلوم ہو" کیونکہ حقیقت عرفیہ کی خود دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقتِ عرفیہ عامہ۔ دوسری حقیقتِ عرفیہ خاصہ لہٰذا سب کو معلوم ہونے کی قید درست نہیں جس طرح وجہ تطبیق حقیقت عرفیہ عامہ سے اخذ کی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی حقیقت عرفیہ خاصہ سے بھی اخذ کی جا سکتی ہے۔ بلکہ امر معقول سے بھی اخذ کی جا سکتی ہے، ورنہ عقل بے کار ہو جائے گی۔ جس کے استعمال کی خدا تعالٰی نے قرآن کریم میں ہدایت فرمائی ہے۔ پس وجہ تطبیق امور مشہودہ بھی ہو سکتے ہیں خواہ مشہودۂ عوام ہوں خواہ مشہودۂ خواص اور امورِ معقولہ بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کا تعلق قوتِ مدرکہ سے ہے۔ ورنہ عقل بے کار ہو گی اور فلسفہ کی ہر تھیوری بلا وجہ مردود قرار دینا پڑے گی۔ تاوقتیکہ امور معلومہ مشہودہ سے

اس کا ثبوت نہ مل جائے۔ حالانکہ علم کی بنیاد حقائق مدرکہ معقولہ پر ہوتی ہے اور یا الہامی منقولات پر۔ آپ نے خود بھی آگے چل کر لکھا ہے قرآن مجید میں بھی عقل سے کام نہ لینے والوں کو حیوانوں سے بدتر قرار دیا گیا ہے :۔

پس ہمارے جوابات میں جو وجوہ تطبیق بیان کی گئی ہیں۔ وہ مندرجہ بالا اُمور کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں۔ اگر ذہن ایک وجہ معلوم کرے۔ اور وہ وجہ معقول معلوم ہو تو محض یہ کہکر اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ کہ یہ ذہنی ایجاد ہے۔ تفصیلی جواب انشاء اللہ آگے آئے گا۔ یہاں پر ہم نے آپ کو اجمالی طور پر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری پیش کردہ وجوہ اس احاطہ سے باہر نہیں جو ہم نے بیان کیا ہے۔

مکرمی! آپ نے اس موقعہ پر بہانہ بنا کر آریوں کی حمایت کی کوشش کی ہے۔ تا ایک نیا اعتراض حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ پر کر سکیں حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے آریوں پر حجتِ ملزمہ قائم کرنے کے لئے کہ وید میں تناقض ہے "چشمۂ معرفت" صفحہ ۲۹ پر یہ لکھا تھا:۔

"پھر آریہ صاحبوں کی طرف سے جو مضمون سنایا گیا۔ اس میں ایک یہ بھی فقرہ تھا کہ پرماتما یعنی پرمیشر سب میں ہے جاہلوں سے دور عقلمندوں سے نزدیک"۔

اس پر حضور نے لکھا:۔

"اس عبارت میں جو تناقض ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک ہی فقرہ میں تو وید کی تعلیم یہ بیان کرتی ہے کہ پرماتما سب میں ہے۔ لیکن دوسرے فقرہ میں یہ بیان ہے کہ وہ جاہلوں سے دُور ہے۔"

جناب من! آپ اس جگہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سارے بیان کو نظرانداز کرتے ہوئے آریوں کی حمایت میں کمربستہ ہو کر یہ لکھ رہے ہیں:۔

"لیکن اگر کوئی آریہ صاحب یہ کہیں مرزا صاحب بات تو خود نہیں سمجھے۔ لیکن جھوٹے الزام لگا دیئے وید پر۔ وید میں جو بات کہی گئی ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ خدا (پرمیشور) سب میں ہے۔ اپنی قدرت کاملہ سے ہر جگہ موجود ہونے کی صفت کے اعتبار سے اور وہ عقلمندوں سے نزدیک ہے علم و عقل کو پسند کرنے کے اعتبار سے اور جاہلوں سے دور ہے جہالت کو ناپسند کرنے کے اعتبار سے۔ قرآن مجید میں بھی عقل سے کام نہ لینے والوں کو حیوانوں سے بدتر قرار دیا گیا ہے میرا آپ سے سوال ہے کہ آریہ صاحب کی وضاحت کے بعد بھی وید کے بیان میں تناقض رہ گیا ہے یا نہیں جبکہ اعتبار مختلف ہو گئے اگر تناقض دُور ہو گیا ہے۔ اور یقیناً دُور ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ مرزا صاحب نے وید کے اس بیان پر تناقض کا جھوٹا الزام لگا ہے۔"

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی طرف سے تناقض کے بارے میں آریوں کے بیان کی رُو سے وید پر یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ چنانچہ آپ آگے فرماتے ہیں:-

"چونکہ بموجب اصول آریہ سماج کے کوئی روح یا کوئی اجسام کا ذرہ پرمیشر کا بنایا ہُوا نہیں اور پرمیشر کو قرب مخلوق کا وہ موقعہ بھی نہیں ملا۔ جو بنانے والے کو اس چیز کے لئے ضروری ہوتا ہے جس کو وہ بناتا ہے۔ تو پھر کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ پرماتما سب میں ہے۔ جبکہ اس کو قدیم اور انادی چیزوں سے کچھ بھی تعلق نہیں اور نہ پرمیشر اُن کے اندر جا کر ان کی قوتوں کو اصل تعداد سے بڑھا سکتا ہے۔ اور نہ اصل تعداد سے گھٹا سکتا ہے۔ تو اس بداخلت بیجا کے کیا معنے ہوئے کہ پرماتما سب میں ہے۔ ہر ایک شخص سوچ سکتا ہے کہ محض فضول طور پر پرمیشر کا اندر ہونا سراسر ایک لغو حرکت ہے۔ جس سے اگر ثابت ہوتا ہے تو بس یہی کہ پرمیشر نے مخلوق کے اندر داخل ہو کر اپنا محدود ہونا ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ جو چیز کسی محدود چیز کے اندر سما سکتی ہے۔ وہ بھی بلاشبہ محدود ہے۔ آریہ صاحبوں کی یہ عجیب عقل ہے۔ کہ ایک طرف تو خدا تعالےٰ کے عرش پر ہونے کے معنوں کو نہ سمجھ کر محض جہالت سے یہ اعتراض

پیش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا محدود اور عرش کا محتاج ہے۔ اور دوسری طرف خود اپنے پرمیشر کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ وہ تمام مخلوق چیزوں کے اندر ہے۔ اور جبکہ وہ تمام چیزوں کے اندر ہے تو کیا وہ اُن بتوں اور مورتیوں کے اندر نہیں ہے۔ جن کی بُت پرست لوگ پرستش کرتے ہیں۔ ...... پھر اس جگہ یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ اگر پرمیشر ہر ایک چیز میں پورے طور پر یعنی بتمام و کمال اندر ہے تو اس سے تعدد لازم آتا ہے یعنی ایک پرمیشر نہیں بلکہ کروڑہا پرمیشر ہو گئے۔ اور اگر پورے طور پر کسی کے اندر نہیں تو اس سے پرمیشر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ اور دونو امر باطل ہیں" (چشمہ معرفت ص ۲۹-۳۰)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے آریہ سماج کے مسلّمہ اصول کی بناء پر ویدوں پر الزامی رنگ میں تناقض پائے جانے کا اعتراض کیا ہے مگر ہمارے محترم مناظر کج بحثی سے کام لیتے ہوئے بلا وجہ آریوں کی حمایت میں کمربستہ ہو کر وید کے بیان کو سچا اور تناقض سے مبرّا ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ اور مسیح موعود علیہ السلام کے اس بیان کو آریوں پر جھوٹا الزام قرار دیتے ہیں۔

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے ست
گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است

مشرکین نے یہودیوں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہودیوں کے متعلق کہا تھا۔ هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا افسوس ہے کہ آپ بھی اسی روش پر چل نکلے۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔

حقیقت یہ ہے کہ آریوں کے اصول کی روشنی میں یہ دونوں فقرے متناقض ہیں۔ اور اپنے اصول کو پیش نظر رکھکر آریہ اس میں تطبیق نہیں دے سکتے۔ مگر ہمارے معترض صاحب ان کے اصول کو نظرانداز کر کے اُن کے دونوں فقروں میں تطبیق دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

پھر اس بہانے سے کہ ہم نے وجوہِ تطبیق ایجاد کی ہیں۔ آپ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ پر بھی وجہِ تطبیق ایجاد کرنے کا الزام قائم کرنا چاہتے ہیں

مکرمی! آپ لکھتے ہیں۔

"مرزا صاحب نے جو کلام بقول اُن کے اُن پر نازل ہوا تھا اور جو براہین احمدیہ میں درج ہے۔ اپنے آپ کو فارسی الاصل ٹھہرایا۔ پھر الشیخ محی الدین ابن العربی علیہ الرحمۃ کی ایک پیشگوئی کو جو تریاق القلوب میں درج ہے۔ اور جس میں یہ الفاظ ہیں کہ "وہ لڑکا چین میں پیدا ہوگا۔ اور اس کی بولی چینی ہوگی" کو پہلے یوں لکھا کہ شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ وہ چینی الاصل ہوگا" (حقیقۃ الوحی ۲۰۰ طبع اوّل)

یعنی چین میں پیدا ہونے اور چینی زبان بولنے کے الفاظ حذف کئے پھر اپنے آپ کو اس پیشگوئی کا مصداق ثابت کرنے کے لئے اپنے آپ کو چینی الاصل ٹھہرایا۔ لیکن جب مرزا صاحب کو یاد آیا[عہ] ۔ (یا کسی نے یاد دلایا) کہ وہ اپنے آپ کو پہلے فارسی الاصل قرار دے چکے ہیں اس لئے اب چینی الاصل نہیں ہو سکتے تو اس تناقض کو دور کرنے کے لئے مرزا صاحب نے ایک وجہ بیان کی اور لکھا کہ :۔

عہ :۔ جب مرزا صاحب کو یاد آیا یا کسی نے یاد دلایا الخ کے الفاظ درست نہیں کیونکہ حقیقۃ الوحی ص۲۰۱ پر ہی جس کا معترض صاحب نے حوالہ دیا ہے آپ نے اپنے فارسی الاصل ہونے کا ذکر بھی کر دیا ہوا تھا۔ آپ تحریر فرماتے ہیں اور شیخ محی الدین ابن عربی کی اسی پیشگوئی پر حاشیہ دیکر تحریر فرماتے ہیں :۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ اس کے خاندان میں ترک کا خون ملا ہوا ہوگا۔ ہمارا خاندان جو اپنی شہرت کے لحاظ سے مغلیہ خاندان کہلاتا ہے اس پیشگوئی کا مصداق ہے کیونکہ اگرچہ سچ وہی ہے کہ جو خدا نے فرمایا کہ یہ خاندان فارسی الاصل ہے مگر یہ یقینی اور مشہود و محسوس ہے کہ اکثر مائیں اور دادیاں ہماری مغلیہ خاندان سے ہیں اور وہ چینی الاصل ہیں یعنی چین کی رہنے والی "۔ حقیقۃ الوحی حاشیہ ص۲۰۱۔ پس فارسی الاصل آپ حقیقی اور چینی الاصل ماؤں دادیوں کی نسبت سے ہیں۔ اور حقیقۃ الوحی میں آپ نے دونوں باتوں میں تطبیق دیدی ہوئی ہے۔ فتدبر۔

"اس تناقض کا جواب یہ ہے۔ کہ اسلام شائع ہونے کے بعد
بہت سے مسلمان چین میں جا آباد ہوئے تھے۔ اور ان کی
تاثیر وعظ سے کئی کروڑ چینی مسلمان ہو گیا تھا اسی وجہ سے
اب بھی چین میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ سو ممکن ہے
(یاد رکھئے کہ صرف ممکن ہی ہے کوئی یقینی بات نہیں) کہ
بعض فارسی بھی وہاں جا کر آباد ہو گئے ہوں۔ پھر اس وجہ
سے چینی کہلانا (جا کر آباد ہونے والوں کے لئے یا مرزا
صاحب کے لئے) ایک لازمی امر تھا۔ جیسا کہ بہت سے
عرب جو ابتدا میں ہندوستان آئے اب ہندی کہلاتے
ہیں۔ چنانچہ تمام سادات اور قریش اسی قسم کے ہیں لہٰذا
اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ جیسا کہ بظاہر سمجھا جاتا ہے ہمارا
خاندان مغلیہ خاندان مشہور ہے جو بلاشبہ چینی الاصل
ہے لیکن جو کچھ خدا نے ظاہر فرمایا وہ بلاشبہ صحیح ہے۔"
(چشمۂ معرفت ص۳۳۱ حاشیہ ج)

جنابِ من! اس سے آپ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے
اپنے چینی الاصل ہونے کی جو وجہ بیان کی ہوئی ہے وہ ایجاد شدہ ہے۔
اور حقیقت کے خلاف ہے اور وہ بھی ممکن کی حد تک کہ کچھ مسلمان چین میں
جا آباد ہوئے ان کی وجہ سے چینی الاصل بن گئے۔

جنابِ من! اس کے بعد، اس وجہ کو از راہِ تضحیک آپ نے ایسا

نسخہ بنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ہر ایک شخص، ہر ایک ملک کا اصلی باشندہ قرار پا جاتا ہے۔ اس نسخے کے حساب سے کوئی ہندی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں جاپانی الاصل ہوں۔ کیونکہ ہندوستان سے کچھ لوگ جا کر جاپان میں آباد ہو گئے ہیں الخ۔

مکرمی! ہم نے آپ کے اصل الفاظ کا ضروری حصّہ نقل کر دیا ہے جس میں آپ نے حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ پر بددیانتی کا الزام بھی دیا ہے اور وجہ ایجاد کرنے کا بھی۔ بددیانتی کا الزام یوں دیا ہے کہ آپ لکھتے ہیں

"پہلے تو یہ لکھا کہ شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ وہ چینی الاصل ہو گا۔" (حقیقۃ الوحی صلا۲۰۱)

یعنی چین میں پیدا ہونے اور چینی زبان بولنے کے الفاظ حذف کئے۔"

مگر جنابِ من! حقیقت یہ ہے کہ شیخ ابن عربی کی یہ پیشگوئی حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے تریاق القلوب میں پوری کی پوری درج کر دی ہوئی ہے۔ اس میں شیخ کے پورے الفاظ یوں درج ہیں:۔

" وعلی قدم شیثٍ یکون اٰخِرُ مولُودٍ یُولدُ من ھذا النوع الانسانی وھو حاملُ اَسْرَارِہٖ وَلَیسَ بعدہٗ ولدٌ فی ھٰذا النوع فَھُوَ خَاتَمُ الاولادِ۔ وتُولدُ معہٗ اُختٌ لہٗ فَتَخْرُجُ قبلہٗ ویَخْرُجُ بَعْدَھَا۔ یکون رأسُہٗ عند رِجلَیْھَا ویکون مَولِدُہٗ بالصین

وَلُغَتُہٗ لُغَۃُ بَلَدِہٖ وَیَکْثُرُ الْعُقْمُ فِی الرِّجَالِ
وَیَکْثُرُ النِّکَاحُ مِنْ غَیْرِ وِلَادَۃٍ وَیَدْعُوْھُمْ
اِلَی اللّٰہِ وَلَا یُجَابُ۔ (تریاق القلوب ص۱۵۹
(روحانی خزائن جلد ۱۵ ص۴۸۲)

حضرت محی الدین ابنِ عربی کی یہ پیشگوئی کسی کشف پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ اس پیشگوئی کو حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے پورے کا پورا تریاق القلوب میں نقل فرمایا ہے۔ اور اصل پیشگوئی میں سے ایک لفظ بھی حذف نہیں کیا۔ کہ آپ پر بد دیانتی کا الزام عائد ہو سکے۔ ہاں اس پیشگوئی کو من وعن درج کرنے کے بعد آگے آپ نے اس کا تشریحی ترجمہ لکھا ہے:۔

"یعنی کامل انسانوں میں سے آخری کامل ایک لڑکا ہوگا جو اصل مولد اس کا چین ہوگا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ قوم مغل اور ترک میں سے ہوگا۔ اور ضروری ہے کہ عجم میں سے ہوگا نہ کہ عرب میں سے۔ اور اس کو وہ علوم اور اسرار دیئے جائیں گے جو شیث کو دیئے گئے تھے اور اس کے بعد کوئی اور ولد نہ ہوگا۔ اور وہ خاتم الاولاد ہوگا۔ یعنی اس کی وفات کے بعد کوئی کامل بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ اور اس فقرہ کے یہ بھی معنی ہیں کہ وہ اپنے باپ کا آخری فرزند ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ایک

لڑکی پیدا ہوگی ،جو اس سے پہلے نکلے گی اور وہ اس کے بعد نکلے گا۔ اس کا سر اس دختر کے پیروں سے ملا ہوا ہوگا۔ یعنی دختر معمولی طریق سے پیدا ہوگی کہ پہلے سر نکلے گا اور پھر پیر اور اس کے پیروں کے بعد بلا توقف اس پسر کا سر نکلے گا۔ (جیسا کہ میری ولادت اور میری توام ہمشیرہ کی اسی طرح ظہور میں آئی)

"پھر بقیہ ترجمہ شیخ کی عبارت کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں میں بانجھ پن کا عارضہ سرایت کریگا نکاح بہت ہوگا۔ یعنی لوگ مباشرت کریں گے مگر کوئی صالح بندہ نہیں ہوگا۔ اور وہ زمانہ کے لوگوں کو خدا کی طرف بلائے گا، مگر وہ قبول نہیں کریں گے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ کے الفاظ یہ ہیں "مَوْلِدُہٗ بِالصِّیْن" اگر مولد کو حقیقی معنوں میں لیا جائے تو پھر اس لڑکے کو جس کا پیشگوئی میں ذکر ہے چین کے اندر پیدا ہونا چاہیئے۔ چونکہ مصداق اس پیشگوئی کا آپ اپنے آپ کو سمجھ رہے تھے اور امر واقعہ یہ ہے کہ آپ چین میں پیدا نہیں ہوئے تھے اس لئے ان الفاظ کو آپ نے تاویلاً قبول فرمایا ہے کہ اصل مولد اس لڑکے کا یعنی اس کی امہات میں سے بعض کا۔ ناقل) چین ہوگا۔ اور اسی مضمون کو حقیقۃ الوحی ص ۲۰۱ کے حاشیہ میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ :۔

"اگرچہ سچ وہی ہے جو خدا نے فرمایا کہ یہ خاندان فارسی الاصل ہے مگر یہ تو یقینی اور مشہود و محسوس ہے کہ اکثر مائیں اور دادیاں ہماری مغلیہ خاندان سے ہیں اور وہ صینی الاصل ہیں یعنی چین کی رہنے والی ہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ امہات کی نسبت سے آپ امکانی صینی الاصل نہیں بلکہ ضروری صینی الاصل ہیں۔ کیونکہ اس طرح سے آپ کا صینی الاصل ہونا محسوس و مشہود ہونے کے لحاظ سے یقینی ہے۔ ہاں چشمۂ معرفت میں ایک امکانی پہلو بھی صینی الاصل ہونے کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ آپ کے بعض آباء بھی چین میں رہے ہوں۔ تبھی تو ان چینی خواتین سے ازدواجی تعلق قائم ہوا۔ اور یہ امکان محض عقلی نہیں بلکہ عادت کا متقاضی ہے۔ پس ماؤں اور دادیوں کی نسبت سے آپ ضروری طور پر صینی الاصل ہیں۔ اور آباء کے لحاظ سے امکانی طور پر۔ بہر حال آپ کے فارسی الاصل ہونے میں اور صینی الاصل ہونے میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔ ہاں چونکہ درحقیقت آپ فارسی الاصل تھے، اس لئے صینی الاصل آپ من وجہ ہی ہو سکتے تھے سو بعض امہات کی نسبت کے لحاظ سے آپ کا من وجہ صینی الاصل ہونا ضروری امر ہوا نہ کہ امکانی۔ کیونکہ یہ امر تو مشہود و محسوس ہونے کی وجہ سے یقینی ہے البتہ آپ کے آباء میں سے بعض کے چین میں رہنے کا قوی امکان تھا۔ اس لئے "چشمۂ معرفت" میں آپ نے اس امکان کا بھی ذکر فرما دیا ہے کہ

اسلام شائع ہونے کے بعد بہت سے مسلمان چین میں جا کر آباد ہوئے
اور ان کی تاثیر وعظ سے کئی کروڑ چینی مسلمان ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے
اب بھی چین میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ سو ممکن ہے (یعنی
بلحاظ امکانی عادی۔ ناقل) بعض فارسی بھی (یعنی آپ کے آباد میں
سے بعض کیونکہ دلیل امکانی آباد کے وہاں آباد ہونے سے ہی بنتی
ہے۔ ناقل) وہاں جا کر آباد ہو گئے ہوں پھر اسی وجہ سے (ان کے
لئے۔ ناقل) چینی کہلانا ایک لازمی امر تھا" اس طرح آپ آباد کی نسبت
سے بھی امکانی طور پر چینی الاصل قرار پاتے ہیں۔ پس اس اپنے
بیان کے ذریعہ آپ نے آباد کی نسبت سے بھی فارسی الاصل ہونے
اور چینی الاصل کے بظاہر تناقض کا حل پیش فرما دیا ہے۔ جب یہ ثابت
شدہ حقیقت ہے کہ آپ کی بعض امہات چینی تھیں تو پھر تو آپ کے آباد
میں سے بعض ایرانیوں کا چین میں جانا اور وہاں بود و باش اختیار
کرلینا اور ازدواجی تعلق قائم کرلینا ایک قومی امکان رکھتا ہے اور
ایسا امکان بھی ایک بہت بڑی وجہ ثبوت کا کام دیتا ہے اور مسلمانوں
کا چین میں جانا اور وہاں تبلیغ اور وعظ و نصیحت کرنا ایک ایسا یقینی
امر ہے جس کے ثبوت کے لئے چھ کروڑ مسلمان وہاں موجود ہیں۔ پس
آپ کے ایرانی آباء میں سے اگر بعض کے چین میں جا کر آباد ہو جانے کا
تاریخی ثبوت مل جائے تو پھر شیخ محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ کی یہ پیشگوئی
آباد کی نسبت سے بھی قطعی اور حتمی طور پر آپ کے لئے ہی ہوگی جیسا کہ

یہ اقسامات کی نسبت سے قطعی اور حتمی طور پر آپ کے لئے ہے۔ اگر امکان عقلی سے استدلال جائز نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ نہ فرماتا۔ اَفَإِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا قتل کیا جانا تو ممتنع بالغیر تھا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمادیا ہوا تھا وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ لیکن پھر خدا تعالیٰ نے دلیل کے لئے اسے ممکن بھی قرار دیا ہے۔ پس جب فرض محال سے استدلال جائز ہے۔ تو فرض ممکن سے بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ جبکہ وہ فرض ممکن امکان قوی بھی رکھتا ہے۔ ماسوا اس کے فصوص الحکم کے شارحین میں سے الشیخ داؤد بن محمود القیصری اپنی کتاب مَطْلَعُ خُصُوصِ الْكَلِمْ فی معانی فصوص الحِکم کی شرح میں حضرت شیخ محی الدین ابن العربی کی یہ پیشگوئی درج کرنے کے بعد" مَولِدُہٗ بالصین" کی تشریح میں صفحہ پر لکھتے ہیں :-

والمرادُ بالصین، اَلْعَجَمُ، كَمَا قَالَ فِی الْعَنْقَاءِ الْمَغْرِب وھو اَیْ الخاتم مِن العجم لامِن العَرَبِ۔

یعنی مراد صین کے لفظ سے عجم ہے۔ جیسا کہ شیخ محی الدین ابن العربی نے اپنی کتاب العنقاء المغرب میں لکھا ہے۔ کہ وہ یعنی خاتم الاولاد" بقول شیخ اکبر بھی عجم میں سے ہے نہ عرب میں سے اور فصوص الحکم

کے ایک دوسرے شارح نے اس مقام پر حدیث نبوی اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّینِ (الحدیث) میں بھی چین سے مراد دور کا علاقہ لیا ہے پس اس لحاظ سے مَوْلِدُہٗ بالصین کے معنے ہوں گے مَوْلِدُہٗ بالعجم اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گورداسپور کا ضلع اور قادیان کی بستی ایک عجمی ضلع اور عجمی بستی ہے۔ اور یَتَکَلَّمُ بِلُغَۃِ بَلَدِہٖ کے معنی اس صورت میں یہ ہوں گے کہ وہ پنجابی بولی بولے گا جو اس شہر کی بولی ہے۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے بھی "العنقاءُ المغرب" کو ملحوظ رکھتے ہوئے "تریاق القلوب" میں مَوْلِدُہٗ بالصین سے یہ بھی مراد لی ہے کہ یہ آخری مولود عجمی ہوگا نہ کہ عربی۔

یاقوت بن عبداللہ الحموی والرومی اپنی کتاب "مُعجم البلدان" ص۲۲۱ الجزء الخامس میں زیرِ لفظ "صین" لکھتے ہیں:-

"سِرْتُ من مُدُنِ السواحل اِلَی الْمُلْتَان وَھِیَ اٰخِرُ مُدُنِ الْھِنْدِ مِمَّا یلی الصین۔"

یعنی میں ساحلی شہروں سے چل کر ملتان پہنچا۔ اور وہ ہندوستان کے آخری شہروں میں سے ہے جو چین سے ملتا ہے۔

اس بیان کی رو سے پنجاب کا علاقہ پرانے زمانہ میں ہند کی سرحد ملتان تک چین سمجھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا

مولد شیخ ابن عربی کے زمانہ کی تاریخ کے لحاظ سے چین کا علاقہ قرار پایا۔ فتدبّر!

---

(۴) احکام القرآن کی تعداد

احکام القرآن کی تعداد، حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے پانچ سو کے قریب بھی بتائی۔ چھ سو بھی، اور سات سو بھی۔ اس بیان میں بظاہر جو اختلاف ہے وہ تضاد و تناقض کی حد تک نہیں پہنچتا۔ کیونکہ سات سو احکام جو بیان ہوئے وہ پانچ سو اور چھ سو پر بھی مشتمل ہیں۔ اور متناقضہ اور متضادہ امور کا تو باہم اجتماع محال ہوتا ہے۔ پس ان بیانات میں تناقض موجود ہی نہیں۔ اور نہ تضاد پایا جاتا ہے۔ البتہ بظاہر جو اختلاف نظر آتا ہے۔ جیسا کہ آیت قرآنیہ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ اور تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ میں ہے۔ یا جیسا کہ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ میں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ میں جو اختلاف ہے وہ بھی تناقض پر منتج قرار پائیگا تاوقتیکہ آپ کی طرف سے اس کی معقول توجیہ نہ ہو جائے۔ جنابِ من! ہم نے علماءِ امّت کے اقوال اور فقہی وجوہ سے جو امور معروضہ ہیں، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بیانات میں تطبیق دکھائی ہے۔ مگر

آپ ہماری ان وجوہ کو ہمارے ذہن کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جب
وجوہ امور معروفہ فقہی سے اخذ کی گئی ہیں۔ تو آپ کو وجوہ مطابقت کو
ہماری ایجاد قرار نہیں دینا چاہیئے۔ مگر چونکہ آپ ضرور کچھ نہ کچھ بولنا
چاہتے ہیں اور اپنے اعتراض کو قائم دکھانا چاہتے ہیں اس لئے ہماری
وجوہ کو آپ نے ایجاد قرار دے دیا ہے۔ آخر کیوں؟ کیا ہم نے امام
غزالی اور امام رازی وغیرہم علماء امت کے قول سے آپ کو یہ نہیں
دکھا دیا تھا کہ ان بزرگوں کے نزدیک آیات الاحکام پانچ سو ہیں اور
پھر ہم نے امام بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی کی کتاب "البرھان
فی علوم القرآن" سے اس کی توجیہہ بھی دکھا دی تھی جو "لعل
مرادھم المصرح بہ" کے الفاظ میں بیان کی گئی تھی۔ اور مصرح بہ
احکام وہی ہوتے ہیں جو عبارۃ النص سے ماخوذ ہوں۔ کیونکہ عبارۃ النص
ہی ما سیق الکلام لأجلھا کا مصداق ہوتی ہے۔ دلالۃ النص اور
اشارۃ النص اور اقتضاء النص سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں۔
یا متشابہات کو محکمات کے تابع کرنے سے جو احکام مستنبط ہوتے
ہیں ان کی تعداد تو بہر حال پانچ سو سے زیادہ ماننی پڑے گی۔ اسی لئے
البرھان فی علوم القرآن میں لکھا گیا ہے۔ فان آیات القصص
والامثال وغیرھا یستنبط منھا کثیر من الاحکام۔ پس
ان بزرگوں کے نزدیک بھی مصرح احکام پانچ سو ہوئے اور غیر مصرح کی
انہوں نے کوئی حد بست نہیں کی۔ پس قرآن کے چھ سو احکام یا سات سو

احکام قرار دینا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ احکام عبارۃ النص سے مستنبط نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ بات ہم نے چونکہ علماء کے اقوال سے استنباط کی ہے کہ وہ غیر مصرح احکام کو بہت سے قرار دیتے ہیں۔ اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا آخری قول جس میں احکام القرآن سات سو بتائے گئے ہیں اصولی و فروعی دونو قسم کے احکام پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ اس آخری قول میں آپ فرماتے ہیں:۔

"میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص قرآن کے سات سو احکام میں سے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی ٹالتا ہے وہ نجات کا دروازہ اپنے ہاتھ سے اپنے پر بند کرتا ہے"

اس میں "ایک چھوٹے سے حکم کو بھی ٹالتا ہے"۔ کا فقرہ اس بات پر روشن دلیل ہے۔ کہ آپ کے نزدیک قرآن کے سات سو احکام جن پر نجات کے لئے عمل کرنا چاہیئے۔ بڑے حکموں پر بھی مشتمل ہیں اور چھوٹے حکموں پر بھی۔ اس لئے ہم نے لکھا تھا کہ مراد اس سے اصول و فروع پر مشتمل احکام ہیں۔ مگر آپ ہماری بات کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ اور اعتراض برائے اعتراض کی روش پر گامزن رہنا چاہتے ہیں۔ ورنہ آپ کی زبان اعتراض کے لئے نہ کھلتی۔ آخر "ارسلناہُ الی مائۃ الف او یزیدون" میں صریح اختلاف موجود ہے اور لفظوں میں اور سیاق میں کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ جو موجب تطبیق ہو۔ لہذا تطبیق

کے لیئے اس جگہ اسی امر معروف کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ ایک لاکھ سے
زیادہ کا عدد ایک لاکھ پر ضرور مشتمل ہے۔ اور مائۃ الف او
یزیدون میں کوئی تناقض موجود نہیں۔ ہاں ایسا اختلاف ضرور موجود
ہے جو اس کے خدا کا کلام ہونے میں حارج نہیں۔ کیونکہ اس میں اختلاف
کثیر یعنی تناقض نہیں۔ اس معمولی اختلاف کی کوئی حکمت ضرور ہے
جسے بہت سے فکر و نظر کے بعد ہی تسلی بخش صورت میں پیش کیا جا سکتا
ہے۔ افسوس ہے کہ آپ تو ایک دن کے ایک ہزار سال کا ہونے
اور پچاس ہزار سال کا ہونے کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی تسلی
بخش توجیہہ پیش نہیں کر سکے آپ نے انّ یوماً عند ربّک کالف
سَنَۃٍ میں یوم سے مراد ٹائم اور پیریڈ تو ٹھیک لیا ہے۔ کیونکہ جب
یوم ہزار سال یا پچاس ہزار سال کا ہو تو مراد اس سے ٹائم اور
پیریڈ ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ چوبیس گھنٹے کا دن رات۔ مگر خدا کے
ہاں ہزار سال کا ایک دن اور پچاس ہزار کا ایک دن میں جو اختلاف
ہے۔ اس میں پہلی آیت کے متعلق یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ
کے قرینہ سے آپ یہ لکھتے ہیں :-

"یہ کافر لوگ، عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔
یہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے ضرور پورا ہو کر رہے گا لیکن
یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے
عذاب اپنے وقت سے پہلے آجائے۔"

آپ کے اس بیان سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ موعود عذاب کے ایک ہزار سال سے بعد آنے کا وعدہ بتا رہے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وعدہ تو کافر لوگوں سے یہ تھا کہ عذاب ایک ہزار سال کے بعد آئے گا۔ پھر عذاب ان کافروں پر جنگوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیوں آگیا۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے وقاتلوهم يعذبهم الله بأيديكم اس خلجان کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ کیا یہ عذاب موعود نہ تھا؟؟

(ب) کیا یہ ان کافروں کی زندگی میں نہیں آگیا تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔

(ج) کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس عذاب کا آنا کافروں پر جلد عذاب کا آجانا نہیں تھا؟ پھر ہزار سال پر موعود عذاب کو کیوں ڈالا گیا؟؟ جبکہ بدر کی لڑائی میں ہی مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کافروں پر عذاب نازل ہو گیا۔ اور ہزار سال تو ان کافروں نے زندہ ہی نہیں رہنا تھا۔ پھر ہزار سال گذر جانے پر ان سے وعدہ عذاب کیسے پورا ہو گا؟

واضح رہے کہ ان يوما عند ربك كالف سنة کی آیت سورۃ حج میں آئی ہے۔ اور سورۃ حج کی پہلی آیت میں ہی ایک عذاب کا ذکر ان الفاظ میں ہے:۔

ان زلزلة الساعة شئ عظيم۔ کہ زلزلۃ الساعۃ سے

مراد قیامتِ کبریٰ کا زلزلہ ہی ہے؟ اور اگر قیامتِ کبریٰ کا زلزلہ ہے اور اسی عذاب کو وہ جلدی سے مانگ رہے تھے جس کا ذکر یستعجلونک بالعذاب کے الفاظ میں ہے تو کیا ایک ہزار سال بعد قیامت آگئی؟ اگر آپ کے نزدیک قیامت آگئی ہے تو وہ کیا ہے؟ اور اگر نہیں آئی تو پھر ہزار سال کا شمار کس سن سے ہے؟ پھر عجیب بات ہے، کہ پچاس ہزار سال کے دن کا ذکر سورۃ المعارج میں ہے۔ اور اس کا آغاز بھی سأل سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہٗ دافعٌ من اللہ ذی المعارج کے الفاظ سے ہوا ہے۔ گویا یہاں بھی عذاب کا ہی سوال ہے۔ اور عذاب بھی موجود معلوم ہوتا ہے۔ مگر آگے فرما دیا ہے تعرجُ الملٰئکۃُ والرُّوحُ الیہ فی یومٍ کان مقدارہٗ خمسین الف سنۃ فاصبر صبرًا جمیلاً ۔ انّھم یرونہٗ بعیدًا ونرٰہُ قریبًا ۔ اگر یہ عذاب بھی قیامتِ کبریٰ کا ہے تو دونوں آیتوں میں تناقض پیدا ہو جائے گا۔ وجہ تطبیق تو آپ نے کوئی پیش نہیں کی۔ آپ تو کوئی وجہ ایجاد بھی نہیں کر سکے۔

جنابِ من! اعتراض کرنا بڑا آسان ہے مگر جواب دینا حکمت کو چاہتا ہے۔ اور حکمت امور مدرکہ کا بھی نام ہے۔ اور امور مدرکہ معقولات میں سے ہوتے ہیں۔ پس آپ ان دونوں آیتوں کے لئے وجہ تطبیق ہرگز پیش نہیں کر سکے۔ حالانکہ یہ خدا کا کلام ہے۔ جو تضاد و تناقض سے پاک ہے۔ اس موقع پر ہم نے اگر کوئی وجہ تطبیق پیش کی تو آپ مانیں گے

نہیں۔ اور اسے ہماری ذہنی ایجاد قرار دیں گے۔ اس لئے آپ کے سامنے ان دو نو آیتوں کے متعلق اپنی توجیہ پیش کرنا ہم ضیاعِ وقت کا موجب سمجھتے ہیں۔ جہاں بات کی قدر نہ ہو اور فقس الجھن پر الجھن پیدا کرنا چاہتا ہو وہاں تو بحث ہی بیکار ہے۔ آپ کو حضرت مرزا صاحب کی کتابیں پڑھنے سے الجھن پر الجھن پیدا ہو رہی ہے اور پنڈت دیا نند جی اور پادری عماد الدین وغیرہ کو قرآن مجید پڑھنے پر الجھن پر الجھن پیدا ہو رہی تھی۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کی طرح آپ بھی غلط لائن پر چل پڑے ہیں۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی

کیں راہ کہ تو مے روی بترکستان است۔

پس حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اپنے بیان میں احکام القرآن کا جو آخری عدد بیان فرمایا ہے۔ وہ سات سو کا ہے۔ چونکہ یہ پانچسو اور چھ سو احکام پر بھی مشتمل ہے۔ لہذا پانچسو اور چھ سو کا عدد احکام القرآن اس کے متناقض اور متضاد نہیں۔ اور سات سو کا عدد قیاسی بھی نہیں بلکہ شمار کردہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی سے پہلے چھ سو احکام کا ذکر قیاسی تھا۔ جیسے جبرائیل کے چھ سو پروں سے قیاس کیا گیا۔ اگر یہ قیاس درست نہیں تو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی ماموریت میں خارج بھی نہیں کیونکہ اصول کی کتابوں میں یہ مسلّم ہے کہ

انّ النّبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قد یجتھد

فیکون خطأً کما ذکرہ الاصولیّون وکان
النّبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُشاور الصحابۃ
فیما لَمْ یُوحٰی الیہ وھم یُراجعونہٗ فی
ذٰلک . . . . . . وفی الحدیث ما حدثتکم
عن اللّٰہ سبحانہ فھو حقٌ - وما قلت فیہ
من قبل نفسی فانّما اَنا بَشَرٌ اُخطئُ واُصیبُ
(نبراس شرح الشرح لعقائد النّسفی صـ ۳۹۲)

ترجمہ :- بے شک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کبھی اجتہاد فرماتے - تو اس میں غلطی واقع ہو جاتی جیسا کہ اصولیّوں نے بیان کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے امور میں جن میں وحی نازل نہ ہوئی ہو صحابہ سے مشورہ لے لیتے تھے اور صحابہ اس بارے میں آپ سے مراجعت بھی کر لیتے . . . . . . اور حدیث نبوی میں ہے جو کچھ مَیں تمہیں اللہ سبحانہٗ کی طرف سے بتاؤں وہ تو سچ ہے - اور جو اس بارے میں اپنی طرف سے کہوں تو مَیں بھی تو صرف انسان ہوں غلطی بھی کر سکتا ہوں - اور درست بات بھی کہہ سکتا ہوں -

یہ امر بھی آپ کے سوچنے کے قابل ہے کہ ایک صحیح حدیث میں وارد ہے کہ باجماعت نماز کا ثواب اکیلے کی نماز سے پچیس گنا زیادہ ہے - اور ایک دوسری صحیح حدیث میں ستائیس گنا زیادہ ثواب بیان ہوا ہے - دونوں میں اختلاف ظاہر ہے - مگر تضاد و تناقض نہیں کیونکہ

جب ، ۷ گنا ثواب مل سکتا ہے تو ۲۵ گنا ضرور ملے گا۔ پس ، ۷ کا عدد ۲۵ پر ضرور مشتمل ہے۔ لہذا یہ اختلاف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت میں خارج نہیں۔ فتدبر ولاتکن من المستعجلین۔

بالآخر یہ بھی عرض ہے کہ ائمہ اسلام کا یہ مسلمہ اصل ہے کہ نبی سے آخری بات لی جائیگی۔ اور اس سے پہلی بات جو اس کے خلاف ہو منسوخ سمجھی جائے گی۔ پس آپ کی سمجھ میں ہمارا جواب نہ آئے یا اس سے آپ کی تسلی نہ ہو تو آپ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیّہ کے پہلے دو قول کو جو پانچسو یا چھ سو احکام القرآن بتاتے ہیں سات سو تعداد کے احکام القرآن والے قول سے منسوخ سمجھ لیں۔ یہ نسخ آپ کی نبوّت میں خارج نہیں۔ آپ لوگ تو قرآنی آیات میں بھی نسخ کے قائل ہیں اور حدیث کے احکام میں بھی۔

۵- زلزلۂ موعودہ

۲۸/۲۷ فروری ۱۹۰۶ء کو جو زلزلہ آیا اس کے بارے میں آپ نے جو تناقض دکھانے کی کوشش کی تھی ہماری طرف سے اس کا حل آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ اب جرح میں آپ یہ لکھتے ہیں :-

"میرا سوال یہ نہیں تھا کہ ۲۸/۲۷ فروری ۱۹۰۶ء کا زلزلہ پانچ موعودہ زلزلوں میں شامل تھا یا نہیں۔ بلکہ یہ تھا کہ یہ زلزلہ

۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کے برابر تھا یا نہیں۔ جس کا آپ نے جواب نہیں دیا۔ مرزا صاحب کی تحریر میں تناقض اس بات میں ہے، کہ اس زلزلے کو ایک جگہ (یعنی تجلّیاتِ الٰہیہ میں) ایسا سخت کہ ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری جگہ (یعنی حقیقۃ الوحی میں) ان زلزلوں کو جن میں ۲۷/۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کا زلزلہ بھی شامل ہے ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلے سے خفیف ہونے کی وجہ سے پہلے چار موعودہ زلزلوں میں شمار نہیں کیا گیا۔ یعنی ایک جگہ اس زلزلہ کو ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے برابر اور ایک جگہ اس سے خفیف قرار دیا گیا ہے لیکن آپ کہتے ہیں کہ یہ تناقض نہیں "

جنابِ من! یہ آپ کی بھول ہے کہ آپ یہ لکھ رہے ہیں کہ میرا سوال یہ نہیں تھا کہ ۲۷/۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کا زلزلہ پانچ موعودہ زلزلوں میں شامل تھا یا نہیں۔ آپ اپنے سوال کی جزو ۳ پڑھیں جس کے یہ الفاظ ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب کو پانچ زلزلوں میں (سے چھوٹا ہوا ہے۔ ناقل) کتنے زلزلے دکھائے یا کیا کچھ دکھایا جا چکا ہے۔ اور کیا کچھ باقی ہے۔"

اس سوال کا جواب ہم نے جزو "ج" میں یہ دیا تھا۔ "اس تحقیق کی رُو سے پانچ زلزلوں میں سے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی زندگی میں کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ (ملاحظہ ہو حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۲ حاشیہ) جس سے ظاہر ہے کہ اس وقت

تک صرف تین زلزلے آچکے تھے۔ جو ان موعودہ پانچ زلزلوں میں شامل نہیں قرار دیئے گئے۔"

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ یہ زلزلہ ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کے برابر تھا یا نہیں۔ اس کے متعلق آپ لکھتے ہیں۔ کہ ہماری طرف سے آپ کو جواب نہیں دیا گیا لیکن جب ہماری طرف آپ یہ بھی منسوب کرتے ہیں کہ:۔ "آپ کہتے ہیں یہ تناقض نہیں" تو آپ کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ہماری طرف سے آپ کے اس سوال کا جواب بھی دے دیا گیا تھا مگر آپ نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ دیکھئے ہم نے جواب میں لکھا تھا:۔

"حقیقۃ الوحی اور تجلیات الٰہیہ سے زلزلہ کے متعلق جو دو عبارتیں آپ نے پیش کی ہیں ان میں دراصل کوئی تضاد موجود نہیں۔ آپ توجہ کے ساتھ دونوں عبارتوں کا پھر مطالعہ کریں۔ ان دو عبارتوں میں ۲۷/۲۸ فروری کی رات کے زلزلہ کو باوجود اس کے اپنی ذات میں غیر معمولی اور شدید ہونے کے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے اپنے عندیہ میں ایسا شدید نہیں سمجھا کہ اسے پانچ موعودہ زلزلوں میں شمار فرماتے۔ گو اس کے متعلق بھی ایک پیشگوئی موجود تھی۔ جس میں اسے اپنی ذات میں غیر معمولی قرار دیا گیا تھا۔ یہ زلزلہ بموجب اشتہار ۲۹ر اپریل ۱۹۰۶ء (مندرجہ اخبار الحکم ۳۰ر اپریل ۱۹۰۶ء) حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کی پیشگوئی

کے مطابق ۲۵ر فروری سے پہلے نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ یہ
پیشگوئی ۲۷/۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کی رات کے زلزلہ سے شاندار
طریق سے پوری ہو گئی۔ مگر حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ
اسے ان پانچ زلزلوں میں شامل نہیں فرماتے۔ جو ایک
دوسری پیشگوئی میں موعود ہیں۔"

آپ کہتے ہیں کہ ہم نے تناقض کا جواب نہیں دیا۔ حالانکہ ہم تو آپ
کو جواب دے چکے ہیں۔ کہ ان دونوں عبارتوں میں تو تضاد بھی موجود
نہیں اور آپ کو توجہ دلائی گئی تھی۔ کہ دونوں عبارتوں کا پھر مطالعہ
کریں۔ مگر افسوس کہ آپ نے ہماری اس نصیحت سے بھی فائدہ نہیں
اٹھایا۔ اور اپنے پہلے اعتراض کو ہی دہرا رہے ہیں۔ کہ وہ زلزلہ
پانچ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ سے خفیف تھا یا برابر۔

جنابِ من! اخبار کے مبالغہ آمیز بیان کے مطابق وہ پانچ
اپریل کے زلزلہ کے برابر تھا۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے عندیہ کے
مطابق وہ شدید تو تھا لیکن پانچ اپریل کے زلزلہ سے خفیف تھا۔
یہ شدّت اور خفّت اضافی اور نسبتی امور ہیں۔ جو ان کو اضافی اور
نسبتی امر سمجھ لے گا اس کے نزدیک تو دونوں عبارتوں میں تضاد نہیں
ہو گا۔ مگر جو اس نسبت کو سمجھنا نہ چاہے وہ مرتے دم تک تناقض کی
رٹ لگاتا رہے گا۔ کیا ہماری تحریر میں یہ الفاظ موجود نہیں کہ ان دونوں
عبارتوں میں ۲۷/۲۸ فروری کی رات کے زلزلہ کو باوجود اس کے اپنی ذات

میں غیر معمولی اور شدید ہونے کے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنے عندیہ میں ایسا شدید نہیں سمجھا کہ اسے پانچ موعودہ زلزلوں میں شامل فرماتے۔ اگر یہ الفاظ موجود ہیں جیسا کہ یقیناً موجود ہیں۔ تو ہم نے آپ کو جواب سمجھا دیا تھا کہ گو یہ زلزلہ اپنی ذات میں شدید تھا۔ لیکن حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے عندیہ میں ایسا شدید نہ تھا۔ کہ وہ ان میں شمار ہوتا۔ یہ پانچ موعود زلزلے بہر حال ۴؍ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ سے خفیف نہیں ہو سکتے۔ پس شدت اور خفت کا اضافی امر ہونا ظاہر ہے ایک زلزلہ اپنی ذات میں شدید ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسرے کے مقابلے میں خفیف ہو سکتا ہے خواہ اخبار والے اسے ازراہِ مبالغہ برابر ہی قرار دیتے ہوں۔ افسوس ہے کہ سچے موتیوں کی آپ کے ہاں کوئی قدر نہیں اور آپ جھوٹے موتیوں کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ جو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے اس کلام میں آپ کو نہیں مل سکے۔ یہ پیشگوئی کس طرح سچے موتیوں کی طرح جگمگا رہی ہے۔ کہ جس زلزلہ کی آپ نے پیشگوئی فرمائی تھی اس کے متعلق واضح طور پر اشتہار میں لکھ دیا تھا کہ یہ ۲۵؍ فروری سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اور یہ زلزلہ ۲۷/۲۸ فروری کی درمیانی رات کو آیا۔ جبکہ ۲۵؍ فروری گذر چکی تھی۔ مگر موتیوں کی قدر تو جوہری ہی کر سکتا ہے۔

معاف فرمائیں! ہم نے آپ کو جوہری نہیں پایا۔ بلکہ عداوت میں ہُنر کو نظر انداز کر دینے والا پایا ہے۔

اس کے بعد آپ بہار کے موسم کو زیر بحث لائے ہیں۔ اور چاروں موسموں کے لئے تین تین مہینے تجویز کر کے بہار کا موسم مارچ اپریل اور مئی قرار دیا ہے۔ اور پھر ہم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آپ خود مان رہے ہیں کہ پانچ موعود زلزلوں میں سے پہلے زلزلہ کے لئے خطرہ کے لحاظ سے بہار کا موسم حضرت بانیٔ سلسلہؑ کے نزدیک جنوری کے آخر سے شروع ہو کر مئی تک تین ۳ کی بجائے چار ۴ ماہ سے بھی کچھ زیادہ کا ہوتا ہے۔ پھر تضحیک کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے لئے چار ماہ کو چھوڑ کر چھ ماہ کا موسم بہار تجویز کر لیں۔"

جنابِ من! کاش آپ تضحیک سے کام نہ لیتے اور حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السّلام کے بیان کی قدر کرتے کہ آپ نے موسم بہار میں موعودہ پانچ زلزلوں میں سے پہلے زلزلے کی پیشگوئی فرمائی تو اس کے لئے خود حد مقرر فرما دی کہ خطرہ کے ایام جنوری کے آخر سے غالباً مئی کے آخر تک ہوں گے۔

عموماً موسم بہار تین مہینے کا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر جنوری میں شدت کا جاڑا نہ پڑے تو بعض درختوں پر جنوری کے آخر میں پتہ نکل آتا ہے جو بہار کے شروع ہو جانے کی طبعی علامت ہے۔ غالباً اسی کے پیش نظر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ تحریر فرمایا۔

"چونکہ آخر جنوری میں بعض درختوں کا پتہ نکلنا شروع

ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسی مہینہ سے خوف کے دن شروع
ہوں گے۔ اور غالباً مئی کے آخر تک وہ دن رہیں گے "

اسی لئے ہم نے جواب میں لکھا تھا کہ موعودہ زلزلوں میں سے پہلے زلزلہ کے خطرہ کے لحاظ سے بہار کا موسم حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے نزدیک جنوری کے آخر سے شروع ہوتا ہے۔ اور مئی کے آخر تک خطرہ کے ایام ہیں۔ پس موسموں کا آگے پیچھے ہوتے رہنا ایک طبعی امر ہے۔ ہاں علی العموم بہار کے تین مہینے خیال کئے جاتے ہیں جو مارچ اپریل اور مئی ہیں۔ مگر اکثر بہار فروری کے آخر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو مئی کے آخری ہفتہ میں شدید گرمی پڑتی اور گرما کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر بارش ہو جائے تو الگ بات ہے۔

$\frac{27}{28}$ فروری کو جو زلزلہ آیا حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے اس کے بارے میں جو الفاظ لکھے وہ عین وَسَطِ بہار ہوں یا عَین وَسْطِ بہار۔ ہر سنجیدہ اردو خواں اس کا یہی مفہوم سمجھے گا۔ کہ عَین دَورانِ بہار مراد ہے، اور یہ کہ فروری کے آخر کو حضرت بانی سلسلہ احمدیّہ نے بہار کا موسم ہی جانا ہے اسی لئے اس کے لئے شرط لگادی تھی۔ کہ پچیس[۲۵] فروری سے پہلے یہ زلزلہ نہیں آوے گا۔ گویا اس زلزلہ کے لئے ۲۵ر فروری کے بعد آنا ضروری تھا۔ اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ کے بیان کے مطابق یہ زلزلہ ۲۵ر فروری کے بعد $\frac{27}{28}$ فروری کی درمیانی رات کو ٹھیک اثنائے بہار میں ہی آیا ہے۔ پس الہام کے متعلق ملہم کی تفہیم کو ہر حال ایک اہمیت

حاصل ہے۔ جس کو کوئی اردو دان فہمیدہ اور سمجھدار نظر انداز نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ تکذیب میں مصر نہ ہو۔ اور محض لفظی نزاع پیدا کر کے تکذیب کی راہ نہ نکالنا چاہتا ہو۔ یہاں ایک واقعہ متوقع میں آچکا تھا۔ یعنی زلزلہ کی خبر ۲۵ر فروری کے بعد پوری ہو چکی تھی۔ اور زلزلہ بہار کے موسم میں آنا تھا۔ اور آپ پیشگوئی کی تفہیم یہ بتا چکے ہوئے تھے کہ ۲۵ر فروری سے پہلے یہ زلزلہ نہیں آئے گا۔ اور ایسا ہی ہوا کہ یہ زلزلہ ۲۵ر فروری کے بعد آیا۔ مگر آپ اس سے ہدایت حاصل کرنے کی بجائے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کی ادبی غلطی نکالنے پر مصر ہیں۔ حالانکہ ہر شخص کا ایک محاورۂ کلام ہوتا ہے۔ اور عقلمند انسان مصنف کے طرزِ کلام سے اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ کو خلافِ منشاءِ متکلم معنی دینا پسند نہیں کرتے بلکہ اسے صحافی بددیانتی جانتے ہیں۔ کہ متکلم کے منشاء کو سمجھنے کے بعد بھی اس پر نکتہ چینی کی جائے آپ یوں سمجھیں کہ یہ حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہؑ کا طرزِ کلام ہے۔ کہ عین وَسَطِ بہار یا بزعم آپ کے عین وَسْطِ بہار سے ٹھیک دورانِ بہار مراد لیتے ہیں۔

عربی علمِ ادب کے لحاظ سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کے فاصلہ کو وَسَط کہتے ہیں۔ اور اگر وَسْط کا لفظ وَسَط کی جگہ کوئی استعمال کرے اور مراد شروع سے آخر تک کوئی جگہ یا وقت ہو تو یہ اطلاق مجازی سمجھا جائے گا۔ اردو زبان میں بہت سے عربی الفاظ کا استعمال ہوئے ہیں۔

اس لئے ادیب لوگ تو عربی لفظ کی صحت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور غیر ادیب صحت کو نظر انداز بھی کر جاتے ہیں۔ مثلاً نَقص کا لفظ ہے جسے اردو دان علی العموم نُقص پڑھتے ہیں اور اہل علم نَقص پڑھنے لگے ہیں یا مِشعل کا لفظ ہے جسے عوام مَشعل پڑھتے ہیں اور اچھے ادیب مِشعل۔ سو ہم نے ایک اچھے ادیب کی طرح اس لفظ کا استعمال اس محل میں وَسط جانا ہے۔ نہ کہ وَسْط۔ گو وَسط پڑھنے سے بھی مجازاً اثنا اور دَوران کے معنی ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ واقعہ وقوع میں آچکا ہے اور اس کو دیکھ کر یہ کس وقت ہوا اس لفظ کا مفہوم متعیّن کرنا ہوگا۔

اس بات کا ثبوت کہ زلزلہ کا واقعہ ہو جانے کے بعد جو ۲۷/۲۸ فروری کی درمیانی رات کو آیا حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیّہ نے اس کے لئے عین وسط بہار میں آنے کا ذکر کیا۔ اس کے لئے آپ کے یہ الفاظ عبارۃ النّص ہیں۔

"تب ۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کی رات کو عین وَسَطِ بہار میں ایک بجے کے وقت ایسا سخت زلزلہ آیا کہ انگریزی اخبارات 'سول' وغیرہ کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ یہ زلزلہ ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے برابر تھا۔" (تجلّیات الٰہیہ صفحہ ۱۲ طبع چہارم)

نوٹ:۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ان اخباروں کا بیان حضرت بانی سلسلہ احمدیّہ کے نزدیک اتنا مبالغہ آمیز ضرور تھا۔ کہ آپ کے نزدیک یہ زلزلہ ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ سے خفیف تھا۔ گو اپنی ذات میں یہ بھی شدید تھا۔

پانچ موعود زلزلے کے عنوان کے تحت آپ نے بعض نئی باتیں لکھی ہیں۔ اور نئے سوالات یا اعتراضات کئے ہیں۔ تجلیات ص۱۱-۱۲ کی بناء پر کہ انہیں سخت زلزلوں کی خبریں میری کتاب براہین احمدیہ میں آج سے پچیس برس پہلے شائع ہو چکی ہیں اور چشمہ معرفت کی اس عبارت کی بناء پر کہ:-

"اگر لوگوں نے میری راہ اختیار نہ کی تو میں طاعون بھیجونگا اور سخت مری پڑے گی اور زلزلے آئیں گے۔ اور خوفناک آفتیں ظاہر ہوں گی"

آپ کا سوال یہ ہے کہ "کیا آپ بتائیں گے کہ براہین احمدیہ میں مرزا صاحب کی مندرجہ بالا پیشگوئیاں کہاں اور کن الفاظ میں بیان ہوئی ہیں: تاکہ مرزا صاحب کی سچائی یا غلط بیانی کا اندازہ ہو سکے"!

الجواب:- جناب من! چشمہ معرفت کے جس صفحہ کا یعنی ص۲ (ضمیمہ۔ ناقل) کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ اس سے پہلے ص۲۷ کے آخر پر حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اپنے ایک الہام سے اس وعدہ کی نشاندہی بھی فرمائی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:-

"خدا تعالیٰ نے آج سے پچیس برس پہلے مجھے مخاطب کر کے ایک عظیم الشان پیشگوئی کی ہے جو میری کتاب براہین احمدیہ میں درج ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ میں اپنی چمکار دکھلاؤں گا۔ اور اپنی قدرت نمائی سے تجھ کو

اٹھاؤں گا۔" دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو
قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے
زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔"
(براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۵۵۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر۴)

واضح رہے کہ یہ زور آور حملے وہی ہیں جو عدم قبولیت کی صورت میں بعد کی پیشگوئیوں کی وضاحت کے مطابق طاعون اور زلزلوں وغیرہ آفات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس الہام میں اجمالی طور پر ایسی آفات کا وعدہ ہی مذکور ہے۔ چشمۂ معرفت ضمیمہ ص۲۰ کی محوّلہ عبارت کا مضمون بھی اجمالاً براہین احمدیہ طبع اوّل کے ص۵۰۵ پر مسیح کی جلالی موعود آمد کی پیشگوئی کے ذکر میں ان الفاظ میں ملتا ہے:-

"یہ آیت اس مقام میں حضرت مسیح کے جلالی طور پر ظاہر ہونے کا اشارہ ہے یعنی اگر طریق رفق اور نرمی اور لطف و احسان کو قبول نہیں کریں گے اور حقِ محض جو دلائلِ واضحہ اور آیاتِ بیّنہ سے کھُل گیا ہے اس سے سرکش رہیں گے تو وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ جب خدا تعالےٰ مجرمین کے لئے شدّت، عنف اور قہر اور سختی کو استعمال میں لائے گا۔"

بعد میں آپ پر یہ کھُل گیا کہ حضرت مسیحؑ کی اس آمد ثانی کی پیشگوئی کے موعود بھی آپ ہی ہیں نہ کوئی اور۔ پس مجرمین پر خدا کے اس قہر اور

سختی کا طاعون اور زلزلوں وغیرہ کی صورت میں بھی آپ کے زمانہ میں ظہور ہوا ہے۔ ماسوا اس کے براہین احمدیہ صفحہ ۵۲ طبع اوّل پر حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا یہ الہام بھی درج ہے۔" امراض الناس و برکاتہ"۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ بیماریاں ظاہر ہونگی اور آپ کے لئے برکاتِ الٰہی کا موجب ہوں گی۔ اسی طرح آپ پر دو مرتبہ "فلمّا تجلّٰی ربّہ للجبل جعلہٗ دکًّا" کا الہام بھی نازل ہوا جو براہین احمدیہ طبع اوّل کے صفحہ ۵۱۶ و صفحہ ۵۵۸ پر درج ہے [1]۔ جو اپنے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے زلزلہ کی خبر پر

---

[1] براہین احمدیہ طبع اوّل صفحہ ۵۱۶ کے یہ الہامات بھی مدنظر رہیں۔ قالوا انّٰی لک ھٰذا ان ھٰذا الّا سحر یؤثر۔ لن نؤمن لک حتّٰی نری اللّٰہ جھرۃ۔ لایصدّق السفیہ الّا سیفۃ الھلاک عدوٌّ لّی و عدوٌّ لّک۔ قل اتٰی امر اللّٰہ فلا تستعجلوہ۔ اذا جاء نصر اللّٰہ الست بربّکم قالوا بلٰی۔ (ترجمہ) کہیں گے یہ تجھے کہاں سے حاصل ہوا۔ یہ تو ایک سحر ہے جو اختیار کیا جاتا ہے۔ ہم ہرگز نہیں مانیں گے جب تک خدا کو چشم خود دیکھ نہ لیں سفیہہ بجز سزا یہ ہلاکت کے کسی چیز کو باور نہیں کرتا۔ میرا اور تیرا دشمن ہے۔ کہ خدا کا امر آتا ہے تو تم جلدی مت کرو۔ جب خدا کی مدد آئے گی تو کہا جائیگا۔ کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں؟ کہیں گے کہ کیوں نہیں۔

(صفحہ ۵۱۶ و صفحہ ۵۲ براہین احمدیہ طبع اوّل)

مشتمل ہے واللہ اعلم بالصواب۔ براہین احمدیہ کا صفحہ ۲/۴۷۱ بھی ملاحظہ کریں :-

"جو شخص ظلماتی حجابوں سے نکل کر سیدھا خدا تعالیٰ کی طرف
اپنی رُوح کا مُنہ پھیر کر اس کے آستانہ پر گر جاتا ہے
اس پر فیضانِ رحمتِ خاصہ ایزدی کا ہوتا ہے اور جو شخص
اس طریق کے برخلاف کوئی دوسرا طریق اختیار کر لیتا ہے
تو بالضرورہ جو امر رحمت کے برخلاف ہے یعنی غضب الٰہی
اس پر وارد ہو جاتا ہے۔" (براہین احمدیہ طبع اول صفحہ ۲/۴۷۱)

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "براہین احمدیہ میں یہ ضرور لکھا ہوا ہے کہ زلزلوں اور وباؤں کی پیشگوئیاں کرنا نجومیوں اور رمالوں کا کام ہے"
قرآن مجید کی پیشگوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"اور یہ سب خبریں ایسی ہیں جن کے ساتھ اقتدار اور
قدرتِ الوہیت شامل ہے یہ نہیں کہ نجومیوں کی طرح
صرف ایسی ہی خبریں ہوں کہ زلزلے آویں گے، قحط پڑے گا
قوم پر قوم چڑھائی کرے گی۔ وبائیں پھیلیں گی۔ مری
پڑے گی وغیرہ۔" (براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۵ حاشیہ طبع اول)

(یہی بات دوسرے الفاظ میں براہین احمدیہ صفحہ ۲۶۵ طبع اول پر بیان ہوئی ہے)

الجواب :- آپ کا یہ لکھنا درست نہیں کہ براہین احمدیہ میں یہ ضرور لکھا ہے کہ "زلزلوں اور وباؤں کی پیشگوئیاں کرنا نجومیوں

رمّالوں کا کام ہے۔" ہمیں آپ کی یہ عبارت براہین احمدیہ کے دو نو محوّلہ
صفحوں پر لفظاً اور معنیً نہیں ملی۔ بلکہ ص۲۶۸ پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"دُنیا میں بجز انبیاء کے اَور بھی ایسے لوگ بہت نظر آتے
ہیں کہ ایسی ایسی خبریں پیش از وقوع بتلایا کرتے ہیں
کہ زلزلے آویں گے، وبا پڑے گی، لڑائیاں ہوں گی،
قحط پڑے گا۔ ایک قوم دوسری قوم پر چڑھائی کرے گی
اور یہ ہوگا وہ ہوگا۔ اور بارہا کوئی نہ کوئی ان کی خبر بھی
سچّی نکل آتی ہے۔ پس ان شبہات کے مٹانے کے لئے
وہ پیشینگوئیاں اور اخبار غیبیہ زبردست اور کامل متصوّر
ہوں گے جن کے ساتھ ایسے نشان قدرت الٰہیّہ کے ہوں
جن میں رمّالوں اور خواب بینوں اور نجومیوں وغیرہ کا
شریک ہونا ممتنع اور محال ہو یعنی ان میں خداوند
تعالیٰ کے کامل جلال کا جوش اور اس کی تائیدات
کا ایسا بزرگ چمکارا نظر آتا ہو جو بدیہی طور پر اُس کی
توجہات خاصہ پر دلالت کرتا ہو۔ اور نیز وہ ایک ایسی
نصرت کی خبر پر مشتمل ہوں جس میں اپنی فتح اور مخالف کی
شکست اور اپنی عزّت اور مخالف کی ذلّت اور اپنا اقبال
اور مخالف کا زوال بہ تفصیل تمام ظاہر کیا گیا ہو۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ زلزلے، وبا، قحط اور لڑائیوں کی پیشگوئیاں

انبیاء بھی کرتے رہے ہیں نہ کہ صرف رمّال اور نجومی ہی۔ اور انبیاء اور رمّالوں اور نجومیوں کی پیشگوئیوں میں یہ ما بہ الامتیاز براہین احمدیہ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ انبیاء کی پیشگوئیوں میں قدرت الوہیّت شامل ہوتی ہے اور ان پیشگوئیوں سے انبیاء کی تائید اور نصرت ہوتی ہے۔ اور ان کی فتح اور مخالفین کی شکست ہوتی ہے۔ پس حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے "ضرور" تو کجا، سادہ لفظوں میں بھی یہ بات نہیں لکھی کہ "زلزلوں اور وباؤں کی پیشگوئیاں کرنا، نجومیوں اور راولوں کا کام ہے۔"

جناب من! آپ اپنے بیان سے یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کہ جب زلزلوں اور وباؤں کی پیشگوئیاں کرنا راولوں اور نجومیوں کا کام ہے تو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی ایسی پیشگوئیوں کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ آپ کا یہ تاثر پیدا کرنا درست نہیں۔ ایسی پیشگوئیاں صرف نجومی ہی نہیں کرتے، نبی بھی کرتے ہیں۔ اور قرآن میں بھی ایسی پیشگوئیاں کی گئی ہیں مگر ان میں ایک ما بہ الامتیاز موجود ہے کہ نبیوں اور قرآن مجید کی پیشگوئیاں اقتداری نشان ہیں اور تائید و نصرت الٰہی کا ثبوت اور پیشگوئی کنندہ کی فتح اور اس کے مخالف کی شکست کا ثبوت ہیں۔ یہ بات رمّالوں اور نجومیوں کو حاصل نہیں ہوتی۔ وہ تو صاف بتا دیتے ہیں کہ ہم تو نجوم و رمل سے یہ پیشگوئی کر رہے ہیں نہ کہ خدا تعالیٰ سے الہام پا کر۔ پس وہ کسی روحانی منصب

کے مدعی بھی نہیں ہوتے۔ لیکن نبیوں کی پیشگوئیاں تو اپنے ساتھ الٰہی اقتدار رکھتی ہیں۔ اور وہ پیشگوئیاں نبی کی کامیابی اور گروہ مومنین کی مضبوطی کا باعث بنتی ہیں۔ نجومی کی بعض پیشگوئیاں اگر اتفاقی پوری بھی ہو جائیں پھر بھی وہ نجومی کا نجومی اور رمال کا رمال ہی رہتا ہے۔ نبی اور رسول نہیں مانا جاتا۔

پس آپ کا بیان حد درجہ قابلِ افسوس ہے۔ کیونکہ براہین احمدیہ کے دونوں مقامات پر قرآن مجید کی اقتداری پیشگوئیوں کا نجومیوں کی پیشگوئیوں سے تقابل بیان کیا جا رہا ہے۔ اور آپ یہ بے پر کی اُڑانا چاہتے ہیں کہ جب نجومی اور رمال بھی ایسی پیشگوئیاں کرتے ہیں تو پھر بانی سلسلہ احمدیہ کی پیشگوئیاں بھی نجومیوں کی پیشگوئیوں کی طرح ہی ہوئیں۔ حالانکہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے ذریعہ خدا نے اپنی اقتداری تجلیات دکھائی ہیں۔ اور آپ کو بڑھایا ہے اور عظمت دی ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے خوش ہونا چاہیئے تھا۔ کہ قرآن مجید کا تقابل نجومیوں کی پیشگوئیوں سے کر کے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے کلام الٰہی کی عظمت ثابت کرنا چاہی تھی۔ لیکن آپ نے اس بات کی کوئی قدر نہیں کی اور اپنی رُوحانی پسماندگی کا ثبوت دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے اور آپ کو صحیح اندازِ فکر عطا فرمائے۔

تیسرا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ موعودہ زلزلے بہرحال طاعون ختم ہونے سے پہلے آنا تھے۔ اس بارے میں آپ نے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ

کی جو عبارت پیش کی ہے، وہ یہ ہے :-

"جب یہ پانچ زلزلے آچکیں گے اور جس قدر خدا نے تباہی کا ارادہ کیا ہے وہ پورا ہو چکے گا۔ تب خدا کا رحم پھر جوش مارے گا۔ اور پھر غیر معمولی اور دہشتناک زلزلوں کا ایک مدت تک خاتمہ ہو جائے گا۔ اور طاعون بھی ملک سے جاتی رہے گی۔" (تجلیات الٰہیہ ص۸)

آپ کا اعتراض یہ ہے کہ "طاعون تو ملک سے چلی گئی اور زلزلے نہ آئے۔"

الجواب:- مقصود اس کلام کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب پانچ زلزلے آجائیں گے تو اس زمانہ میں طاعون بھی موجود ہو گی اور آخری زلزلہ آنے کے ساتھ ہی طاعون بھی ملک سے جاتی رہے گی یعنی زلزلے اور طاعون اکٹھے چلے جائیں گے۔ ایک دفعہ شدید طاعون پڑ کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ہی چلی گئی۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد پھر یہ شدید صورت میں پڑی۔ اور خدا جانے ابھی طاعون کے حملے کتنے ہونے والے ہیں۔ جب تک تکذیب میں شدت رہے گی، زور آور حملوں کا بار بار ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ براہین احمدیہ کے الہام سے ظاہر ہے۔ حتیٰ کہ ان زور آور حملوں سے جب دنیا کی اکثریت آپ کو قبول کرلے گی تو موعودہ زلزلے بھی آچکے ہوں گے اور طاعون کا بار بار بطور نشان کے آنا بھی ختم ہو جائے گا۔

یہ بات بھی آپ کے مدنظر رہے کہ الہام الٰہی میں ہی آپ پر یہ

کھول دیا گیا تھا کہ زلزلۃ الساعۃ جو آخری موعودہ زلزلہ ہے وہ آپ کی
زندگی میں نہیں آئے گا۔ اس میں ایک مدت معینہ تک تاخیر ڈال دی گئی
ہے۔ چنانچہ آپ کو الہام ہوا۔ "رب لا ترنی زلزلۃ الساعۃ"،
یہ الہام ہے جو آپ پر ۱۸ مارچ ۱۹۰۶ء کو نازل ہوا۔ اس میں دعا سکھائی
گئی کہ زلزلۃ الساعۃ میں تاخیر ڈال دی جائے۔ اور حضرت اقدس کی
زندگی میں نہ آئے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس میں تاخیر ڈال دی ہے۔

۶۔ معجزہ اور مسیح کے پرندے

معجزہ ایسے خارق عادت امر کو کہتے ہیں جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو
معجزہ کا لفظ قرآن کریم نے استعمال نہیں کیا۔ یہ علماء امت کا اختیار کردہ
ہے۔ ہو سکتا ہے حدیث میں بھی یہ لفظ کہیں استعمال ہوا ہو۔ جہاں سے
علماء نے یہ اصطلاح اخذ کی ہے۔ یہ بات کہ معجزہ میں اسباب ہوتے
ہیں یا نہیں تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ معجزہ ایسے امر
کو کہتے ہیں جو عام عادت کے خلاف ہو۔ اسی لئے خارق عادت امر جو
کسی نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں انہیں معجزہ کہتے ہیں اور کسی کے ہاتھ پر ظاہر
ہوں تو استدراج کہلاتا ہے۔ اور نبی کا جب ایسے لوگوں سے مقابلہ
ہو تو اسے غلبہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کے وقت ہوا کہ
ساحروں نے جو شعبدہ دکھایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ سے

اس پر غالب آئے۔ اور چونکہ وہ ساحر شریف معلوم ہوتے تھے اس لئے مغلوب ہونے پر ایمان لے آئے۔ معجزہ عارضی اور وقتی بھی ہوتا ہے اور دائمی بھی ہو سکتا ہے۔ موسیٰؑ کی لاٹھی کا سانپ دکھائی دینا عارضی وقت کے لئے تھا۔ پھر وہ لاٹھی کی لاٹھی ہی رہی۔ اور مسیحؑ کی بن باپ ولادت، ان کا کوئی معجزہ نہ تھا بلکہ خدا تعالےٰ کی ایک قدرت نمائی تھی۔ جس میں باپ کا سبب بظاہر موجود نہ تھا۔ اس لئے وہ پیدائش خارق عادت تھی۔ اور جب عیسائیوں نے اس کو مسیحؑ کی الوہیت پر دلیل گردانا تو خدا تعالےٰ نے ان کی تردید میں فرمایا: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ "مسیحؑ کا پیدا کیا جانا آدمؑ کی طرح ایک حقیقی امر تھا۔ اور اس میں عام عادت اللہ کا خرق پایا گیا ہے۔ اس سے مسیحؑ اور مریم کی ذات کو تو تکلیف ہی پہنچی، اور وہ لوگوں کی نگاہ میں مورد طعن ہوئے۔ لیکن اس سے منشاء الٰہی یہ ظاہر ہوا کہ خدا کی بادشاہت یہودیوں سے لے لی جائیگی۔ اور اس قوم کو دیدی جائے گی۔ جو اس کا پھل لائے گی۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور بنی اسمٰعیل سے ہوا۔ لہذا عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ ولادت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور کیلئے ارہاص تھی۔ ورنہ جیسا انجیل سے معلوم ہوتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی یہ نکتہ بعد میں کھلا کہ موعود نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں ہوگا اسی لئے وہ یہودیوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "خدا کی بادشاہت تم سے لے لی

جائے گی اور اس قوم کو دی جائے گی جو اس کا پھل لائے گی"۔
(متی ۲۱/۴۳) اس سے پہلے فرماتے ہیں:۔
"جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خدا کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے (متی ۲۱/۴۲)۔
کونے کے پتھر سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے۔
نبی کے ہاتھ پر جو معجزہ ظاہر ہوتا ہے وہ باذن اللہ ہی ہوتا ہے
اللہ تعالٰے قرآن کریم میں فرماتا ہے " ما کان لرسول ان یأتی
بآیۃٍ اِلّا باذن اللّٰہ" اسی کے ساتھ ہی یاد رہے کہ نبی جو معجزہ
باذن اللہ دکھاتا ہے وہ قرآن مجید کی طرح دائمی بھی ہو سکتا ہے
اور موسٰی کے اژدہا کی طرح عارضی اور وقتی بھی۔ حضرت بانیٔ سلسلہ
احمدیہ کے نزدیک حضرت مسیحؑ کا خلقِ طیور کا معجزہ گو باذن اللہ
تھا لیکن مسیح کے بنائے ہوئے پرندوں اور خدا کے بنائے ہوئے
پرندوں میں فرق تھا۔ مفسرین نے بھی ایک فرق تسلیم کیا ہے۔ جو
یہ ہے کہ مسیحؑ کا پرندہ اس وقت تک اڑتا تھا۔ جب تک نظر آتا
تھا۔ اور جب نظر سے غائب ہو جاتا تھا تو مُردے کی طرح گر جاتا تھا
جس سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے پہلے بھی بعض
مفسرین نے مسیحؑ کے پرندوں کی عارضی پرواز کی تسلیم کی ہے حضرت
مسیح موعودؑ نے اس مسئلہ پر اس سے زیادہ روشنی ڈالی ہے
کے نزدیک مسیحؑ کی رُوح میں ایک ایسی معجزانہ استعداد خدا تعالٰی نے

پیدا کردی تھی کہ اگر وہ اپنی روح کی گرمی کسی جماد پر ڈالتے تو اس میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔ جو عارضی ہوتی تھی۔ مسیح کے پرندوں کا اڑنا محض عارضی اور وقتی تھا دائمی نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو ایسی اعجازی قوت نہیں دی۔ کہ اس کا بنایا ہوا پرندہ خدا کے مخلوق پرندوں کی طرح حیات رکھتا ہو۔ اور جاندار کی طرح اس میں گوشت پوست خون اور لحم وشحم پیدا ہو جاتا ہو، جن کا حضرت مسیحؑ کے ان پرندوں میں گوشت پوست، رگ وریشہ اور خون پیدا ہونے کا دعویٰ ہو انہیں اس کا ثبوت پیش کرنا ہوگا، ہم تو اس سے منکر ہیں۔ اور مسیحؑ کے پرندوں کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ حضرت مسیحؑ کی خداداد معجزانہ استعداد سے کَهَيْئَةِ الطَّيْرِ میں جو مٹی سے تجویز کردہ ہوتی تھی۔ عارضی پرواز پیدا ہو جاتی تھی۔ مسیحؑ کے پرندوں میں دائمی پرواز کا پیدا ہو جانا جس سے خدا کے پیدا کردہ پرندوں اور مسیحؑ کے بنائے ہوئے پرندوں میں کوئی فرق نہ رہے اور باہم مل جل جائیں۔ مسیحؑ میں الوہیت کے پائے جانے کے مترادف ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القہار۔ (رعد ۱۶)

کیا لوگوں نے خدا کے ایسے شریک بنا رکھے ہیں۔ جنہوں نے خدا کے پیدا کرنے کی طرح کچھ پیدا کیا یعنی نیست سے ہست کیا اس طرح پر

کہ پھر خدا کی پیدائش کا امر ان پر مشتبہ ہو گیا (یعنی وہ اس میں فرق نہ کر سکے) تم کہدو کہ ہر شئے کا خالق اللہ ہی ہے۔ اور فعلِ خلق میں اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اور وہ اپنی مخلوق پر غالب ہے، اس آیت کی موجودگی میں اگر یہ مان لیا جائے کہ مسیح کے بنائے ہوئے پرندوں اور خدا کے پیدا کردہ پرندوں میں کوئی فرق نہیں رہتا تھا اور وہ خدا کے پرندوں میں مِل جُل جاتے تھے۔ تو پھر مسیح کو خدا کا شریک بھی ماننا پڑے گا۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا نے مسیح کو اپنے اذن سے اپنا شریک بنایا۔ لیکن چونکہ خدا کا شریک ہونا محال ہے۔ اس لئے مسیحؑ کا ایسے پرندے پیدا کرنا بھی محال ہے، جو خدا کے پرندوں میں مل جُل گئے ہوں اور امتیاز اُٹھ گیا ہو اس طرح کہ ان میں گوشت پوست، اور رگ و ریشہ اور دوران خون پیدا ہو گیا ہو۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ افمن یخلق کمن لایخلق (نحل آیت ۱۸) کہ کیا جو ہستی پیدا کرتی ہے یعنی خدا تعالےٰ وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو پیدا نہ کرتا ہو۔

تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے والمراد بمن لایخلق کلّ ماھذا شأنہ من ذوی العلم والملئکۃ وعیسیٰ علیہ السلام وغیرھم من الاصنام۔ پس حقیقت کے لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ بھی اہل علم اور ملائکہ اور اصنام وغیرہ کی طرح

حقیقی خالق نہیں ہیں۔ لہذا مسیح کا معجزانہ خلق خدا کے خلق کے مقابلہ میں مجازی ثابت ہوتا ہے۔ اس کو آپ کا خدا کے خلق کی طرح حقیقی سمجھ لینا قرآن دانی کے خلاف ہے۔ جب خدا کی پیدائش اور عیسیٰ کی پیدائش میں امتیاز ثابت ہو گیا اور از روئے قرآن حضرت عیسیٰؑ کے لئے خلق حقیقی ثابت نہ ہوا تو خلق کے حقیقی معنوں کے لحاظ سے ان کے پرندوں سے حقیقی پرواز اور حقیقی جنبش کی نفی از روئے قرآن مجید ثابت ہو گئی اور مسیح موعود علیہ السلام کے کلام میں کوئی تناقض نہ رہا۔ یہ رفع تناقض، تصریف آیات کے اصول کے ماتحت ہے۔ جسے آپ ہماری ذہنی ایجاد نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔ قرآن مجید اپنی تفسیر بعض جگہ آپ کر دیتا ہے۔

آپ کی طبیعت میں ایک الجھن ہے جس کی وجہ سے حضرت مسیحؑ کی طرف خدا تعالےٰ کی طرح حقیقی خلق منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ اس الجھن کا پتہ آپ کے اس سوال سے لگتا ہے۔

"کیا اللہ تعالےٰ اپنی صفت خلق کا کسی انسان کے ذریعہ اظہار کر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ کا جواب یہ ہو کہ نہیں تو پھر یہ بھی مان لیجئے کہ اللہ تعالےٰ اپنی صفت کلام کا بھی کسی انسان کے ذریعہ اظہار نہیں کر سکتا۔ بتایئے پھر قرآن کریم کیا ہوا! اور حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی کا سانپ میں تبدیل ہو جانا کیا ہوا؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالےٰ کی صفت خلق میں شریک نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ تعالےٰ اپنے خلق اور نبی کے ذریعہ اپنی اس صفت خلق

کا اظہار کرتے ہوئے امتیاز ضرور قائم رکھتا ہے۔ تا دونوں کے خلق میں التباس ہو کر شرک لازم نہ آئے۔ یہ امتیاز دریافت کرنا آپ کا بھی کام ہے اور ہمارا بھی۔ اگر آپ امتیاز نہیں مانتے تو مسیح کو صفت خلق میں خدا کا شریک مانیں۔ اس طرح توحید کے عقیدہ کو آپ چھوڑنے والے ہوں گے۔ رہا خدا کا صفت کلام کا اظہار۔ تو چونکہ رسول اور مرسل کا امتیاز موجود ہوتا ہے اس لئے التباس پیدا نہیں ہوتا۔ اور نبی پر جو وحی نازل ہوتی ہے وہ خدا کا کلام کہلاتی ہے۔ خواہ اس میں ملائکہ کا واسطہ ہو یا خدا سے بالمشافہ گفتگو ہو۔ چونکہ وہ الفاظ خدا کے ہوتے ہیں اس لئے رسول کی طرف اگر منسوب ہوں تو مجازاً ہوں گے نہ کہ حقیقتاً۔ چنانچہ "انہ لقول رسول کریم" الآیۃ میں قرآن کو مجازاً ہی رسول کریم کا قول قرار دیا گیا ہے حقیقتاً تو یہ "تنزیل من رب العالمین" ہے۔ جسے روح امین کے ذریعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل کیا گیا۔ پس قرآن کریم معجزہ ہے۔ خدا کا کلام ہونے کے لحاظ سے اسے حقیقتاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن مسیح علیہ السلام کی طرف تو آپ حقیقتاً خلق طیور منسوب کر رہے ہیں۔ فبینھما بون بعید!

آپ نے کچھ رکیک سی باتیں بھی لکھی ہیں۔ اور یہ سوال کیا ہے کہ

"آپ کے نزدیک ہوائی جہاز کی پرواز حقیقی ہے یا عارضی ؟

دوسرے لفظوں میں کیا آپ ہوائی جہاز کی پرواز کو معجزانہ

پرواز مانتے ہیں جو حقیقی حیات کو نہیں چاہتی؟ حضرت
عیسیٰؑ کے پرندوں کی پرواز اور ہوائی جہاز کی پرواز میں
کیا فرق ہے اور کیا بات مشترک ہے۔"

ہمارے پچھلے مضمون سے آپ کو دونو کا فرق خود سمجھ آجانا چاہیئے۔
ایک میں دعویٰ اعجاز ہے یعنی مسیح کے پرندے بنانے میں اور ہوائی جہاز
کے بارے میں کوئی دعویٰ اعجاز نہیں۔ دونو کی پرواز میں بڑا انتہائی
فرق ہے گو پرواز دونوں کی عارضی ہے۔ مگر عارضی ہونے کی وجوہ
مختلف ہیں۔ ایک میں مشینی ذرائع کام کرتے ہیں اور دوسرے میں مسیحؑ
کی معجزانہ استعداد۔ آپ نے مشین کے ذریعہ چوزے پیدا ہونے کا بھی
ذکر کیا ہے۔ اور پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر معجزہ کسی کاریگری کا نام ہے اور عام مروجہ قوانینِ فطرت
کے مطابق عمل کرتا ہے تو ان چوزوں کی مشین کے ذریعہ
پیدائش یقیناً معجزانہ ہے۔ لیکن یاد رکھئیے کہ اس معجزانہ
پیدائش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے چوزے حقیقۃً چوزے
ہوتے ہیں نہ کہ عارضی۔"

اس کے متعلق عرض ہے کہ جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ چوزوں کی مشین
کے ذریعہ پیدائش بھی قانون فطرت کے مطابق ہے تو پھر اسے خارق
عادت یا معجزہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق جو
پیدائش ہو خواہ انسان کی ہو یا حیوان کی یا پرندہ کی وہ حقیقی پیدائش

ہی ہو گی۔ معجزانہ نہیں کہلائے گی۔ فانہ فع الوھم۔
انڈوں کو در اصل مناسب مقدار میں گرمی ملنی چاہیئے تھی۔ اب
وہ گرمی خواہ پرندے کے پروں کے ذریعہ میسر آئے یا مشین کے ذریعہ
ہر دو حالتوں میں پیدائش نیچرل ہو گی نہ کہ سپر نیچرل۔ امید ہے کہ
اب آپ حقیقت کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اور آئندہ اس قسم کے بے معنی
سوالات سے اجتناب فرمائیں گے۔ اگر مشین انڈے کے بغیر بچہ نکالتی
تو یقیناً یہ مشین کا معجزہ ہوتا۔ یا مشین بنانے والے کا۔ لیکن ایسا
فعل آج تک ظہور میں نہیں آیا۔

۷۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ کی تفسیر

آپ نے سورۃ مائدہ کی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں حضرت
بانئ سلسلہ احمدیہ کی تحریروں میں تناقض دکھانے کی کوشش کی تھی۔
کہ ازالۂ اوہام میں آپ نے وَ اِذْ قَالَ کو ماضی کے معنوں میں لیا
ہے اور دوسرے بعض مقامات پر اس کو مستقبل کے معنوں میں لیا ہے
ہم نے جواباً آپ کو لکھا تھا کہ یہ دونو معنے تفسیر حسینی میں بھی درج
ہیں۔ پس اس آیت کے متعلق علماء کے نزدیک دو احتمال ہیں۔ ازالۂ اوہام

میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے ماضی کے معنے پیش کئے ہیں اور توفی کے معنے وفات مان کر بعد از نزول توفی کی تاویل کرنے والوں کی اسے گذشتہ واقعہ قرار دے کر تردید فرمائی ہے۔ اس تردید سے ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک واذ قال کے ماضی کے معنی اس آیت میں راجح ہیں۔ جب یہ معنی آپ کے نزدیک راجح ہیں۔ تو دوسرے احتمالی معنے جن کو مفسرین نے بیان کیا ہے۔ اور جو آجکل کے علماء حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے سامنے پیش کرتے رہے۔ مرجوح قرار پائے۔ لہذا ان مرجوح معنوں سے حضرت بانی سلسلہ کا وفات مسیح پر استدلال علیٰ سبیلِ تنزل ان معنوں کو فرض کر کے ہی ہو سکتا ہے۔ آپ کو یہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ:۔

"اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ قصہ قیامت کا ہے۔ تب بھی وفات ثابت ہے۔"

کیونکہ ازالہ اوہام میں آیت ہذا میں واذ قال کو ماضی کے معنوں میں لینا خود قطعی قرینہ ہے کہ یہ دوسرے احتمالی معنے ہیں جو آپ کے نزدیک مرجوح ہیں۔ مزید برآں آپ پر واضح رہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان بھی ازالہ اوہام کے معنوں کا ہی مؤید ہے۔ چنانچہ احادیث نبویہ میں یہ مضمون موجود ہے۔ کہ قیامت کے دن جب کچھ لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب سے گرفتار کئے جائیں گے تو آپ فرمائیں گے کہ یہ تو میرے ساتھی تھے۔ اس پر آپ سے کہا جائے گا۔ کہ

انّك لاتدری ما احدثوا بعدك۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کیا بدعات اختیار کیں۔ اس موقعہ پر حضور فرماتے ہیں۔ اقول کما قال العبد الصالح (یعنی عیسےٰ ابن مریم۔ ناقل) وکنتُ علیہم شہیدًا ما دُمتُ فیہم فلمّا توفّیتنی کنتَ انت الرقیب علیہم.... الیٰ قولہ انّك انت العزیز الحکیم (صحیح بخاری کتاب التفسیر) کہ میں اسی طرح کہوں گا جس طرح عیسےٰ علیہ السلام کہہ چکے ہیں کہ میں ان لوگوں کا اس وقت تک نگران تھا جب تک میں ان میں موجود رہا۔ پس جب تو نے مجھے وفات دیدی۔ تو اُن پر تو ہی نگران تھا۔ اور تو ہر چیز پر نگران ہے، اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو غالب حکمت والا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو کتاب التفسیر میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے اس قرآنی بیان کو درج کرنے کے بعد بطور تفسیر کے لاتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے۔ کہ اس حدیث کے بیان کرنے کے وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ بیان دے چکے ہوئے تھے۔ وَ کنتُ علیہم شہیدًا ما دُمتُ فیہم فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم۔ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کا یہ بیان قیامت کو دیا جانے والا تھا۔ تو پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اقول کما قال العبد الصالح

کے الفاظ نہ فرماتے بلکہ یہ فرماتے فا قول کما یقول العبد الصالح ۔ پس حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السّلام کی ازالہ اوہام میں مندرج تفسیر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس بیان کے عین مطابق ہے۔ لہذا و اذ قال کی آیت زیر بحث میں راجح معنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بیان کی بناء پر بھی فعل ماضی کے قرار پائے نہ کہ مستقبل کے ۔ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مستقبل کے معنی کا کوئی قرینہ ہوتا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم اُقول کما قال العبد الصالح کی بجائے اقول کما یقول العبد الصالح کے الفاظ بیان فرماتے ۔ پس جب اصل اور ظلّ کا ماضی کے معنوں پر اتفاق ثابت ہو گیا تو مستقبل کے معنے مرجوح قرار پائے اور ان معنی سے وفات مسیح کا اثبات علی السبیل التنزّل ہی ہو گا نہ حتمی معنی کے طور پر۔ یہ یاد رہے کہ اذ قال مستقبل کے معنوں میں بجز قرینہ کے نہیں آ سکتا ۔ اور اپنے حقیقی معنی ماضی میں قرینہ نہ پایا جانے کی صورت میں بھی مستعمل سمجھا جانا چاہیئے کیونکہ حقیقی معنی کے لئے قرینہ کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ حقیقی معنوں کا قرینہ موجود ہو یا نہ ہو ۔ دونوں صورتوں میں حقیقی معنی ہی مراد ہوتے ہیں ۔

آپ نے ماضی پر اذ کے استعمال کے مستقبل کے معنے میں لیا جانے کو دکھانے کے لئے چار آیات قرآنیہ کے حوالے پیش کئے تھے جن میں سے ایک حوالہ غلطی سے ہمارا آدمی نکال نہیں سکا تھا وہ آیت

اس طرح ہے۔ اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ۔ (بقرہ-۱۶۶)
اس سے پہلی آیت میں یعنی آیت ۱۶۵ میں تبرّا الذین اتبعوا کا زمانہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔ ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب ان القوۃ للہ جمیعًا و ان اللہ شدید العذاب۔ کہ کاش وہ لوگ دیکھیں جبکہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ یقیناً سب قوت اللہ تعالےٰ کو حاصل ہے۔ اور کہ یقیناً اللہ تعالےٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ گویا آپ کی ان چاروں پیش کردہ آیات سے پہلے وَلَوْ یَرٰی یا وَلَوْ تَرٰی کے الفاظ موجود ہیں یَرٰی اور تَرٰی دونوں مضارع کے صیغے ہیں جو اس بات کے لئے قطعی قرینہ ہیں کہ ان آیات میں فعل ماضی کے ساتھ اِذْ کے استعمال ہونے کے باوجود مستقبل کے معنے ہی مراد ہیں نہ کہ ماضی کے معنی۔ اس کے علاوہ ان آیات میں اور قرائن بھی موجود ہیں۔ جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یہاں جہاں اِذْ کے فعلِ ماضی کے ساتھ استعمال سے پہلے ولو یری یا ولو تری کے الفاظ ہوں وہاں ولو یری اور ولو تری کے قرینہ سے ماضی کا استعمال مستقبل کے معنے رکھتا ہے۔ لیکن جہاں کلام میں اِذْ کے ساتھ استعمال سے پہلے وا ذ موجود ہو یا وَاذْكُرْ کا لفظ محذوف ہوتا ہے۔ یعنی اس گذری ہوئی بات کو یاد کر۔ یہ قرآن کریم کا عام اسلوب بیان ہے۔ جیسے واذ قال ربک للملٰٓئکۃ کے

معنی ہیں یاد کر اس واقعہ کو جب خدا نے فرشتوں سے یہ کہا انی جاعل فی الارض خلیفۃ (الآیۃ) کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے لگا ہوں۔

زیر بحث آیت میں اذ قال سے پہلے ولو یری اور ولو تری کے الفاظ موجود نہیں بلکہ اس سے پہلے واؤ موجود ہے۔ جو اذکر کے حذف کے لئے قرینہ ہے۔ پس اس آیت میں ماضی کے معنی کے لئے یہ قرینہ بھی موجود ہے۔ لہذا مستقبل کے معنی مرجوح قرار پائے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام مستقبل کے معنے لینے والوں کو ان معنوں کو فرض کر کے ہی جواب دے سکتے تھے۔ اس لئے حضرت مسیح موعودؑ کو مستقبل کے معنےٰ کے لئے کسی قرینہ کے پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو ان معنوں کو راجح قرار دیں۔

منھم ظالم لنفسہ

اس جگہ آپ نے بلاوجہ ایک نیا اعتراض کر دیا ہے جس کا و اذ قال والی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ اعتراض بھی محض اعتراض برائے اعتراض ہے۔ ورنہ اس آیت کے جو معنے حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے براہین احمدیہ اور پھر دافع الوساوس اور بالآخر چشمۂ معرفت میں لکھے ہیں ان میں کوئی تناقض نہیں۔ براہین احمدیہ اور چشمۂ معرفت کے بیان میں اجمال ہے۔ اور دافع الوساوس کے بیان میں تفصیل اجمال

اور تفصیل میں نہ تناقض ہوتا ہے نہ تضاد۔ نیز براہین احمدیہ میں جو مضمون آیت سے اخذ کیا گیا ہے وہ بطور اقتضاء النص کے ہے۔ اور دافع الوساوس کا مضمون بطور عبارۃ النص ہے۔ لہذا آپ کے اعتراض کا موجب آپ کا قصورِ فہم ہے۔ اس آیت کے پہلے الفاظ میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا کہ پھر ہم نے الکتاب یعنی قرآن مجید کا وارث ایسے لوگوں کو بنایا ہے جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اس جگہ دراصل مومنوں کا ذکر ہے۔ نہ کہ مشرکوں اور کافروں کا۔ مشرک اور کافر بحالتِ شرک وکفر تو ظالم لنفسہٖ کے مصداق اپنے فطرتی نور کے قوائے بہیمیہ یا غضبیہ کے ماتحت پورے طور پر دبا ہؤا ہونے کی وجہ سے ایمان لانے سے محروم ہوتے اور رہتے ہیں۔ سوائے اُن کے جن کو خدا تعالےٰ کی طرف سے ایمان لانے کی توفیق مل جائے۔ لیکن ایمان لانے والے بھی تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جن میں سے پہلے درجہ کے مومن جو قوائے بہیمیہ یا غضبیہ کے دباؤ کے نیچے ہوتے ہیں۔ ایمان لانے کے بعد جبر و اکراہ اور مجاہدات شاقہ کے ذریعہ نفسِ امارہ کی سرکشی کو توڑنے والے ہوتے ہیں اور یہ ایک حد تک قوائے بہیمیہ اور غضبیہ کے دباؤ سے رہائی پا کر ترقی کر کے پھر میانہ روی کی حالت میں آجاتے ہیں۔ اور ان کی نیکیوں اور بدیوں کی حالت مساوی ہو جاتی ہے۔ یہ دوسرے درجے کے مومن ہیں۔ تیسرے درجے کے مومن وہ ہیں جو گناہوں سے باذن اللہ محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں

اور یہ خاص مقربین الٰہی ہوتے ہیں۔ پس ظالم لنفسہٖ کے ایک معنی
ایسے گنہگار کے ہوتے ہیں۔ جو اپنے نفسِ سرکش کے بہت تابع رہتا ہے
ایسے لوگ کافر اور مشرک ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لاکر مجاہداتِ
شاقہ کرنے والے اور نفسِ سرکش کو اپنی ریاضت سے ایک حد تک
گناہوں سے باز رکھنے والے ہوتے ہیں یہ گناہگار دوسرے معنی کے
لحاظ سے بھی ظالم لنفسہٖ ہوتے ہیں۔ یعنی انہیں نیکیاں اختیار
کرنے کے لئے اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ اس حالت کو بھی ظالم
لنفسہٖ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ ظلم محمود معنوں میں ہے۔ پس جب
اس آیت کا اطلاق مومنوں پر ہو تو جیسا کہ سیاق کلام سے ظاہر ہے
یہ تینوں گروہ قابلِ تعریف اور برگزیدہ ہوں گے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ
نے ان کو ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا
کے الفاظ میں برگزیدہ قرار دیا ہے۔ اور آگے انہی برگزیدوں کے تین
گروہ بیان کئے ہیں۔ اوّل ظالم لنفسہٖ، دوم مقتصد، سوم
سابق بالخیرات باذن اللہ۔ پس اس آیت میں یہ لوگ بطور عبارۃ النص
مذکور ہیں۔ جو لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہوں۔ ان کا ذکر اس آیت میں
بطور عبارۃ النص نہیں ہوا۔ یہ مضمون دافع الوساوس میں بتصریحِ تام
مذکور ہے اور چشمۂ معرفت میں بھی اجمالی طور پر یہ مضمون بیان ہوا ہے
کیونکہ اس جگہ بھی اسی آیت کو پیش کر کے ایمانداروں کی اقسام ہی بیان
ہوئی ہیں۔ چنانچہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ اس آیت کی تفسیر میں اس جگہ

تحریر فرماتے ہیں :-

"یعنی ایماندار تین قسم کے ہیں۔ اوّل وہ جو ظالم ہیں، یعنی انواع واقسام کے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور گناہ کا پلّہ ان کا بھاری ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ جو میانہ رَو ہیں یعنی کچھ تو گناہ کرتے ہیں اور کچھ نیک اعمال۔ اور دونو حالتوں میں مساوی ہوتے ہیں۔ اور تیسرے درجہ کے وہ لوگ ہیں، جو عمدہ اخلاق اور عمدہ اعمال میں سبقت لے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ جو صدرِ اسلام کا وقت تھا۔ اس زمانہ پر ایک وسیع نظر ڈال کر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے کیونکر ایمان لانے والوں کو مذکورہ بالا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچا دیا ؟"

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۲۴)

البتہ براہین احمدیہ میں اس آیت سے جو مضمون اخذ کیا گیا ہے وہ بطور عبارۃ النص نہیں بلکہ بطور اقتضاء النص ہے۔ کیونکہ جب پہلے درجے کے مومنوں کے متعلق یہ ثابت ہو گیا کہ وہ گناہوں کی زندگی کے دباؤ کے نیچے ہوتے ہیں اور جبر و اکراہ اور مجاہدات شاقہ سے کسر نفس کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات سے بطور اقتضاء النص ثابت ہوتا ہے کہ حالت کفر میں قوائے بہیمیہ یا غضبیہ کا اُن پر پورے طور پر غلبہ تھا۔ اور وہ اولٰئک کالانعام کے ہی مصداق تھے ایسے لوگوں کے متعلق ہی حضرت

بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے براہین احمدیہ میں آگے لکھا ہے کہ وہ۔

"ان کا نورِ قلب نہایت ضعیف ہوتا ہے اور عقل بھی ضعیف، اور قوتِ بہیمیہ غالب اور نفس طالب۔"

اور آگے فرماتے ہیں:۔

"سو اس طور کی طبیعتیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں جن کا وجود روزمرہ کے مشاہدات سے ثابت ہے ان کے نفس کا شورش اور اشتعال جو فطرتی ہے کم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو خدا نے لگا دیا، اسکو کون دور کرے۔ ہاں خدا نے ان کا ایک علاج بھی رکھا وہ کیا ہے؟ توبہ و استغفار اور ندامت۔ یعنی جبکہ بُرا فعل جو ان کے نفس کا تقاضا ہے ان سے صادر ہو یا حسبِ خاصۂ فطرت کوئی بُرا خیال دل میں آئے تو اگر وہ توبہ اور استغفار سے اس کا تدارک چاہیں تو خدا اس گناہ کو معاف کر دیتا ہے اور جب وہ بار بار ٹھوکر کھانے سے بار بار نادم اور تائب ہوں تو وہ ندامت اور توبہ اس آلودگی کو دھو ڈالتی ہے۔ یہی حقیقی کفّارہ ہے جو اس فطرتی گناہ کا علاج ہے اسی کی طرف اللہ تعالےٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ ومن یعمل سوءً ا او یظلم نفسہ ثم یستغفر اللّٰہ یجد اللّٰہ غفورًا رحیمًا (الجزو ۵) یعنی جس سے کوئی بدعمل ہو جائے یا اپنے نفس پر کسی نوع کا ظلم کرے پھر پشیمان ہو کر خدا سے معافی چاہے تو وہ خدا کو غفور رحیم

پائے گا۔" (براہین احمدیہ صفحہ ۱۶۳ و ۱۶۴، طبع اوّل)
اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ توبہ اور ندامت کے مجاہدہ سے گناہ کی آلودگی سے بچ جانے کا مضمون براہین احمدیہ میں بھی مذکور ہے۔ براہین احمدیہ میں مقصود اصلی اس سوال کا جواب دینا تھا کہ:۔

"جب توحید الٰہی اور پرستش الٰہی سب بنی آدم کے لئے فطرتی امر ہوا (جیسا کہ اس سے پہلے بیان کردہ آیات سے ثابت ہے۔ ناقل) اور کوئی آدمی سرکشی اور بے ایمانی کے لئے پیدا نہ کیا گیا۔ تو پھر جو امور برخلاف خدا دانی اور خدا ترسی ہوں کیونکر فطرتی امور ہو سکتے ہیں۔" (براہین احمدیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲ طبع اوّل)

اس سوال کے جواب میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے آیت منھم ظالمٌ لنفسہٖ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات باذن اللہ سے بطور اقتضاء النص ایک مضمون اخذ کیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"یہ شبہ صرف ایک صداقت کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ وہ امر جو آیاتِ مندرجہ بالا سے ثابت ہوتا ہے وہ تو صرف اسی قدر ہے کہ انسان کی فطرت میں رجوع الی اللہ اور اقرارِ وحدانیت کا تخم بویا گیا۔ یہ کہاں آیات موصوفہ میں لکھا ہے کہ وہ تخم ہر ایک فطرت میں مساوی ہے۔ بلکہ جا بجا قرآن شریف میں اسی بات کی تصریح ہے کہ وہ تخم بنی آدم میں متفاوت المراتب

کسی میں نہایت کم کسی میں متوسط کسی میں نہایت زیادہ جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے۔ ومنھم ظالم لنفسہٖ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات (الجزو ۲۲) یعنی بنی آدم کی فطرتیں مختلف ہیں بعض لوگ ظالم ہیں جن کے نورِ فطرتی کو قوائے بہیمیہ یا غضبیہ نے دبایا ہوا ہے بعض درمیانی حالت میں ہیں۔ بعض رجوع الی اللہ میں سبقت لے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض کی نسبت فرمایا واجتبیناھم (الجزو ۷) اور ہم نے ان کو چن لیا۔ یعنی وہ باعتبار اپنی فطرتی قوتوں کے دوسروں میں سے چیدہ اور برگزیدہ تھے اس لئے قابلِ رسالت و نبوت ٹھہرے۔ اور بعض کی نسبت فرمایا۔ اولٰئک کالانعام (الجزو ۹) یعنی ایسے ہیں جیسے چارپائے اور نورِ فطرتی ان کا اس قدر کم ہے کہ ان میں اور مویشی میں کچھ تھوڑا ہی فرق ہے۔"

(براہین احمدیہ صـ۱۶۷ حاشیہ طبع اوّل)

جب سیاقِ آیت سے حسب بیان دافع الوساوس اور چشمہ معرفت یہ تینوں قسم کے لوگ عبارۃ النص کی رُو سے ایماندار قرار دیئے گئے ہیں کو ان کے مراتب میں تفاوت ہے تو اس تفاوتِ مراتب سے صراحتاً ظاہر ہے کہ اس عبارت سے بطور اقتضاء النص یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ تمام نبی نوعِ انسان بھی اپنی فطرت میں ضرور متفاوت المراتب ہیں۔

اسی لئے تو ایمانداروں کے مدارج میں بھی تفاوت موجود رہتا ہے۔ خود رسول کریمؐ نے فرمایا۔ خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام کہ جو لوگ جاہلیت کے زمانہ میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں۔

ہمارے اس بیان سے ظاہر ہے کہ براہین احمدیہ اور دافع الوساوس اور چشمۂ معرفت میں درحقیقت کوئی تناقض اور تضاد موجود نہیں۔ بلکہ تینوں کتابوں کے مضامین میں صرف اجمال وتفصیل اور عبارۃ النص اور اقتضاء النص کا فرق ملحوظ ہے۔ اور کسی عبارۃ النص سے بطور اقتضاء النص کسی مضمون کا اخذ کرنا تضاد وتناقض کا موجب نہیں ہوتا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے۔ دافع الوساوس کے مضمون کے مطابق پہلی قسم کے مومن جو ظالم لنفسہٖ قرار دیئے گئے ہیں۔ اور جنہیں مورد فضل الٰہی قرار دے کر قرآن میں جنتی بھی قرار دیا گیا ہے۔ اُن کے گنہگار ہونے کا دافع الوساوس میں انکار نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ جبر واکراہ اور مجاہدات شاقہ سے نفس کی سرکشی کو توڑنے والے ہوتے ہیں اور یہی مضمون براہین احمدیہ میں توبہ اور ندامت کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ توبہ وندامت بہت بڑا مجاہدہ ہے جو نفس کی سرکشی کو توڑ دیتا ہے۔ اور ادنیٰ کو اعلیٰ بنا کر متقیوں کا سردار بنا دیتا ہے۔ پس ان لوگوں میں جو پہلے درجہ کے مومن ہیں گناہ کی صورت میں بھی ظلم لنفسہٖ ان میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ اور

نفس پر جبر و اکراہ کی صورت میں بھی ظالم لنفسہٖ ان میں پایا جاتا ہے
گویا گناہ کی حالت ظالم لنفسہٖ کی دوسری حالت ہے جو مجاہدات
شاقہ کی صورت میں ہے۔ ان کے وجود میں اکٹھی ہو جاتی ہے اور جو اصداد
متضاد اور متناقض ہوں۔ وہ تو بیک وقت ایک وجود میں جمع نہیں
ہو سکتے۔ پس پہلے درجہ کے مومنوں کا دو نو معنوں اور صورتوں میں
ظالم لنفسہٖ ہونا دافع الوساوس کے مضمون سے ظاہر ہے۔ پس
ظالم لنفسہٖ کے دوسرے معنے یا صورت یعنی نفس پر جبر و اکراہ
کر کے اسے نیکی کی طرف لگانا ظلم کے محمود معنی ہیں اور ظلم کے ان معنوں کے
ساتھ جو گناہ کا مفہوم رکھتے ہیں جمع ہو گئے تو تضاد اور تناقض نہ رہا۔
ہاں آیت زیر بحث میں ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا
من عبادنا کی رُو سے یہ پہلے درجے کے مومن بھی ایک قسم کے مصطفےٰ
یعنی ایک قسم کے برگزیدہ قرار دیئے گئے ہیں۔ گو ابھی ان کے گناہ کا پلڑا
بھاری ہے۔ پس تینوں کتابوں کی عبارتوں میں کوئی تناقض اور تضاد
موجود نہیں۔ ہاں کافر اور مشرک کو دوسرے معنوں کی صورت میں
حسب بیان دافع الوساوس ظالم لنفسہٖ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کافر
اور مشرک تو گنہگار اور سرکش ہونے کے مفہوم میں ہی ظالم لنفسہٖ
قرار پا سکتے ہیں۔ جو ظلم کے مذموم معنی ہیں۔ فتدبّر ما

۸- یاجوج ماجوج اور فتنۂ عیسائیت

آپ کا اعتراض یہ تھا کہ یاجوج ماجوج کو حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے دو قومیں قرار دیا اور اس سے انگریز اور رُوس مراد لئے ہیں۔ اور پھر خطبہ الہامیہ میں انہیں نصاریٰ کہہ دیا۔

ہم نے آپ کو جواباً لکھا تھا کہ :-

"یاجوج۔ ماجوج اور دجّال، فتنہ عیسائیت ہونے کی وجہ سے ایک ہی قوم کے حکم میں ہیں۔ لیکن حقیقتاً دو قومیں ہیں"۔ جب ہمارے اس فقرے میں کوئی تضاد نہیں تو اگر مسیح موعود علیہ السلام کے دو فقروں سے ہم یہ مراد ثابت کردیں کہ یاجوج ماجوج حقیقتاً تو روس اور انگریز یورپ کی قومیں ہیں لیکن مذہباً وہ نصاریٰ ہیں تو تناقض کیا ہوا۔ کیا دو قوموں کا مذہب ایک نہیں ہو سکتا؟ اور مذہباً وہ ایک قوم کے حکم میں نہیں بن جاتیں؟ دیکھئے اسلام میں کئی قومیں داخل ہوتی ہیں۔ جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو الگ الگ قومیں ہیں لیکن مذہب کے لحاظ سے ایک ہی قوم ہیں۔ یہی حال روس اور برطانیہ کا تھا۔ یہ دو قومیں یاجوج ماجوج کہلاتی تھیں گو ان کا باوا آدم ایک ہی ہے۔ لیکن اکثریت کا مذہب بھی ان میں عیسائیت تھا۔ اور مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں تو یہ اکثر عیسائی ہی تھے۔ عیسائیت کو روس نے بعد میں چھوڑ دیا ہے۔ کیا آپ اس بات سے ناواقف محض ہیں کہ زارِ روس

عیسائی بادشاہ تھا۔ کیونکہ آپ ہم سے تاریخی ثبوت مانگ رہے ہیں کہ ان کا عیسائی ہونا ثابت کرو۔ پہلے تاریخ پڑھیں اور زارِ روس کا مذہب معلوم کریں کہ کیا تھا۔ تناقض تو اسی بات سے رفع ہو گیا کہ یہ دو قومیں حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ میں مذہبًا عیسائی تھیں۔ تناقض تب ثابت ہو سکتا جب آپ یہ ثابت کرتے کہ روسی شروع سے دہریہ چلے آ رہے تھے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دہریوں کو عیسائی لکھ دیا۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین!

باقی یہ بات تو ہم نے زائد لکھی ہے کہ اس وقت دو بلاک بنے ہوئے ہیں۔ تطبیق تو پہلی بات سے ہی ہو جاتی ہے کہ مسیح موعودؑ کے زمانہ میں یہ دو نو قومیں عیسائی تھیں۔

انجیل کی رُو سے قسم کھانا

آپ نے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی تین عبارتیں پیش کر کے انجیل کی رُو سے قسم کھانے کے متعلق تناقض دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اور سوال کیا تھا کہ

"عیسائی مذہب میں یعنی انجیل کی رو سے قسم کھانا جائز ہے یا ناجائز؟ آتھم فیصلہ کے لئے قسم کھانے سے انکار کر کے انجیل پر عمل کر رہا تھا یا اس کے خلاف؟"

ہم نے جواب میں لکھا تھا کہ حضرت مسیح موعودؑ کی زندگی میں عیسائی چونکہ

قسم کھانے کو ممنوع قرار دیتے تھے۔ اس لئے آپ نے ایک جگہ ان کے خیال کے پیش نظر قسم کے بارے میں قرآن کریم کی فضیلت بیان کی ہے۔ ورنہ درحقیقت انجیل کا مقصد بھی قسم کھانے سے منع کرنا نہ تھا۔۔۔۔۔ انجیل کی رُو سے قسم کا منع ہونا نصارٰی کی غلط خیالی کی بناء پر ہے۔ ورنہ ضرورتِ حقہ کی صورت میں انجیل کی رُو سے قسم کھانا جائز ہے۔ دونو بیانوں کی وجوہ اور شرائط مختلف ہیں" یہ ہمارے جواب کا خلاصہ ہے جو آپ کو دیا گیا تھا۔ اب آپ کا سوال یہ رہ گیا ہے کہ:۔

"اگر حقیقت یہی ہے جو آپ نے بیان کی ہے تو پھر عبداللہ آتھم سچا تھا۔ اور اس کا قسم کھانے سے انکار ایک جھوٹا عذر نہیں تھا۔ بلکہ اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق تھا۔ اگرچہ وہ مذہبی عقیدہ بذاتِ خود نصارٰی کی غلط بیانی پر مبنی ہے"

جنابِ من! ہمارا سارا بیان پڑھنے کے بعد آپ کا عبداللہ آتھم کو قسم نہ کھانے میں معذور جاننا ایک بے معنی بات ہے۔ کیونکہ اس کے مقابل پر حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ خود حضرت مسیحؑ اور پولوس اور پطرس نے قسمیں کھائیں جس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے اہم معاملات میں قسم کھانے کو جائز سمجھا ہے۔ مطلقاً حرام نہیں سمجھا۔ لہذا عبداللہ آتھم کے عقیدہ کی اس کے مسلّمہ بزرگوں کے عمل سے تغلیط ہو چکی تھی۔ بلکہ آپ نے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ خود اس نے بھی سرکاری عہدہ لینے کے وقت قسم کھائی۔ لیکن جنابِ من!

آپ عجیب ہیں کہ عیسائی کی حمایت پر کمر بستہ ہیں جس کا اسلام سے مقابلہ تھا۔ اور ان امور کی موجودگی میں آپ اُس کے عذر کو صحیح قرار دے رہے ہیں خواہ اسلام کو شکست ہو جائے۔

(۷) آپ کا حضرت بانی سلسلہ احمدیہ پر بددیانتی کا الزام جو آپ کے اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے: "کیا دیانت اور ایمانداری کا یہی تقاضا ہے کہ قرآن مجید کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے انجیل کی طرف ایک نقص منسوب کیا جائے جس کے تعلق معلوم بھی ہے کہ وہ نقص حقیقت میں انجیل میں موجود نہیں۔" جناب من! آپ بحث کے میدان میں نئے نئے اُترے ہیں۔ اس لئے آپ اس حقیقت سے نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ کہ الزامی جواب کس کس طرح دیئے جاتے ہیں۔ کیا آپ دلیل خطابی سے ناواقف ہیں اور اس کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ایسی دلیل کو قرآن کریم نے بھی استعمال کیا ہے۔ فرمایا: "قل ان کان للرحمٰن ولدٌ فأنا اول العابدین"۔ کہ ان لوگوں کو کہدو کہ اگر رحمان کا کوئی بیٹا ہے تو میں سب سے پہلے اس کا عبادت گذار ہوں اب یہ الزام خصم ہی ہے۔ پھر أفائن مات او قتل کی آیت میں قتل کو فرض کر کے دلیل بنایا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے اپنے وعدہ واللہ یعصمک من الناس کے مطابق آپ کا قتل محال تھا۔ اب وہ شخص قابلِ تعجب ہی ہو سکتا ہے جو اس خطابی یا فرضی دلیل کے استعمال کرنے پر بددیانتی کا الزام تلاش کرنے کی کوشش کرے۔

ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا ہے حضرت مولوی عبد العزیز شاہ صاحب کو محرّم کے ایام میں ایک پادری ملا۔ اُس نے حضرت شاہ صاحب سے سوال کیا کہ جب یزید کی فوجیں امام حسینؓ کو قتل کرنے لگی تھیں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پاس کیوں نہ گئے اور جا کر کیوں فریاد نہ کی کہ میرے نواسہ کو بچایا جائے۔ پادری صاحب کو حضرت شاہ صاحب نے یہ جواب دیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے دربار میں گئے تو دیکھا کہ خدا رو رہا ہے۔ پوچھا۔ باری تعالےٰ کیا بات ہے کہ آپ رو رہے ہیں۔ خدا نے فرمایا کہ تم تو اپنے نواسے کو بچانے کے لیئے آئے ہو اور میرے بیٹے کو یہودیوں نے پکڑ کر صلیب پر مار دیا ہے۔

اب دیکھ لیجئے یہ خطابی دلیل ہے نہ کہ حضرت شاہ صاحب کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ مسیحؑ صلیب پر مرا۔ نہ خدا نے ایسا فرمایا۔ کہ مسیحؑ نے صلیب پر جان دے دی۔ اس لئے عیسائیوں کے عقیدہ کی رُو سے ان کو ملزم کیا گیا ہے۔

۹۔ دُوسرے مثیلِ مسیح

آپ نے اپنی پہلی چٹھی میں اور مثیلِ مسیح ہو سکنے کے امکان کے لئے تین حوالے پیش کئے تھے اور سوال کیا تھا کہ

"مرزا صاحب کے بعد اُن جیسا مثیلِ مسیح آنا ممکن ہے یا نہیں؟ پہلی عبارت کا ممکن ابھی قائم ہے یا نہیں۔ یا یہ عبارت منسوخ

ہو چکی ہے۔ آپ کے سوال کا یہ پہلو بھی ہے مثیل مسیح کا آنا اگر بالکل ممکن نہیں تو یہ عبارت عدالت میں کیوں پیش کی گئی؟"

ہماری طرف سے آپ کو یہ جواب دیا گیا تھا کہ اس زمانہ میں مسیح موعودؑ بانیٔ سلسلہ احمدیہ ہی ہیں۔ ازالہ اوہام کی عبارت کی رُو سے مثیل مسیح اس کے بعد بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اصالتاً نہیں آ سکتے۔ یہ بھی ازالہ اوہام میں مذکور ہے۔ خطبہ الہامیہ میں بھی آپ نے ایسے مسیح کے آنے کی نفی کی ہے۔ جو مسلمانوں کا خیالی اور فرضی مسیح ہے جس کو زندہ سمجھا گیا اور اصالتاً اس کا آسمان سے اُترنا مانا جاتا ہے۔ ازالہ اوہام پڑھ کر دیکھیں اس کی نفی ازالہ اوہام میں بھی موجود ہے۔ آئندہ کے لئے مطلق مثیلِ مسیح کے آنے کے امکان کی خطبہ الہامیہ میں نفی نہیں کی گئی۔ کیونکہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے اس کے بعد لیکچر سیالکوٹ میں فرمایا ہے:۔

"اس (مسیح موعود۔ ناقل) کے بعد کوئی امام نہیں اور نہ کوئی مسیح مگر وہ جو اس کے لئے بطور ظِلّ کے ہو"۔

(لیکچر سیالکوٹ ص۔ روحانی خزائن جلد ۲۰ ص۲۰۸)

اس کے بعد آپ کے سوالات کے خلاصہ کا جواب نمبر وار یوں دیا گیا:۔

(۱) کوئی اور مثیلِ مسیح آ سکتا ہے۔ یعنی اس کا امکان موجود ہے (۲) کوئی عبارت مذکورہ عبارتوں میں سے منسوخ نہیں۔ (۳) عدالت میں اس لئے پیش کی گئی کہ ہم امکان کو مانتے ہیں۔

پس آپ کے سارے سوالوں کا جواب دے دیا گیا تھا لیکن اب آپ "میں نہ مانوں" کی ضرب المثل پر عمل کر رہے ہیں اور کشف الغطاء سے اپنے پیش کردہ ادھورے اقتباس سے یہ نتیجہ نکال رہے ہیں۔ کہ یہ عبارت اور خطبہ الہامیہ سے پیش کردہ عبارت ازالہ اوہام کی عبارت سے مختلف اور اس سے متناقض ہے۔

واضح رہے کہ کشف الغطاء کی عبارت کا تعلق اپنے مسیح موعود ہونے سے ہے۔ اس عبارت میں آپ نے اپنے آپ کو غربت مسکینی اور حلم اور غیروں کی حکومت کے ماتحت ہونے میں اس عیسیٰ علیہ السلام کا مثیل قرار دیا ہے جن کے متعلق اس جگہ لکھا ہے کہ وہ سری نگر کے محلہ خانیار میں مدفون ہیں۔

آپ کے مخالف علماء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ جانتے ہیں۔ اور اس کا ایسے مہدیؑ کے زمانہ میں آنا مانتے ہیں جو اس مہدی کے ساتھ مل کر مخالفین اسلام سے لڑائیاں کرے گا۔ مگر حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے ان خیالات کو لغو، باطل اور جھوٹ قرار دیا ہے۔ اور ایسے مہدی کے وجود کو بھی ایک فرضی قرار دیا ہے۔ اور ایسی روایتوں کو بناوٹی اور بے اثر قرار دے کر آگے لکھا ہے :۔

"صحیح اور راست حرف اس قدر ہے کہ ایک شخص عیسیٰ کے نام پر آنے والا بیان کیا گیا ہے جو نہ لڑے گا نہ خون کرے گا۔ اور غربت اور مسکینی اور حلم اور براہین شافیہ سے دلوں کو

حق کی طرف پھیرے گا۔ سو خدا نے کھلے کھلے کلام اور نشانوں
کے ساتھ مجھے خبر دی ہے کہ وہ شخص تو ہی ہے ۔۔۔۔۔۔ اور
یہ میرا عقیدہ کہ کوئی خونی مہدی دنیا میں آنے والا نہیں تمام
مسلمانوں سے الگ عقیدہ ہے"

اس عبارت میں صحیح بخاری کی حدیثوں کے مسیح موعود کا ذکر ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ان حدیثوں کا مصداق صرف آپ ہی ہیں جو امت میں سے امت کے امام بھی ہیں اور حکم و عدل بھی۔ مگر یضع الحرب کے مصداق ہیں۔ اور ظہور بھی آپ کا اُس وقت ہوا جبکہ صلیب دُنیا میں غلبہ پا چکی تھی۔ اسی موعود کے متعلق خطبہ الہامیہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"پس میرے سوا دوسرے مسیح کے لئے میرے زمانہ کے بعد قدم
رکھنے کی جگہ نہیں"

اور اس دوسرے مسیح کے الفاظ سے مراد اس جگہ مسلمانوں کا فرضی اور خیالی مسیح ہی ہے۔ چنانچہ آپ آگے فرماتے ہیں:۔

"پس مَیں صاحبِ زمان موعود ہوں میرے بعد کوئی زمانہ نہیں"

مراد یہ ہے کہ اس فرضی اور خیالی مسیح کے آنے کا میرے بعد کوئی زمانہ نہیں کیونکہ صاحبِ زمان موعود مَیں ہی ہوں پس یہ ہر دو عبارتیں آپ کے بعد صرف عیسٰی ابن مریم کے اصالتاً آنے کو ممتنع قرار دے رہی ہیں نہ کہ کسی اور مثیل مسیح کے آنے کی جو صاحب حکومت بھی ہو یا بغیر حکومت کے ہو۔ کیونکہ لیکچر سیالکوٹ کی عبارت ان سب عبارتوں کے بعد کی ہے

اور اس عبارت میں آپ کے ظل کے آنے کا امکان تسلیم کیا گیا ہے لہذا اگر کوئی صاحبِ حکومت، مثیلِ مسیح بھی آئے تو اس کے لئے آپ کا وجود بطور اصل کے ہوگا۔ اور اس کا وجود آپ کے مقابلہ میں بطور ظل کے خواہ ایسا مسیح ایک آئے یا ایک سے زیادہ آئیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ان عبارتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ صرف آپ کا قصور فہم ہے آپ کے سوالوں کا الگ الگ جواب یہ ہے:-

۱۔ حضرت مرزا صاحب نہ پہلے مثیلِ مسیح ہیں نہ آخری۔

۲۔ حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ سے پہلے کئی دجاجلہ گذرے ہیں مگر الدجّال یعنی دجالِ اکبر آپ کے زمانہ میں ہی ظاہر ہوا۔

۳۔ ہمیں یقینی اور تفصیلی علم ان دجاجلہ کے بارہ میں نہیں۔ تیس (۳۰) دجالوں کے آنے کا مطلب کئی ملمع سازوں کا ظہور ہے۔

۴۔ مسیح موعودؑ کے زمانہ میں دجالِ اکبر کی شکست مقدّر ہے۔ اس کے بعد پھر بھی کسی دجال کے کسی وقت ظہور کا امکان ہے۔

فائدہ:- یہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کا آپ لوگوں پر احسان ہے کہ انہوں نے ایسے مسیح کی آمد کی بھی گنجائش از روئے حدیث جائز رکھی ہے جو صاحبِ حکومت ہو۔ اس سے آپ کو چاہیئے تو یہ کہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کو صحیح بخاری کی حدیثوں کا موعود مسیح مان لیں، جس نے غربت، مسکینی، حلم اور دلائل شافیہ کے ساتھ دلوں کو حق کی طرف پھیرنا تھا۔ اور یہ بات بھی تسلیم کر لیں کہ آسمان سے

کوئی مسیح اصالتاً نہیں اُترے گا۔ ورنہ حیاتِ مسیح ثابت کریں۔ جو
آپ کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ آیت فلما توفیتنی کنت
انت الرقیب علیھم کو ماضی کا بیان لیں یا مستقبل کا ہر دو[۲]
صورتوں میں یہ بیان حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی وفات پر نص صریح ہے
اور توفیتنی کی تاویل رفعتنی الی السماء کرنے کا آپ کو حق نہیں
جب تک رفع الی اللہ کے معنی باعزت وفات پانا نہ لیں۔ کیونکہ
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی بیان اپنی وفات کے حق
میں دیا ہے۔ نہ کہ اپنے جسمانی رفع الی السماء کے حق میں۔ یہ بھی یاد رہے
کہ محققین میں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمۃ
اپنی کتاب "تاویل الاحادیث" میں حضرت مسیح کا رفع الی السماء
ہیئتِ مثالیہ میں تسلیم کرتے ہیں۔ گویا جسمانی رفع تسلیم نہیں کیا اور
مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بل رفعہ اللہ الیہ کی آیت میں
مسیح کے رفع جسمانی کی صراحت سے منکر ہیں۔ اور دوسری جگہ ان کی
وفات کو فرض کرنے کی صورت میں ان کا دوبارہ زندہ ہو کر آنا قرار
دیتے ہیں۔ (رسالہ ختم نبوت از مودودی صاحب) حالانکہ قرآن مجید
کا فیصلہ ہے کہ جو وفات پا جائے۔ وہ اس دنیا میں واپس نہیں بھیجا
جاتا۔ جب آیت فَیُمْسِكُ الَّتِی قضی علیھا الموت و
یُرسل الاُخریٰ۔ (زمر ۴۲) پس ہم شاہ صاحب (حضرت شاہ
ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ) کے بیان کو صحیح جانتے ہیں۔ کہ حضرت عیسےٰ

کا رفع حیثیت مثالیہ میں ہوا۔ لہذا ہمارے نزدیک نزول کی حدیثوں میں بھی تمثیلی نزول ہی مراد ہے۔ اور چونکہ مسیح موسوی، غربت، مسکینی اور حلم اور دلائل شافیہ کے ساتھ لوگوں کو حق کی طرف پھیرنے کے لئے آیا تھا اس لئے ضروری تھا کہ موعود مسیح محمدی بھی اسی رنگ میں آتا۔ اسی لئے حدیث نبوی میں اس آنے والے مسیح کے لئے یضع الحرب کے الفاظ وارد ہیں اور بعض حدیثوں میں یضع الجزیۃ، جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ وہ لڑائی کرے اور جزیہ لے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

مسیح کے دو حلیے

صحیح بخاری میں دو حدیثیں ہیں۔ جن میں سے ایک حدیث میں آنحضرت نے مسیح ابن مریم کو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس حدیث میں مسیح کا حلیہ اَحمر، جعدٌ بیان ہوا ہے۔ یعنی سرخ رنگ کا گھنگھریالے بالوں والا۔ اور دوسری حدیث میں مسیح کو خانۂ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور اس کا حلیہ اٰدمُ سبطُ الشَّعَرِ بیان فرمایا۔ یعنی گندمی رنگ کا، لٹکتے بالوں والا، اس کے ساتھ ہی دجال کو بھی طواف کرتے دیکھا۔ پس پہلا حلیہ مسیح ناصری کا ہے۔ اور دوسرا حلیہ مسیح محمدی کا۔ یہ دونوں شخص ایک نہیں ہو سکتے۔ لہذا نزول مسیح ابن مریم کی پیشگوئی کا تعلق اُمّت محمدیہ ہی کے کسی فرد سے قرار پاتا ہے۔

ایسی پیشگوئیوں کے متعلق محققین علماء کا طریق یہ ہے کہ پیشگوئی کی تعبیر

کو خدا تعالیٰ کے حوالے کریں۔ اور اس پر اجمالی ایمان رکھیں۔ چنانچہ تفسیر خازن میں بھی زیر آیت وَ اُخَرُ مُتَشَابِهَات، نزول مسیحؑ اور خروج دجال کے مسئلہ کو ان متشابہات میں سے قرار دیا گیا ہے۔ جن کی حقیقت مفوض الی اللہ ہوتی ہے۔ اب جبکہ مسیح موعود علیہ السلام کا ظہور ہو گیا ہے تو پیشگوئی کی اصل حقیقت کھل گئی ہے۔

جناب مولوی مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد ۲ ص۵۳۲ حاشیہ نمبر ۱۹ میں قرآن مجید کی آیت والذین یدعون من دون اللّٰہ لایخلقون شیئًا وھم یُخلقون۔ اموات غیر احیاء وما یشعرون ایّان یُبعثون (نحل ع ۲) کا ترجمہ درج کر کے لکھتے ہیں۔

"لامحالہ اس آیت میں الذین یدعون من دون اللّٰہ سے مراد وہ انبیاء اولیاء شہداء اور صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں۔۔۔۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا کہ عرب کے متعدد قبائل۔۔۔۔۔۔۔ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیاء اور اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ آیت میں ان سب کو جن کی عیسائی اور یہودی پرستش کرتے تھے مُردہ ہیں نہ کہ زندہ قرار دیا گیا ہے۔"

دراصل اس آیت کی روشنی میں مودودی صاحب حضرت مسیح علیہ السلام کی

وفات کے ہی قائل ہیں۔ اور ان کے نزول کی پیشگوئی کو ختم نبوت کے رسالہ میں اسی مفہوم میں سمجھتے ہیں۔ کہ وہ دوبارہ زندہ ہو کر آجائیں گے جب وفات ان کی زمین پر ہو گئی تو نزول کا لفظ مؤول ہو گیا۔ اور نواس بن سمعان والی حدیث میں بھی مسیح کے دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے دمشق کے مینارہ کے پاس نزول کا مسئلہ تاویل طلب بن گیا۔ مگر وفات یافتہ کا اس دنیا میں واپس آنا حسب آیت قرآنیہ فیمسك التی قضیٰ علیہا الموت محال ہے۔ پس یہ آیت بھی وفات مسیح پر روشن دلیل ہے۔

مودودی صاحب کی یہ عبارت بھی آپ کے سامنے رہے :-

"اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لاحاصل ہے کہ وہ (یعنی عیسیٰ۔ ناقل) وفات پا چکے یا زندہ موجود ہیں۔ بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کر کے اُٹھا لانے پر قادر ہے"

(رسالہ ختم نبوت صـ۵۴ـ)

کیا یہ مضمون ابہام پر مشتمل نہیں ؟

"تیس ۳۰ دجال اور تیس مسیح کے متعلق آپ کا جو سوال ہے اس کے متعلق واضح رہے کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام امّتِ محمدیہ کے ایسے مثیل مسیح ہیں۔ جن کے زمانہ میں دجالِ اکبر ظاہر ہوا۔ ویسے مثیل مسیح اور دجاجلہ پہلے بھی ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں :-

صد ہزاراں یوسفے بینم درایں چاہِ ذقن

واں مسیحِ ناصری شد از دمِ او بے شمار

حدیثِ نبوی انی قد اخرجت عباداً لی لا یدان لاحد بقتالہم کا تعلق حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے زمانہ سے ہی ہے۔ چشمۂ معرفت میں حضرت مسیح موعودؑ نے ان لوگوں کو یورپ کی قومیں ہی قرار دیا ہے۔ جن کے ساتھ کسی کو جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ اس عبارت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ آئندہ کوئی مثیل مسیح نہیں ہو سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نام خاتم الخلفاء سے آپ کا یہ استدلال درست نہیں کہ آپ کا ظل بھی نہیں آسکتا۔ بلکہ جس طرح خاتم النبیین کا ظل آسکتا تھا۔ اور مسیح موعودؑ خاتم الخلفاء ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ظل ہیں۔ اسی طرح آپ کی ظلیت میں آپ کے خلفاء بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعد خلافت کا سلسلہ آپ کی ظلیت میں ہی قائم ہوا۔ اور آپ نے اپنے ایک موعود لڑکے کے متعلق سبز اشتہار میں اپنے خلیفہ اور جانشین ہونے کی خبر بھی دی ہے اور اُسے آپ کے الہام میں مسیحی نفس بھی قرار دیا گیا ہے۔

اگر آئندہ کسی مثیل مسیح کے زمانہ میں اُسے جنگ کرنے کی نوبت آئی تو وہ بھی آپ کا ظل ہی ہوگا۔ اور جنگ کا جواز قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین

کے مطابق ہوگا۔

ایک طعن کا جواب

آپ کے اس طعن کا جواب کہ آیت ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ کی تفسیر میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ اور صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے بیانات میں "تناقض ہے" کا جواب ہم نے دیدیا تھا کہ سطحی نظر سے جو اختلاف نظر آتا ہے۔ درحقیقت اس کی جہت الگ الگ ہے۔ ہمارے جواب کو پھر غور سے پڑھیں۔ ہم تو اُمتی کی تعریف یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے نبی متبوع کی پیروی سے کمال اور مقام فضیلت حاصل کرتا ہے۔ اس لئے مستقل نبی اُمتی نہیں کہلا سکتا۔

جناب من! حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے نزدیک اُمتی نبی تھے مستقل نبی نہیں تھے۔ مگر ہمارے نزدیک وہ مستقل نبی تھے کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی سے مقام نبوت حاصل نہیں کیا تھا۔ پس ہمیں آپ سے اُمتی نبی کی تعریف میں اختلاف ہے آپ نے لکھا ہے کہ ہم نے وجہ تطبیق خور و فکر سے ایجاد کی ہے۔ لیکن آگے آپ کو یہ ماننا پڑ گیا ہے کہ یہ آیت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد میں روک قرار دی ہے۔ بدیں وجہ کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مطیع اور اُمتی نہیں ہو سکتے۔ اُمتی اسی لئے نہیں ہو سکتے کہ وہ مستقل نبی تھے۔ اور ما ارسلنا والی آیت کے حکم میں داخل تھے۔ جس کا صریح تعلق زمانہ ماضی کے نبیوں سے ہے۔

جن سب کو امت نے اصالتاً نبی مانا ہے۔یعنی مستقل نبی۔پس مسیح موعودؑ کے استدلال کا ماحصل یہ ہوا کہ اس آیت میں جو انبیاء سابقین سے متعلق ہے تمام انبیائے سابقین کسی دوسرے نبی کے امتی نہ تھے۔یہ درست ہے کہ ازالہ اوہام کے زمانہ میں آپ نے اپنے آپ کو مرسلین میں سے محدث قرار دیا ہے جو امتی بھی ہوتا ہے۔اور ناقص طور پر نبی بھی۔یعنی وہ مستقل نبی نہیں ہوتا۔پس ہمارا یہ لکھنا آپ نے درست تسلیم کر لیا ہے کہ اس عبارت میں مطیع اور تابع کا لفظ اُمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور چونکہ یہ آیت کسی مستقل نبی کے امتی ہونے میں مانع ہے۔لہذا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اصالتاً آمد ثانی میں بھی روک ہے۔پس غیر احمدی اُمتی کے کامل معنے لے کر حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی اصالتاً آمد ثانی کے قائل نہیں۔کامل امتی کے لئے جب پیروی سے کمالات حاصل کرنا شرط ہے تو جو نبی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے نبی نہ بنا ہو وہ کامل امتی کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بات واضح ہو جانے پر کہ مسیح موعود علیہ السلام کے کلام میں اس آیت کی تفسیر میں یہ استدلال کیا گیا ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی نہیں ہو سکتے۔گویا مطیع اور تابع کا لفظ اس جگہ آپ نے امتی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کوئی نبی امتی نہیں ہوتا۔اور نبی سے مراد مستقل نبی ہے۔

لہذا صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے کلام میں جو حضرت ہارونؑ کے

حضرت موسیٰؑ کے تابع ہونے کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد صرف غیر امتی تابع ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد امتی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خود حضرت مسیح موعودؑ نے حقیقۃ الوحی ص۹۲ کے حاشیہ میں ایک سوال کا یہ جواب دیا ہے:-

"اس جگہ یہ سوال طبعاً ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی امت میں بہت سے نبی گذرے ہیں۔ پس اس حالت میں موسیٰؑ کا افضل ہونا لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس قدر نبی گذرے ہیں ان سب کو خدا نے براہ راست چن لیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کا اس میں کچھ بھی دخل نہیں تھا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک ہارونؑ مستقل نبی تھے۔ جب مستقل نبی تھے تو آپ کے نزدیک وہ حضرت موسیٰؑ کے کامل امتی نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ کامل امتی کے معنے حضرت مسیح موعودؑ کے نزدیک یہ ہیں۔ کہ ہر ایک کمال اسے اپنے نبی متبوع کی پیروی سے ملا ہو۔ آپ ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی کے ص۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"اگر کہو حضرت عیسیٰؑ امتی تو کہلائیں گے مگر نبوت محمدیہ سے ان کو کچھ فیض نہ ہوگا۔ تو اس صورت میں امتی ہونے کی حقیقت ان کے نفس میں سے مفقود ہوگی۔ کیونکہ ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں کہ امتی ہونے کے بجز اس کے اور کوئی معنے نہیں کہ تمام کمال اپنا اتباع کے ذریعہ سے رکھتا ہو۔"

اور یہ ظاہر ہے کہ حقیقۃ الوحی ۱۵۴ کے حاشیہ کے مطابق حضرت موسیٰ کے بعد آنے والے نبیوں کی نبوت کے حصول میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے موسیٰ کی پیروی کا دخل نہیں مانا۔

پس حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ، حضرت مسیح موعودؑ کی ان عبارتوں کی موجودگی میں، ان عبارتوں کے خلاف حضرت ہارونؑ کو تابع بمعنی اُمتی نہیں قرار دے سکتے۔ بہرحال حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے اس بیان کو کہ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بیانات کی روشنی میں ہی سمجھنا پڑے گا۔

اُمتی کے معنی پہلے بزرگوں نے بھی وہی قرار دیئے ہیں جو حضرت مسیح موعودؑ نے بیان فرمائے ہیں۔ "احیاء علوم الدین" میں لکھا ہے کہ:۔

فانّما اُمّتہ من اتبعہٗ .... و بقدر ما سلکت سبیلہٗ فقد اتبعتہٗ فقد صرت من اُمّتہٖ۔ (احیاء علوم الدین جزو ۴ صفحہ ۱۰۳ الباب الثانی فیما عرف من احوال الموتیٰ بالمکاشفۃ)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اُمتی وہی ہے جو آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا متبع ہے۔ اور تو جتنا آپؐ کی راہ پر چلے گا اُتنا ہی آپؐ کی اتباع کی ہوگی اور جس قدر تو نے آپؐ کی اتباع کی ہوگی۔ اسی مقدار میں تو آپ کا اُمتی ہوگا۔

حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ اپنی تحریر مندرجہ تبلیغ ہدایت صفحہ ۳۲۶ پر

خود بھی یہ لکھتے ہیں :-

"عقل خداداد اور تاریخ اور قرآن شریف تینوں شہادت دے رہے ہیں کہ ہر نبی کے لئے نئی شریعت کا لانا ضروری نہیں ہوتا۔ تو اب یہ کہنا کہ چونکہ قرآن شریف کے ساتھ ہی شریعت کا نزول اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ اس لئے اب کوئی نبی نہیں آسکتا۔ ایک سراسر باطل دعویٰ ہے جس کی کچھ بھی حقیقت نہیں "

اسی سیاق کے مطابق آگے وما ارسلنا من رسول الّا لیطاع باذن اللّٰہ سے بھی ان کا یہی ثابت کرنا مقصود ہے کہ ہر نبی مطاعِ مطلق نہیں ہوتا۔ کہ وہ ضرور نئی شریعت ہی لائے۔ بلکہ نبی مطیع یعنی ماتحت بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے ماتحت اور تابع تھے۔ ہاں حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے انہیں امتی نبی نہیں کہا پس وہ مستقل نبی ہی تھے جو امتی نہیں ہوتا۔ مطیع کے لفظ سے اس عبارت میں ایسا نبی ہی مراد ہے جو کسی جدید شریعت کا حامل نہ ہو۔ پس حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے مدِ نظر اسی بات کا جواب ہے کہ ہر نبی ضرور نئی شریعت نہیں لاتا۔ بلکہ بعض انبیاء شارع نبی کے ماتحت بھی ہوتے رہے ہیں۔ لہٰذا وما ارسلنا من رسولٍ الّا لیطاع باذن اللّٰہ سے مطاع یعنی نئی شریعت لانے والا نبی مراد نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ جن کی طرف وہ بھیجا

گیا ہے وہ اس کی اطاعت کریں۔ اور وہ جو کچھ کہے اس کے مطابق چلیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی اس بات سے انکار نہیں کہ رسول، اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں۔ پس مسیح موعودؑ کا استدلال اس آیت سے یہ تھا کہ چونکہ کوئی مستقل نبی امتی نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا امتی ہو کر آنے میں روک ہے۔ کیونکہ کوئی مستقل نبی امتی نہیں ہوتا۔ اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ اس آیت سے صرف اس خیال کو اخذ کرنا بودا خیال قرار دے رہے ہیں۔ کہ کوئی نبی مطیع یعنی تابع اور ماتحت نہیں ہو سکتا بلکہ ہر نبی جدید شریعت لاتا ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد میں روک ثابت کرنا چاہتے ہیں اور صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ اس آیت سے صرف ہر نبی کے شریعت جدیدہ لانے کے خیال کو رد کر رہے ہیں۔ پس چونکہ دونو کا استدلال الگ الگ مدلول کے لئے ہے۔ لہذا دونو کے بیانات میں تناقض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ کا یہ خیال کہ امتی نبی نہیں ہو سکتا صرف محدثیت تک نبوت ناقصہ ہی پا سکتا ہے۔ اجتہادی خیال تھا۔ جسے آپ کی بعد کی عبارتوں نے منسوخ کر دیا ہے۔ گو آپ علی وجہ الکمال محدث اللہ اس اجتہاد کے انکشاف الہٰی سے تبدیلی کے بعد بھی ہیں۔ فافہم۔

بے شک ہم درست سمجھتے ہیں کہ آیت وما ارسلنا من رسول

الّا لیطاع باذن اللہ بصیغہ ماضی میں گذشتہ انبیاء کا ذکر ہے۔
لہذا حضرت مسیح موعودؑ کا اسے آئندہ کے لئے بھی قانون جاننا کہ کوئی امتی
نبی نہیں ہو سکتا۔ محض ایک اجتہادی امر تھا۔ جس میں خطا وقوع میں
آئی اس لئے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا امتی نبی بن کر آنا اس آیت کے
خلاف نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے حق میں استدلال پھر بھی قائم رہتا ہے۔
کیونکہ وہ ما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ کے حکم میں
بہرحال داخل ہیں۔ اور ان کی اصالتاً آمد ثانی کے لئے بوجہ ان کے مستقل
نبی ہونے کے یہ آیت ضرور روک ہے۔ اور ختم نبوت کے منافی ہے نواب
صدیق حسن یا قسطلانی کا قول ہمارے لئے حجت نہیں ہے۔ نواب
صدیق حسن خاں توجج الکرامہ میں علامہ جلال الدین سیوطی کا قول نقل کرتے
ہوئے کہ جو ان کو آمد ثانی میں مسلوب النبوّۃ مانے وہ کافر ہے۔ اس بنا پر
نواب صاحب انہیں علیٰ حالہٖ نبی قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ ان کا امتی
ہو کر آنا جانیں تو وہ علیٰ حالہٖ نبی نہیں رہتے۔ گویا نہ وہ مستقل نبی رہتے
ہیں نہ کامل امتی۔ مسیح موعودؑ نے حضرت عیسیٰؑ کو صاحبِ نبوتِ تامہ یعنی
شارع نبی عام علماء کے خیال کے مطابق قرار دیا ہے۔ اس لئے علماء اپنے
عقیدہ کی رُو سے ملزم ہیں کہ وہ ایک شارع نبی کو امتی بناتے ہیں۔ حضرت
بانیٔ سلسلہ احمدیہ نبوتِ مطلقہ کے حامل ضرور ہیں۔ نئی شریعت لانیوالے
نبی نہیں بلکہ نبی ہوتے ہوئے بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں۔
اس لئے عرفی اصطلاح کے مطابق ہم انہیں صاحبِ نبوۃ تامہ نہیں کہتے،

تاالتباس واقع نہ ہو۔ فتدبّرو۔

حضرت ابراہیمؑ کے چار پرندے

سابقہ مضمون سے بالکل غیر متعلق طور پر آپ نے ایک نیا اعتراض کر دیا ہے جس کا پچھلی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کا اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے چار پرندوں کے بارہ میں بقول آپ کے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ میں تفسیری تناقض ہے اور پھر آپ اتنے تیز ہو گئے ہیں۔ کہ آپ نے اس بحث میں یہ سوال لکھ مارا ہے:۔

"کیا آپ کے خیال میں اس شخص کا ایمان باقی رہ جاتا ہے، جو جانتے بوجھتے ہوئے اللہ تعالےٰ کے کلام (قرآن مجید) کا وہ مفہوم بیان کرے جو ایک سچے نبی (یا محمد صلے اللہ علیہ وسلم) کے بیان کردہ مفہوم کے خلاف ہو"

افسوس ہے کہ اپنے قصور فہم سے بات کو نہ سمجھتے ہوئے آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ایمان پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ کے اتنا تیز ہو جانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ سچے نبی کے بعد بریکٹ میں "یا محمد صلے اللہ علیہ وسلم" بھی آپ نے لکھا ہے۔ تو کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ابراہیمؑ کے چار پرندوں کی کوئی ایسی تفسیر ثابت ہے کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ یا ان کے خلیفہ ثانیؓ نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہو۔ اگر نہیں تو آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپ اس جگہ کیوں لائے ہیں۔ اعتراض آپ کا یہ ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ کے نزدیک چار پرندوں کے چار پہاڑوں پر چھوڑ کر بُلانے کا جو ذکر ہے یہ بھی عمل الترب ہے۔ آگے عمل الترب کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے انسان کے اپنی قوتِ مقناطیسی یعنی توجہ سے اپنی طرف کھینچ لینا قرار دیا ہے۔ اور حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد یعنی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں کے متعلق اللہ تعالےٰ کا یہ فرمانا لکھا ہے کہ انہیں سدھا کر ہر ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر ان کو بُلا اور دیکھ کہ وہ کس طرح تیری طرف دوڑتے چلے آتے ہیں یعنی اپنی اولاد میں سے چار کی تربیت کر۔ کہ وہ تیری آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس احیاء کے کام کی تکمیل کریں گے یہ چار روحانی پرندے حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ تھے۔"

اس پر آپ لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب اور بشیر الدین محمود کے بیان کردہ مفہوم و مطلب میں جو تناقض ہے وہ ظاہر ہے۔

الجواب:- ہمارے نزدیک عمل الترب سے توجہ کرنے اور ان پرندوں کو سدھانے میں کوئی تناقض نہیں۔ سدھانا پوری توجہ کے بغیر ناممکن ہے۔ سدھانے سے جب پرندے مانوس ہو جائیں تو سدھانے والے کی طرف انہیں کشش پیدا ہو جاتی ہے اور سدھانا پوری توجہ کی وجہ سے عمل الترب کی ہی شاخ ہے۔ ازالہ اوہام کو اچھی طرح غور سے پڑھ کر دیکھیں تو انشاء اللہ آپ اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔ خود حضرت مسیح موعودؑ

نے بھی الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ پر فرمایا ہے " اللہ
تعالیٰ نے فرمایا - تو چار جانور لے اور ان کو اپنے ساتھ ہلا لے " اور
سدھانے اور ہلانے کے ایک ہی معنے ہیں ، صحیح بخاری میں اَمِلْهُنَّ کا
لفظ آیا ہے یعنی ان کو اپنی طرف مائل کر - سو توجہ اور سدھانے سے
ہی وقوع میں آسکتا ہے - سدھانا عمل الترب کی ہی ایک شاخ ہے بغیر
اس کے سدھانا ممکن نہیں -

جہاں تک تفسیر کے اس حصّہ کا تعلق ہے کہ بلانے پر یہ پرندے
آجائیں گے - اس میں قرآن مجید کا " ظاہر " بیان ہوا ہے - مگر قرآن مجید
کو سورۃ الواقعہ میں " کتاب مکنون " بھی قرار دیا گیا ہے - حضرت
خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے اس آیت میں جو چھپا ہوا نکتۂ معرفت تھا وہ بھی
بطور بطنِ قرآن کے بیان فرمایا ہے - جو ایک زائد امر ہے نہ کہ متناقض -
مقصود خدا تعالیٰ کا یہی تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ بات سمجھ جائیں
کہ آپ کے ہاتھ سے روحانی احیاء ، محنت ، مجاہدہ ، کوشش اور توجہ سے
ہوگا - پس لوگوں کو اپنی طرف مانوس کریں - جس طرح پرندوں کو مانوس کیا
جاتا ہے اس کے لئے تمہیں پوری توجہ دینی ہوگی - آیت میں چار پرندوں کے
ذکر سے یہ نقطۂ معرفت اخذ کیا گیا ہے کہ آیت میں چار پرندوں کا عدد اس لئے
بیان فرمایا گیا کہ ابراہیمؑ کی اولاد میں سے بالخصوص چار شخص خاص توجہ اور
تربیت کے مستحق تھے - جن سے آپ کا مشن ترقی کرنے والا تھا - اور وہ
حضرت اسمٰعیلؑ ، حضرت اسحٰقؑ ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ تھے - ج

چو بشنوی سخنِ اہلِ دل مگو کہ خطا است۔

مطالبہ حدیث

آپ نے وہ حدیثیں طلب کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ کامل طور پر رسول کہلانے والا اُمتی نہیں کہلاتا۔ جواباً عرض ہے۔ کامل طور پر رسول اللہ سے مراد شارع اور مستقل نبی ہے اور جن حدیثوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پہلے انبیاء کا ذکر فرمایا ہے وہ سب مستقل یا شارع تھے۔ ان نصوص میں کسی کو امتی نہیں کہا گیا۔ اگر کسی حدیث میں ان میں سے کسی کو امتی کہا گیا ہے تو اس کا ثبوت آپ کے ذمہ ہے۔ ہم تو اس سے انکار کرتے ہیں۔ ہمارے ذمہ ثبوت نہیں۔

بظاہر تناقض کی ایک مثال

ذرا اس پر بھی غور فرمایئے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق قرآن میں دو بیان کیوں آئے ہیں۔ جن میں سے ایک میں قولا انا رسول رب العٰلمین کے الفاظ ہیں۔ اور دوسرے میں قولا انا رسولا ربک کے الفاظ ہیں۔ یہ مفرد اور جمع کا اختلاف اور رب العالمین اور ربک کا اختلاف کیوں ہے اور دونوں بیانوں میں سے کونسے لفظ موسیٰ اور ہارون نے فرعون کے سامنے استعمال کئے تھے۔ مگر وجہ تطبیق ایجاد نہیں کرنی ہوگی سیاق میں تو اس کی کوئی وجہ مذکور نہیں۔ ہمارے اس سوال کا جواب بھی سوچیئے کہ موسیٰؑ کو نبی ہو کر اپنے بھائی کے متعلق یہ بدگمانی کیوں ہوئی کہ وہ

نبی ہو کر بھی میری نافرمانی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یا ھٰرون ما منعک اذ رأیتھم ضلّوا اَلَّا تتّبعنِ" (سورۃ طٰہٰ آیت ۹۲)

مرزا صاحب اور قرآن مجید کے عنوان کے تحت آپ نے بعض اور نئے اعتراض بھی کئے ہیں۔ جو آپ کے پہلے مضمون سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ گویا جب پہلے اعتراضوں سے آپ عہدہ برآ نہ ہو سکے تو آپ کو یہ سوجھی کہ نئے اعتراض کر دوں تا ان پر نیا بوجھ پڑے۔ اور آپ کی سابقہ کمزوری کا پردہ چھپ جائے۔

اس سلسلہ میں آپ "نشان آسمانی صفحہ ۴۲" سے یہ عبارت پیش کر کے کہ

"خدا تعالیٰ قرآن کریم میں صاف فرماتا ہے کہ جو میرے پر افتراء کرے اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ اور میں جلد مفتری کو پکڑتا ہوں۔ اور اس کو مہلت نہیں دیتا"

یہ سوال کیا ہے کہ قرآن مجید کی وہ آیت پیش کی جائے جس میں مفتری علی اللہ کو مہلت نہ ملنے اور جلد پکڑے جانے کا ذکر ہو۔

جناب من! قرآن کریم سے یہ مضمون صاف طور پر ثابت ہے کہ مفتری علی اللہ، اظلم بھی ہوتا ہے۔ اور جلد بلا مہلت گرفت میں بھی آجاتا ہے اس کا اظلم ہونا کئی آیتوں سے ثابت ہے جن میں سے ایک آیت یہ ہے: فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبًا او کذّب بٰاٰیٰتہٖ اولٰٓئک ینالھم نصیبھم من الکتٰب (الاعراف ع۴)

کہ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ پر افتراء کرے یا اس کی آیات کی تکذیب کرے۔ ان سب کو الکتاب کا مقدر حصہ ملے گا۔ یہ الکتاب کا مقدر حصہ کیا ہے؟ یہ حصہ یہی ہے کہ مفتری علی اللہ جلد گرفت میں آجاتا ہے۔ اور مکذب آیات اللہ کو مہلت دی جاتی ہے۔ دونوں کے متعلق قرآنی بیان ملاحظہ ہو۔ مفتری علی اللہ کا حصہ سورۃ الحاقہ کی آیت لو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین میں بیان ہوا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ متقول علی اللہ پر اخذنا منہ بالیمین کی گرفت بلا توقف و مہلت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ آیت جملہ شرطیہ ہے۔ اور کلام الٰہی ہے اور شرط کے تحقق پر جزاء کا تحقق ضروری قرار دیا گیا ہے اور کوئی مہلت بیان نہیں کی۔ اگر تقول علی اللہ کی شرط نہ پائی جائے تو یہ جزاء بھی نہیں پائی جائے گی۔ اور اس شرط کے پائے جانے سے جزاء لاخذنا منہ بالیمین کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ تا تخلف المشروط عن الشرط لازم نہ آئے۔ اور مکذبینِ آیات اللہ کے متعلق اللہ تعالٰے فرماتا ہے۔ ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم خیر لانفسھم انما نملی لھم لیزدادوا اثما ولھم عذاب مھین (آل عمران: ۱۷۸) کہ انکار کرنے والے یہ خیال نہ کریں کہ ڈھیل جو ہم انہیں دے رہے ہیں وہ ان کے لئے بہتر ہے ہم تو انہیں صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں۔ کہ وہ گناہ میں اور بڑھ جائیں۔ اور ان کے لئے ذلیل کن عذاب مقدر ہے۔ لاخذنا منہ بالیمین

کی گرفت کے بعد ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْن کی جزا پائی جائے گی۔ جس کے لئے ثُمَّ کا لفظ ایک مہلت کے لئے اشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ ثُمَّ تراخی مع التعقیب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تراخی کسی قدر مہلت کو چاہتی ہے۔ پس اخذ بالیمین کی جزا کا وقوع تو بلا توقف ضروری ہے۔ اور قطع وتین کے لئے بھی مہلت درکار ہوتی ہے۔

اس جگہ آپ کا دوسرا اعتراض قابلِ تعجب ہے۔ اس میں آپ پہلے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں اور پھر اس عبارت کو خود ایک غلط معنے دے کر اس پر اپنے اعتراض کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ اور اپنے اس غلط مفہوم کی بناء پر ہمیں چیلنج بھی دے رہے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آپ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک عبارت کے شروع کے لفظ "اس جگہ" چھوڑ کر یوں نقل کرتے ہیں:۔

> "یہ لکھنا بیان کرنے کے لائق ہے۔ کہ قرآن شریف میں ہر جگہ موت کے محل پر توفّی کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے اِماتت کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا۔ اس میں بھید یہ ہے کہ موت کا لفظ ایسی چیزوں کے فناء کی نسبت بھی بولا جاتا ہے۔ جن پر فناء طاری ہونے کے بعد کوئی روح ان کی باقی نہیں رہتی۔ ..... چونکہ ..... خدا تعالےٰ کو اپنے کلام عزیز میں یہ منظور رہے کہ کھلے کھلے طور پر ظاہر

کرے کہ انسان ایک ایسا جاندار ہے کہ جس کی موت کے بعد بھی اس کی فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی روح باقی رہتی ہے۔ اس وجہ سے موت کے لفظ کو ترک کرکے بجائے اس کے توفی کا لفظ استعمال کیا ہے۔"

(ازالہ اوہام طبع اول صفحہ ۳۳۶-۳۳۵)

یہ عبارت پیش کرکے آپ لکھتے ہیں کہ میرا اس پر یہ اعتراض ہے کہ قرآن کریم میں انسان کے لئے جس طرح توفی کا لفظ استعمال ہوا ہے اسی طرح اماتت اور موت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ انسان کے لئے قرآن شریف میں ہر جگہ موت کے محل پر توفی کا لفظ استعمال ہوا ہے اور یہ کہ موت کے لفظ کو ترک کرکے توفی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ غلط ہے۔ انسان کے لئے موت اور اماتت کے لفظ کے استعمال کے لئے قرآن مجید سے جتنے حوالے درکار ہوں مہیا کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت مسیح موعودؑ کی عبارت کو غلط معنے دے کر یہ آپ کی غلط تعلی اور تحدی ہے۔ کہ گویا آپ سینکڑوں حوالے بھی قرآن سے پیش کر سکتے ہیں جن میں انسان کے لئے موت کا یا اماتۃ کا لفظ آیا ہے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی عبارت کا وہ مطلب نہیں جو اعتراض میں مراد لیا گیا ہے اصل عبارت کا پہلا فقرہ قابل توجہ ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں :-

"اس جگہ یہ نکتہ بیان کرنے کے لائق ہے کہ قرآن شریف
میں ہر جگہ موت کے محل پر توفّی کا لفظ کیوں استعمال
کیا ہے۔"

جنابِ من! عبارت کے شروع سے آپ نے "اس جگہ" کا لفظ چھوڑ
دیا ہے۔ عبارت میں "اس جگہ" کا اشارہ پہلے مضمون کی طرف ہے جس
میں حضرت مسیح موعودؑ نے قرآن شریف سے ایک ٹیبل (فہرست) کی صورت
میں توفی کے استعمال پر مشتمل چوبیس ۲۴ آیات درج فرمائی ہیں۔ اور اس
کے ایک صفحہ بعد اس میں سے دس آیات کو دُہرایا ہے یہ ٹیبل یا فہرست
آیات صفحہ ۳۳۲-۳۳۱ پر درج ہے۔ اور ۳۳۴ پر پھر ان میں سے
دس آیات کو دُہرایا گیا ہے۔ اور پھر ان پر یہ نوٹ دیا ہے۔

"بطور نمونہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ آیات کیسی صریح اور صاف
طور پر موت کے معنوں میں استعمال کی گئی ہیں ......
.... بلاشبہ قطعی اور یقینی طور پر اوّل سے آخر تک قرآنی
محاورہ یہی ثابت ہے کہ ہر جگہ درحقیقت توفّی کے لفظ
سے موت ہی مراد ہے تو پھر متنازعہ فیہ دُو آیتوں کی نسبت
جراًتی متوفیک اور فلمّا توفّیتنی ہیں۔ اپنے
دل سے کوئی معنی مخالف عام محاورۂ قرآن کے گھڑنا اگر
الحاد اور تحریف نہیں تو اور کیا ہے۔"

جنابِ من! ان الفاظ کے بعد آپ کی پیش کردہ عبارت شروع ہوتی ہے اور

"اس جگہ" کا لفظ آپ نے اس جگہ سے حذف کر دیا ہے۔ اس جگہ کے لفظ کے ساتھ عبارت کا آغاز یوں ہوگا۔

"اس جگہ یہ نکتہ بیان کرنے کے لائق ہے۔ قرآن شریف میں ہر جگہ موت کے محل پر توفّی کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟"

اس سے حضرت مسیح موعودؑ کی مراد یہ ہے کہ متنازعہ فیہ دو آیتوں کو چھوڑ کر باقی تمام آیات میں جو اُوپر توفّی کے استعمال کے متعلق درج کی جا چکی ہیں۔ ہر جگہ قرآن کریم میں توفّی کا لفظ موت کے محل پر استعمال ہوا ہے اور انہیں چوبیس ۲۴ آیتوں کے متعلق آگے چل کر عبارت کا یہ فقرہ ہے۔ کہ موت کے لفظ کو ترک کر کے بجائے اس کے توفّی کا لفظ بیان کیا ہے حضرت مسیح موعودؑ یہ نہیں فرما رہے کہ قرآن میں ہر جگہ موت کا لفظ انسان کے لئے ترک کیا گیا ہے اور کہیں بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ بتا رہے ہیں کہ اوپر کی درج کردہ آیات میں موت کا لفظ ترک کیا گیا ہے۔ گو محل موت کا ہی ہے۔ مگر استعمال موت کی بجائے توفّی کا لفظ ہوا ہے۔ اس کا بھید یہ بیان فرمایا ہے کہ موت کا لفظ ایسی چیزوں کی فنا کی نسبت بھی بولا جاتا ہے جن پر فنا طاری ہونے کے بعد کوئی روح ان کی باقی نہیں رہتی۔ اس عبارت میں "بھی" کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ جن پر فنا طاری ہونے کے بعد اُن کی رُوح باقی رہ جاتی ہے ان پر بھی موت کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور وہ انسان ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ "بھی" کا لفظ جناب معترض صاحب! آپ کی غلط طور پر پیش کردہ عبارت میں اعتراض کا قلع قمع کر رہا ہے۔

جناب من! آگے آپ نے یہ عبارت خود بھی نقل کر دی ہے کہ انسان ایک ایسا جاندار ہے کہ جس کی موت کے بعد بکلی اس کی فنا نہیں ہوتی، بلکہ اس کی روح باقی رہ جاتی ہے۔

اس عبارت میں حضرت مسیح موعودؑ نے انسان کے لئے موت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ البتہ اس پر بکلی فنا وارد ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ اگلا فقرہ پھر آپ نے چھوڑ دیا ہے جو یہ ہے "جس کو قابضِ ارواح، اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے" اور اس کے بعد کا یہ فقرہ لکھ دیا ہے "اس وجہ سے موت کے لفظ کو ترک کر کے بجائے اس کے توفی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے"

حضرت مسیح موعودؑ کی مراد جیسا کہ پہلے بیان ہوا، یہ ہے کہ ان چوبیس مقامات پر جو اوپر فہرست میں درج ہیں موت کا لفظ ترک کیا گیا ہے۔ اور اس کی بجائے توفی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس فقرہ کے یہ معنے نہیں کہ حضرت مسیح موعودؑ یہ بیان کر رہے ہیں کہ قرآن میں ہر جگہ موت کا لفظ انسان کے لئے ترک کیا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح موعودؑ کو تو خود اعتراف ہے کہ ایسی آیات بھی موجود ہیں جن میں انسان کے لئے موت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ازالہ اوہام حصہ اول کے ص۳۲۵ پر یعنی معترض کی پیش کردہ عبارت سے گیارہ صفحے پہلے حضرت مسیح موعودؑ نے تین ایسی آیتیں خود درج کی ہیں جن میں انسان کے لئے موت کا لفظ موجود ہے۔ پہلی آیت اَفَائِن مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ، دوسری آیت مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدَ اَفَائِن

منّ فهم الخالدون ، اور تیسری آیت کلّ نفسٍ ذائقة الموت ہے۔ ان تینوں آیتوں سے حضرت عیسٰیؑ کی موت کے متعلق استدلال کیا گیا ہے۔ اب کیا حیثیت رہ جاتی ہے آپ کی اس تعلّی اور تحدّی کی کہ آپ انسان کے لئے موت اور اماتت کے لفظ کے استعمال کے لئے جتنے حوالے درکار ہوں مہیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو ایک حوالہ بھی درکار نہیں ہے، کیونکہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام خود موت کے لفظ کا استعمال انسان کے لئے قرآن میں مانتے ہیں اور اس بارے میں آپ کی طرف سے پیش کردہ آیتیں ازالہ اوہام میں بھی موجود دکھا دی ہیں۔ جو اس بات پر روشن دلیل ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قرآن مجید میں انسان کے لئے موت کے لفظ کے استعمال کا خود ذکر فرماتے ہیں۔

جناب من! آپ تو لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ اب اگر آپ کو کوئی کہہ دے کہ ہمیں ایک ہزار حوالہ درکار ہے۔ تو کیا آپ انسان کے لئے قرآن سے ایک ہزار دفعہ موت کا لفظ دکھا سکتے ہیں؟ پس آپ کا "جتنے" کا لفظ استعمال کرنا محض مبالغہ آرائی ہے، جو دُور از حقیقت ہے۔

ایک نیا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ براہین احمدیہ حاشیہ نمبر ۳ صفحہ ۴۳۸ و ۴۳۹ سے آپ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس میں آیت ھو الذی ارسل رسولہ بالھدٰی

و دین الحق لیظھرہٗ علی الدّین کُلّہٖ کو پیش کر کے یہ لکھا ہے :-

"یہ آیت جسمانی اور سیاست ملکی کے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں پیشگوئی ہے۔ اور جس غلبہ کاملہ دینِ اسلام کا وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہ مسیحؑ کے ذریعہ سے ظہور میں آئے گا۔ اور جب حضرت مسیحؑ دوبارہ اس دُنیا میں تشریف لائیں گے۔ تو ان کے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع اقطار و اطراف میں پھیل جائیگا۔"

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا یہ بیان بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق ہے جو اس آیت میں بیان کردہ غلبہ کو عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی سے متعلق قرار دیتے رہے ہیں۔ چونکہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ پر ابھی یہ الہاماً انکشاف نہیں ہوا تھا۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہوئے ہیں۔ اور مسیحؑ کی آمدِ ثانی کی پیشگوئیؑ کا مصداق دراصل آپ ہی ہیں۔ اور مسیح ابنِ مریمؑ سے مشابہت رکھنے کی وجہ سے اس موعود پیشگوئی کے مصداق ہیں، لہٰذا اس انکشاف سے پہلے آپ نے ان بعض مفسرین کا رسمی عقیدہ بیان کیا ہے۔ جس کو اس وقت آپ رسماً و اجتہاداً مانتے تھے، کیونکہ خود بھی حیاتِ مسیحؑ کے قائل تھے۔ آپ کا یہ بیان تحقیقی نہیں تھا محض رسمی ہے۔ گو براہین احمدیہ آپ نے ملہم اور مامور ہونے کی حالت میں تجدیدِ دین کی خاطر لکھی۔ لیکن اس کی سب باتیں الہامی نہیں

اور اجتہادی خطا قابلِ اعتراض نہیں ہوتی۔ آپ فرماتے ہیں:-

اگرچہ خدا تعالیٰ نے براہین احمدیہ میں میرا نام عیسیٰ رکھا اور یہ بھی فرمایا کہ تیرے آنے کی خبر خدا اور رسولؐ نے دی تھی۔ مگر چونکہ ایک گروہ مسلمانوں کا اس اعتقاد پر جما ہُوا تھا اور میرا بھی یہی اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر سے نازل ہوں گے۔ اس لئے مَیں نے خدا کی وحی کو ظاہر پر حمل کرنا نہ چاہا۔ بلکہ اس وحی کی تاویل کی۔ اور اپنا اعتقاد وہی رکھا جو عام مسلمانوں کا تھا۔ اور اسی کو براہین احمدیہ میں شائع کیا۔ لیکن بعد اس کے اس بارہ میں بارش کی طرح وحی الٰہی نازل ہوئی کہ وہ مسیح موعود جو آنے والا تھا تو ہی ہے اور ساتھ اس کے صدہا نشان ظہور میں آئے۔ اور زمین و آسمان دونو میری تصدیق کے لئے کھڑے ہو گئے اور خدا کے چمکتے ہوئے نشان میرے پر جبر کر کے مجھے اس طرف لے آئے کہ آخری زمانہ میں مسیح آنے والا مَیں ہی ہوں۔ ورنہ میرا اعتقاد تو وہی تھا جو مَیں نے براہین احمدیہ میں لکھ دیا تھا۔ اور پھر مَیں نے اس پر کفایت نہ کر کے اس وحی کو قرآن شریف پر عرض کیا تو آیات قطعیۃ الدلالت سے ثابت ہُوا۔ کہ درحقیقت مسیح ابن مریم فوت ہو گیا ہے اور آخری خلیفہ مسیح موعود کے نام پر اسی امت

میں سے آئے گا۔ اور جیسا کہ جب دن چڑھ جاتا ہے تو
کوئی تاریکی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح صدہا نشانوں اور
آسمانی شہادتوں اور قرآن شریف کی قطعیۃ الدلالت آیات اور
نصوص صریحہ حدیثیہ نے مجھے اس بات کے لئے مجبور
کردیا کہ میں اپنے تئیں مسیح موعود مان لوں۔ میرے لئے
یہ کافی تھا کہ وہ میرے پر خوش ہو۔ مجھے اس بات کی ہرگز
تمنّا نہ تھی۔ مَیں پوشیدگی کے حجرہ میں تھا۔ اور کوئی مجھے
نہیں جانتا تھا۔ اور نہ مجھے یہ خواہش تھی کہ کوئی مجھے
شناخت کرے۔ اس نے گوشۂ تنہائی سے مجھے
جبرًا نکالا۔ مَیں نے چاہا کہ مَیں پوشیدہ رہوں۔ اور
پوشیدہ مروں۔ مگر اس نے کہا کہ مَیں تجھے تمام دنیا میں
عزّت کے ساتھ شہرت دونگا۔ پس یہ اس خدا سے پوچھو
کہ ایسا تو نے کیوں کیا۔" (حقیقۃ الوحی ص ۱۴۹ طبع اوّل)

ہماری بھی آپ کو یہی نصیحت ہے کہ آپ خدا سے پوچھیں اور بحث و
تکرار چھوڑیں۔

واضح رہے کہ آیت لیظھرہٗ علی الدّین کلّہٖ میں کوئی
لفظ ایسا موجود نہیں۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر دلالت
کرتا ہو۔ مسلمانوں نے حیاتِ مسیحؑ کا عقیدہ نزولِ مسیح کی حدیثوں سے
اخذ کیا تھا۔ اور قرآن کریم کی آیات جو وفاتِ مسیح پر دلالت کرتی تھیں

ان کی تاویل کر کے حضرت عیسیٰؑ کو زندہ مانا تھا جب تک پیشگوئی وقوع میں نہ آئے۔ اصل حقیقت بعض وقت مستور رہتی ہے۔ اس لئے جو تاویل بھی کی جاتے۔ اگر وہ واقعات سے دُور از حقیقت ثابت ہو تو حقیقت ظاہر ہونے پر وہ غلطی تو متصور ہو گی۔ اور رد کی جائے گی۔ لیکن مجتہد معذور سمجھے جائیں گے بلکہ ان کو ثواب ملنے کا امکان ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی میں وارد ہے کہ مجتہد سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اجتہاد درست بھی ہو سکتا ہے۔ فان اصاب فلهٗ اجران وان اخطأ فلهٗ اجرٌ واحدٌ۔ اگر اس کا اجتہاد صحیح ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں۔ اور اگر اجتہاد میں غلطی واقع ہو۔ تو اس کی نیک نیتی کی وجہ سے اس کو ایک اجر ملتا ہے۔ پس ہم ایسے شخص کو غلطی خوردہ تو قرار دیں گے، معذور بھی جانیں گے اس کی تفسیق وتضلیل نہیں کریں گے۔ شاید آپ یہ فتویٰ ایسے لوگوں پر لگا سکتے ہوں، کیونکہ آپ کی تحریر سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہمیں یہ جرأت نہیں کہ دوسروں کی نیت پر حملہ کریں۔ البتہ حقیقت کھُل جانے پر کہ مسیح ابن مریمؑ کے نزول کی پیشگوئی بروز سے متعلق تھی۔ اور وہ ظاہر ہو گیا ہے۔ اور پہلا مسیحؑ وفات پا چکا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصالتاً آمد کا قائل ہو تو اسے ہم ضرور گم کردہ راہ جانتے ہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ما حَدَّثتکُمْ عَنِ اللّٰہِ سبحانہٗ وتعالیٰ فھو حقٌّ وَمَا قُلْتُ فِیْہِ مِنْ قِبَلِ

نَفْسِي فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اُخْطِي وَ اُصِيْبُ۔

(نبراس شرح الشرح لعقائد نسفی ص۳۹۲)

ترجمہ:۔ جو بات مَیں تمہیں خدا کی طرف سے سناؤں وہ تو برحق ہے۔ اور جو کچھ اس بات کے متعلق اپنی طرف سے کہوں تو مَیں ایک انسان ہوں۔ غلطی بھی کر سکتا ہوں۔ صحیح بات بھی کہہ سکتا ہوں۔

خدا جانے آپ اجتہادی غلطی پر حقیقت کے مخفی ہونے کے زمانہ میں گمراہی کا فتوٰی لگانے کی کیوں جرأت کر رہے ہیں۔ جبکہ اجتہادی غلطی کا امکان کسی آیت کے سمجھنے کے بارہ میں سیّد الانبیاء خاتم النبیینؐ سے بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اس جگہ نظائر پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اوپر کی حدیث آپ کے جواب میں کافی ہے۔ پس آپ کے آخری خط کے ص۱۳ کا جواب بھی ہمارے اس کلام میں آگیا ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ایک نیا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔ "قرآن کریم میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔" (چشمۂ معرفت ص۲۱۱) اس پر آپ کا اعتراض یہ ہے:۔ "قرآن مجید میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے کے لئے کونسا لفظ استعمال ہوا ہے۔"

آپ کی یہ پیش کردہ عبارت سیاق بریدہ ہے۔ اور نرم الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اس کو صحیح طور پر نہیں پڑھا۔ یہاں پر

قرآن کریم کی پیشگوئیاں بیان ہو رہی ہیں۔ جو پوری ہوئیں۔ انہیں کے سلسلہ میں حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ تحریر فرما رہے ہیں:۔

"ایسا ہی شق القمر کا عالی شان معجزہ جو خدائی ہاتھ کو دکھلا رہا ہے۔ قرآن شریف میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارہ سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور کفار نے اس معجزہ کو دیکھا اس کے جواب میں یہ کہنا کہ ایسا وقوع میں آنا خلاف علم ہیئت ہے یہ سراسر فضول باتیں ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف تو فرماتا ہے کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔"

اس سیاق کو پڑھنے سے ظاہر ہے کہ "قرآن شریف میں مذکور ہے" کے الفاظ "ایسا ہی شق القمر کا عالی شان معجزہ جو خدائی ہاتھ کو دکھلا رہا ہے" سے متعلق ہیں۔ اور اگلی عبارت یہ کہ "بیانیہ درج کرکے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے خود اس معجزہ کو یوں بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا" اور آپ کا یہ بیان اس مشہور واقعہ کی بناء پر ہے کہ اس وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انگلی کا اشارہ کیا تھا۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ قرآن شریف میں انگلی کے اشارہ کا ذکر موجود ہے پس آپ کا

یہ دعویٰ ہی نہیں کہ قرآن میں یہ مذکور ہے کہ انگلی کے اشارہ سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ بلکہ قرآن کریم میں جس رنگ میں یہ معجزہ بیان ہوا ہے اس کے لئے آپ نے آیت قرآنیہ واقتربت الساعۃ وانشق القمر وان یروا آیۃ یقولوا سحر مستمر نقل فرمادی ہے۔

افسوس ہے کہ قرآن شریف میں مذکور ہے کو آپ نے خود اگلے فقرے سے ملا کر یہ سوال گھڑ لیا ہے کہ آپ کو قرآن شریف سے یہ الفاظ دکھائے جائیں۔ حالانکہ اس فقرہ کا تعلق پہلی عبارت سے ہے۔ فتدبّر۔

آیت "ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین" کی تفسیر

"کوئی شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جا سکتا" کے عنوان کے تحت آپ نے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی تین عبارتیں ازالہ اوہام کی مختلف مقامات سے پیش کی ہیں۔ جو یہ ہیں:۔

۱۔ "علم طبعی کی نئی تحقیقاتیں اس بات کو ثابت کر چکی ہیں کہ بعض بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچکر اس طبقہ کی ہوا ایسی مضرِ صحت معلوم ہوتی ہے۔ کہ جس میں زندہ رہنا ممکن نہیں۔ پس اس جسم کا کرۂ ماہتاب یا کرۂ آفتاب تک پہنچنا کس قدر لغو خیال ہے۔"

(ازالہ اوہام ص۴۷ طبع اول)

۲- "یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ کیا طبعی اور فلسفی لوگ اس خیال پر نہیں ہنسیں گے کہ جبکہ تیس یا چالیس ہزار فٹ تک لوگ زمین سے اوپر کی طرف جانا موت کا موجب ہے تو حضرت مسیح اس جسم عنصری کے ساتھ آسمان تک کیونکر پہنچ گئے۔ اور کیا یہ مخالفوں کے لئے ہنسنے کی جگہ نہیں ہو گی۔"

(ازالہ اوہام طبع اوّل صفحہ ۱۴۶-۱۴۷)

۳- " ولکم فی الارض مستقر و متاع الیٰ حین یعنی تم اپنے جسم خاکی کے ساتھ زمین پر ہی رہو گے یہاں تک کہ اپنے تمتع کے دن پورے کر کے مر جاؤ گے۔ یہ آیت جسم خاکی کو آسمان پر جانے سے روکتی ہے کیونکہ لکم جو اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے۔ اس بات پر بصراحت دلالت کر رہا ہے کہ جسم خاکی آسمان پر جا نہیں سکتا۔ بلکہ زمین سے ہی نکلا اور زمین میں ہی رہے گا۔ اور زمین میں ہی داخل ہو گا۔" (ازالہ اوہام صفحہ ۶۰۹ طبع اوّل)

یہ عبارتیں نقل کر کے آپ لکھتے ہیں۔

"میرا سوال یہ ہے کہ آپ بتائیں کہ آپ کے نزدیک زمین کی حد کہاں تک ہے۔ تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ انسان واقعی اس حد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کیا کرۂ ماہتاب تک پہنچنا اب بھی بقول مرزا صاحب ایک لغو خیال ہے یا ایک حقیقت

بن چکا ہے ؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آجکل کے طبعی
اور فلسفی لوگ مرزا صاحب کے اس قرآن پر ہنس رہے
ہوں جو جسم خاکی کو کسی حالت میں بھی زمین کی حد سے باہر
نہیں نکلنے دیتا ؟ کیا انسان اپنے زورِ بازو سے کوئی
ایسا کام انجام دے سکتا ہے ، جو خدا تعالیٰ کے وعدہ
کے خلاف ہو۔ یا خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کے خلاف ہو؟"

الجواب:۔ پیش کردہ تینوں عبارتیں ازالہ اوہام کی ہیں جو اس
زمانہ کی کتاب ہے۔ جبکہ فضا میں یا چاند پر جانے
کے مشینی ذرائع موجود نہ تھے۔ پس مشینی ذرائع کے بغیر اور ان کی
عدم موجودگی میں جسم خاکی کے فضا میں جانے یا آفتاب پر جانے کو
ان عبارتوں میں محال قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بات مشینی ذرائع کے
بغیر آج بھی محال اور ہنسی کے قابل ہے۔ اور ایک لغو خیال ہے۔

جناب من! پہلی اور دوسری عبارت آپ نے قطع و برید کے
ساتھ پیش کی ہے۔ پہلی عبارت سے پہلے کے ذیل کے الفاظ آپ نے
چھوڑ دیئے ہیں:۔

"ازاں جملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ نیا اور پرانا فلسفہ بالاتفاق
اس بات کو محال ثابت کرتا ہے کہ کوئی انسان اپنے اس
خاکی جسم کے ساتھ کرۂ زمہریر تک بھی پہنچ سکے۔"

اس عبارت میں نئے اور پرانے فلسفہ کے پیش نظر چونکہ خاکی جسم کے ساتھ

انسان کا کرۂ زمہریر تک پہنچنا محال قرار دیا گیا تھا۔ اور علم طبعی کی نئی تحقیقات بھی بعض بلند بلند پہاڑوں کی چوٹیوں کی ہوا کو مضر صحت قرار دیتی ہے جس میں انسان کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس لئے اس وقت تک مشینی ذرائع کی عدم موجودگی کی وجہ سے انسان کا اپنے خاکی جسم کے ساتھ کرۂ زمہریر سے گذر کر ماہتاب یا آفتاب تک پہنچ جانا لغو خیال قرار دیا گیا ہے۔ اب جو لوگ ماہتاب تک پہنچے ہیں ان کا خاکی جسم کرۂ زمہریر سے اثر پذیر ہوئے بغیر بدیں وجہ پہنچ گیا ہے کہ وہ ایسے راکٹ میں بیٹھکر گئے ہیں جس پر کرۂ زمہریر اثر انداز نہیں ہوتا اور پھر وہ ایسا لباس پہنکر گئے ہیں جس پر چاند کا درجہ حرارت اثر انداز نہیں ہوتا۔ اور زندگی کے لئے پانی، آکسیجن اور زمینی خوراک کا سٹاک ساتھ لیکر گئے ہیں تب وہ زندہ واپس آئے ہیں۔ پس یہ خیال آج بھی لغو ہے، کہ مادی اور ارضی ذرائع کے بغیر کوئی شخص کرۂ زمہریر سے گزر کر ماہتاب تک پہنچ سکے اور آفتاب کی حرارت تو اس قدر شدید ہے کہ وہاں تک تو راکٹ کے ذریعہ بھی پہنچنا محال ہے۔ پس موجودہ فلسفہ بھی ارضی اور مادی ذرائع کے بغیر آسمان میں یا ماہتاب پر پہنچنے کو محال قرار دیتا ہے حضرت مسیح کو آسمان پر زندہ ماننے والوں کا یہی عقیدہ ہے کہ وہ محض اپنے خاکی جسم کے ساتھ آسمان پر چلے گئے۔ اور ان کا جسم کرۂ زمہریر سے متاثر نہیں ہوا۔ اسی خیال کی تغلیط اور تردید اُدپر کی عبارت میں کی گئی ہے۔

دوسری عبارت میں آخر کا فقرہ "اور کیا یہ مخالفوں کے ہنسنے کی جگہ نہیں ہو گی" کا تعلق اگلی عبارت سے ہے جو یہ ہے کہ "حُلیۂ اوّل اور آخر کے اختلاف کی وجہ یہ بیان کی جائے کہ تغیّرِ عُمر کی وجہ سے حُلیہ میں فرق آگیا ہو گا" پس اس عبارت کا تعلق پہلی عبارت سے نہیں۔ پہلی عبارت میں صرف یہ بیان ہوا ہے کہ جبکہ تیس یا چالیس ہزار فٹ تک زمین سے اوپر کی طرف جانا موت کا موجب ہے تو حضرت مسیحؑ اس جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر کس طرح پہنچ گئے۔ اس خیال کے متعلق حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے لکھا ہے کہ فلسفی اور طبعی لوگ اس بات پر ہنسیں گے سو اس میں کیا شک ہے کہ آج بھی اگر کوئی شخص یہ خیال ظاہر کرے کہ انسان خارجی مادی ذرائع کے بغیر خاکی جسم کے ساتھ فضا میں جا سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے تو سائنسدانوں اور فلسفیوں کے نزدیک یہ خیال ہنسی کے قابل ہو گا۔

تیسرے حوالہ کی عبارت درست ہے اس میں خدا تعالیٰ نے بالخصوص انسان کے لئے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس کا مستقر یعنی رہائش گاہ اور زندہ رہنے کے لئے تمتع زمین سے وابستہ ہے۔ لہٰذا ہوا کے اور دیگر زمینی تمتع کے سامانوں کے بغیر کسی جسمِ خاکی کے زندہ [illegible] سے یہ آیت ضرور مانع ہے۔ کیونکہ "لَکُمْ" اس جگہ تخصیص کا فائدہ دے رہا ہے۔ [illegible] خاکی جسم کے ساتھ نہ [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] ورنہ "لَکُمْ" کا فِی الْاَرْضِ کے لفظوں سے پہلے لانا

درست نہیں رہے گا۔ اور قرآن مجید، تو خدا کا کلام ہے جو ہر حال درست ہے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اس آیت کے حکم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر حضرت عیسیٰؑ اس حکم سے مستثنیٰ ہوتے تو تو اسی جگہ ان کا استثنا بھی کر دیا جاتا۔

یہ آج تک کسی شخص نے نہیں کہا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام مشینی ذرائع سے آسمان پر پہنچ گئے۔ یا کسی کرۂ سماوی میں راکٹ میں بیٹھ کر چلے گئے ہیں۔ اسی لئے تو محققین عیسائیوں نے حضرت مسیح کا خاکی جسم کے ساتھ آسمان پر جانا تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسیح جلالی جسم کے ساتھ آسمان پر گیا ہے۔ اور ہمارے مسلمہ بزرگوں میں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی مجدد صدی دوازدہم نے بھی یہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مثالی صورت میں آسمان پر گئے۔ جیسا کہ ان کی کتاب "تاویل الاحادیث" کے ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہے:۔

"وَجَعَلَ لَهُ هَيْئَةً مِثَالِيَّةً وَرَفَعَهُ
إِلَى السَّمَاءِ" (تاویل الاحادیث صفحہ ۷۲ مطبوعہ
مطبع حیدری حیدرآباد، شائع کردہ شاہ ولی اللہ اکاڈمی)

پس خاکی جسم کے ساتھ مشینی ذرائع اور مادی سامان کے بغیر کسی انسان کا فضا میں جانا محال ہے۔ اور جب آیت مذکورہ میں مسیح کا استثناء مذکور نہیں تو خاکی جسم کے ساتھ حضرت عیسیٰ کے لئے آسمان

کو مستقر قرار دینا منشاء آیت کے خلاف ہے۔ ایسے عقیدہ سے تو یہ آیت ادبی لحاظ سے قابلِ اعتراض ٹھہرتی ہے اور اس کی اعجازی حیثیت داغدار قرار پاتی ہے۔

(نوٹ) آپ کے نئے خط کے نمبر ۱۴ کا جواب بھی اصولاً اُوپر کے جواب میں آگیا ہے۔ صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے آیت فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ سے جو استدلال کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔ آفتاب پر بذریعہ راکٹ جانے والوں نے زمینی لباس میں ہی وہاں زندگی کے چند دن گذارے ہیں۔ نہ کہ زمینی لباس اور زمینی ذرائع سے الگ ہو کر۔ اگر وہاں کوئی مر بھی جاتا تو زمینی لباس میں ہی مرتا۔ پس زمین سے بظاہر الگ ہونے پر بھی یہ لوگ زمینی ذرائع سے ہرگز بے نیاز نہیں ہو سکے۔ بلکہ زمینی ذرائع کے بلحاظ لباس و خورد و نوش زندگی کے لئے محتاج رہے۔ اور ایک ایک منٹ بلکہ ایک ایک سیکنڈ کے لئے محتاج رہے۔ پس ان کے یہ چند دن بھی ایک لحاظ سے زمین پر ہی بسر ہوئے ہیں۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا

"ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا" کے ذیل میں آپ نے ازالہ اوہام سے دو عبارتیں پیش کی ہیں جن میں سے پہلی عبارت یہ ہے کہ:-

"مسیح ابن مریم باوجود امتی ہونے کے کسی طرح رسول نہیں

ہو سکتا۔ کیونکہ رسول اور امتی کا مفہوم متبائن ہے۔ اور نیز خاتم النبیین ہونا ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کسی دوسرے نبی کے آنے سے مانع ہے۔ ہاں ایسا نبی جو مشکوٰۃ نبوتِ محمدیہ سے نور حاصل کرتا ہے اور نبوتِ تامہ نہیں رکھتا۔ جس کو دوسرے لفظوں میں محدث بھی کہتے ہیں وہ اس تحدید سے باہر ہے "

(ازالہ اوہام ص۵۷۵ طبع اوّل)

۲۔ " سو یہ بات کہ اس (آنے والے مسیح) کو امتی بھی کہا اور نبی بھی۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں شانوں کا اس میں پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن صاحبِ نبوت تامہ تو صرف ایک شانِ نبوت ہی رکھتا ہے۔ غرض محدثیت دونوں رنگوں سے رنگین ہوتی ہے اسی لئے خدا تعالےٰ نے براہین احمدیہ میں اس عاجز (یعنی مرزا صاحب) کا نام امتی بھی رکھا اور نبی بھی "

(ازالہ اوہام ص۵۳۳ طبع اوّل)

پھر تیسری عبارت قاضی محمد نذیر کی کتاب سے یہ پیش کر کے لکھا ہے کہ

۳۔ قاضی محمد نذیر صاحب اپنی کتاب " الحق المبین فی تفسیر خاتم النبیین " ص۱۹۰ پر لکھتے ہیں کہ:۔

" واضح رہے کہ خاتم النبیین کے معنی کا منفی پہلو آنحضرتؐ کے خاتم النبیینؐ

ہونیکے مثبت معنٰی کو نظر انداز کر کے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔"

"میرا سوال یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اس مذکورہ بالا تحریر میں اور ۱۹۰۰ء تک دوسری تحریروں میں خاتم النبیّن کے منفی معنٰی کیا اختیار کئے ہیں اور مثبت معنٰی کیا۔"

مکرمی! ان عبارتوں کے متعلق واضح رہے کہ ہم لوگ حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ کی نبوّت کے لئے نبوّتِ تامہ کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے۔ کیونکہ خود بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے اس اصطلاح کو ایسے نبیوں سے مخصوص قرار دیا ہے۔ جو امتی نہ ہوں۔ بلکہ ہم آپ کے لئے امتی نبی یا ظلّی نبی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک خاتم النبیینؐ کے منفی معنٰی یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شارع یا مستقل نبی نہیں آ سکتا۔ اور یہی معنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مدنظر تھے اور رہے اور خاتم النبیّن کے مثبت معنے یہ ہیں، کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض سے آپ کا ایک امتی نبوّتِ ظلّیہ کاملہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور نبوّتِ ظلّیہ ناقصہ بھی۔ محدّث اور امتی نبی میں صرف نبوّت ظلّیہ ناقصہ اور کاملہ کا ہی فرق ہے۔ ورنہ یہ ایک ہی قسم نبوّت ہے۔ ۱۹۰۰ء تک حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ پر یہ انکشاف نہیں ہوا تھا کہ آپ کو صریح طور پر نبوّت کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس لئے اس صراحت سے پہلے آپ اپنے لئے نبی کا لفظ اسی تاویل کے ساتھ ہی استعمال کر سکتے تھے کہ آپ مرسل محدّث اللہ یا

جزئی نبی ہیں۔ اور نبوتِ تامہ تشریعیہ اور نبوتِ تامہ مستقلہ کے مقابلہ
میں آپ کی یہ نبوتِ تامہ نہیں۔ بلکہ ناقصہ ہے۔ کیونکہ ملہم من اللہ الکشاف
الٰہی کے بغیر از خود کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور مصلحتِ الٰہی نے آپ
پر آپ کی شانِ نبوت کا انکشاف تدریجی کرنا چاہا۔ تا لوگوں کے لئے
اسے تسلیم کرنے میں سہولت ہو۔ معلوم ہوتا ہے اسی لئے رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی مکی زندگی میں خاتم النبیینؐ قرار نہ دیا گیا۔
اور مدنی زندگی میں بھی وفات سے تقریباً پانچ سال پہلے آپ پر یہ
انکشاف ہوا کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ جیسے رسول کریمؐ نے صحیح مسلم کی
حدیث کے مطابق تمام نبیوں پر اپنی فضیلت کی وجہ بیان فرمایا ہے
آپ نے فرمایا۔ فُضِّلْتُ عَلَی الانبیاءِ بِسِتٍّ۔ ان میں
آخری وجہ خُتِمَ بِیَ النَّبِیُّون بیان فرمائی ہے۔ انہی وجوہ میں سے
پانچویں وجہ اُرسلتُ اِلَی الخَلْقِ کَافَّۃً (مشکوٰۃ باب فضائل
سید المرسلین) بھی بیان فرمائی ہے۔ حالانکہ اس مفہوم کی آیت آپ
پر مکی زندگی میں نازل ہو چکی تھی۔ چنانچہ سورۂ سباءؔ میں جو مکی
سورۃ ہے۔ وما ارسلنٰک الّا کافّۃً لِلنّاسِ بَشِیْرًا
وَنَذِیْرًا (سباء آیت ۲۷) کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ امتیاز
دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں آپ کو حاصل تھا۔ مگر اس وقت آپ نے
اسے دیگر انبیاء پر وجہ فضیلت کے طور پر بیان نہیں فرمایا تھا۔
بلکہ آیت خاتم النبیین کے نزول پر ہی آپ نے تمام انبیاء پر اس وجہ

کو بھی اپنی فضیلت کی وجوہ میں سے ایک وجہ قرار دیا ہے۔ خاتم النبیّن کی آیت کے نزول سے پہلے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا ہوا تھا۔ لا تخیّرونی علیٰ مُوسٰی۔ کہ مجھے موسیٰ پر ترجیح مت دو۔ نیز فرمایا تھا لَا تُفَضِّلُوْنِی علیٰ یونس ابن متّٰی کہ مجھے یونس بن متّٰی پر فضیلت مت دو۔ گویا اس وقت اپنی شان کو ان نبیوں سے افضل اور بڑھ کر قرار نہیں دیا تھا۔ حالانکہ آیت مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا میں افضلیت کی وجہ موجود تھی۔ جس کا افضلیت کی وجہ ہونا آپ پر اس وقت منکشف ہوا۔ جب خاتم النبیّن کی آیت نازل ہوئی۔ غالباً اسی زمانہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا:۔

"لَوْ كَانَ مُوْسٰی حَیًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ"

کہ اگر موسیٰؑ زندہ بھی ہوتے تو میری اتباع کے بغیر انہیں چارہ نہ ہوتا۔ پس كَآفَّةً لِّلنَّاس والی آیت سے افضلیّت کی حقیقت کا اس کے نزول کے وقت نہ کھلنا بلکہ ایک دوسری آیت کے نزول پر اس حقیقت کا کھلنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی بعض آیات کے پورے معانی تدریجاً کھُلے ہیں۔ اور یہ بات نہ آپ کی تنقیص کا موجب ہے اور نہ اس بات کا موجب ہے کہ آپ اس وقت مطہّر نہیں تھے۔

اسی طرح حضرت بانی سلسلہ احمدیہ پر اپنی شان کے بارے میں

اس رنگ کا تدریجی انکشاف کہ آپ ناقص ظلی نبی ہیں یا کامل، اس انکشاف سے پہلے آپ کے پاک اور مطہر ہونے کے خلاف بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ واضح رہے کہ آیت مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاس میں کوئی پیشگوئی نہیں ہے بلکہ یہ ایک واقعہ شدہ خبر پر مشتمل ہے لیکن آیت خاتم النبیین تو ایک پیشگوئی پر مشتمل تھی۔ جس کا دامن قیامت تک ممتد ہے۔ اس لئے مشکوٰۃ نبوت محمدیہ سے نور ملنے کی اس میں جو پیشگوئی کی گئی تھی اس کے پورے وقوع پر ہی اس کے معانی کا پورا انکشاف ہو سکتا تھا۔ چونکہ پیشگوئی کی پوری پوری حقیقت بالعموم اس کے وقوع پر ہی کھلتی ہے۔ اس لئے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں:۔

> "ہم اس آیت پر سچا اور کامل ایمان رکھتے ہیں۔ جو فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اور اس آیت میں ایک پیشگوئی ہے جس کی ہمارے مخالفون کو خبر نہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیشگوئیوں کے دروازے قیامت تک بند کر دیئے گئے اور ممکن نہیں کہ اب کوئی ہندو یا یہودی یا عیسائی یا کوئی رسمی مسلمان نبی کے لفظ کو اپنی نسبت ثابت کر سکے۔ نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی، سیرت صدیقی کی کھلی ہے یعنی فنافی الرسول کی، پس جو شخص اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے

اس پر ظلّی طور پر وُہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے۔ جو نبوّتِ محمدیؐ کی چادر ہے اس لئے اس کا نبی ہونا غیرت کی جگہ نہیں کیونکہ وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نبی کے چشمہ سے لیتا ہے۔ اور نہ اپنے لئے بلکہ اسی کے جلال کے لئے۔ اسی لئے اس کا نام آسمان پر محمدؐ اور احمدؐ ہے، اس کے یہ معنے ہیں کہ محمدؐ کی نبوت آخر محمدؐ کو ہی ملی۔ گو بروزی طور پر، مگر نہ کسی اور کو۔ پس یہ آیت کہ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ، اس کے معنی یہ ہیں کہ لَیْسَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِجَالِ الدُّنْیَا وَلٰکِنْ ھُوَ اَبٌ لِرِجَالِ الْاٰخِرَۃِ، لِاَنَّہٗ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ وَ لَا سَبِیْلَ اِلٰی فُیُوْضِ اللّٰہِ مِنْ غَیْرِ تَوَسُّطِہٖ۔ غرض میری نبوّت اور رسالت باعتبار محمدؐ اور احمد ہونے کے ہے نہ میرے نفس کی رُو سے۔ اور یہ نام بحیثیت فنا فی الرسول کے مجھے ملا۔ لہذا خاتم النبیّن کے مفہوم میں فرق نہ آیا۔ لیکن عیسٰیؑ کے اُترنے سے ضرور فرق آئے گا۔"

(ایک غلطی کا ازالہ)

پس ہمارے نزدیک نبوّت کی تین قسمیں ہیں۔ تشریعی نبوّت، غیر تشریعی

نبوّتِ مستقلہ۔ اور نبوّتِ ظلّیہ کاملہ۔ جس کے حامل کو ہم امتی نبی کہتے ہیں۔ محدثیت اسی کی جزو ہے۔ اور کُل میں جُزو داخل ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ علیٰ وجہ الکمال محدّث بھی ہیں اور آپ پر اپنی شان کے بارہ میں تدریجی انکشاف نہ مخلِ نبوت ہے نہ مظہر ہونے کے خلاف۔ خدا کرے آپ ہمارے اس بیان سے حقیقت کو سمجھ جائیں۔ مگر یہ تب ہی ممکن ہے کہ آپ تعصّب سے پاک ہو کر سوچیں۔ اور خدا کا خوف دل میں رکھ کر حقیقت کو پانے کی کوشش کریں اور اسے ردّ کرنے کے لئے بہانے تلاش نہ کریں۔ اللہ تعالےٰ آپ کی رہنمائی فرمائے اور آپ کو چشمِ بصیرت عطا فرمائے۔ تا کج بحثی سے آپ حق کی شناخت سے محروم نہ رہیں۔

ہم نے آپ سے بعض آیاتِ قرآنیہ میں جو ہمارے پہلے جواب میں پیش کی گئی تھیں تطبیق دینے کے لئے لکھا تھا۔ مقصد ہمارا یہ تھا کہ ہم یہ معلوم کر سکیں۔ کہ آپ کی دلچسپی قرآن مجید سے کیسی ہے۔ سو یہ بات تو ہم پر کھل گئی ہے کہ آپ کو قرآن کریم کے حل کرنے سے دلچسپی ضرور ہے اور آپ نے اپنی طرف سے ان آیات میں تطبیق دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور ایک آیت کی تطبیق میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ باقی آیات کی تطبیق میں سے پہلے نمبر کی تطبیق میں آپ ناکام رہے ہیں جو خدا کا ایک دن ایک ہزار سال کا اور پچاس ہزار سال کا ہونے سے متعلق ہیں۔ آیت اِنَّكَ لَاتَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ اور اِنَّكَ لَتَهْدِىْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ) میں آپ کی تطبیق

تسلی بخش ہے۔ لیکن وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰی کے جو معنی آپ نے کئے ہیں وہ ہمیں زیادہ پسند نہیں۔ ہمارے نزدیک سیاق آیات کے لحاظ سے اس کے بہترین معنے طالب راہ اور متلاشیٔ راہ اور سائل راہ کے ہیں۔ اور ان معنوں پر سورۃ الشمس کی بعض آیات لبطور لف و نشر دلالت کرتی ہیں۔ اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ کی آیت اس آیت کے تقابل میں ہے۔ اور سائل و طالب کے معنوں کے لئے قرینہ ہے۔

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ آیت ۷۹ میں اصابک کی ضمیر خطاب کی رو سے آیت کا حکم نبی کے متعلق دیکھا جائے تو اقسب ہے مگر آپ نے لکھ دیا ہے کہ "اے نبیؐ (یا اے انسان) جو کچھ تجھے خوش نصیبی ہوتی ہے۔ وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور بغیر کسی حق کے بھی ملتی ہے۔ لیکن جہاں تک تکلیف کا تعلق ہے وہ تیرے اپنے اعمال کی بدولت ہے۔"

آپ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ آپ اس بارے میں شک میں ہیں کہ مخاطب اس جگہ نبی ہے یا عام انسان۔ حالانکہ تطبیق کے لئے آپ کی پیش کردہ آیات کا تعلق عذاب سے ہے۔ جو بُرے اعمال کے نتیجہ میں آتا ہے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو معصوم تھے۔ وہ کیسے مخاطب ہوں گے ان کو جو تکالیف پہنچیں وہ آپ کے کسی بُرے عمل کا نتیجہ نہ تھیں۔ بلکہ وہ بطور ابتلاء کے تھیں۔ تاکہ آپ کے صبر اور استقامت کے خلق کا کمال دنیا پر ظاہر ہو۔ پس آپ کی اس تطبیق میں جو خامی ہے اس کا

حل تلاش کریں۔

آپ نے اپنی آخری چٹھی میں دو بالکل نئے سوال کر دیئے ہیں ایک ص۱۲ پر آیت قرآنیہ "ان من اہل الکتاب" کے متعلق اور دوسرا ص۱۵ پر مباہلہ کے متعلق۔

آیت ان من اہل الکتاب کے متعلق آپ کا اعتراض یہ ہے کہ اس کے دو معنے کیئے گئے ہیں۔ ایک معنے یہ ہیں کہ کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں ہے جو ہمارے اس بیان مذکورہ بالا پر (جو ہم نے اہل کتاب کی نسبت ظاہر کیا ہے) ایمان نہ رکھتا ہو) قبل اس کے جو وہ اس حقیقت پر ایمان لائے کہ جو مسیح اپنی طبعی موت سے مر گیا ہے۔

(ازالہ اوہام ص۳۷۲)

اور دوسرے معنے یہ لکھے ہیں "وہ لوگ جو در حقیقت اہلِ کتاب ہیں اور سچے دل سے خدا پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لاتے اور عمل کرتے ہیں وہ آخر کار اس نبی پر ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہاں خبیث آدمی جن کو اہلِ کتاب نہیں کہنا چاہیئے وہ ایمان نہیں لاتے"

(حقیقۃ الوحی ص۱۴۵)

جنابِ من! یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔ اور بیان کردہ دونوں مضمون متضاد اور متناقض نہیں ہیں۔ اور یہ دونوں معنے کسی محکم آیت قرآنیہ کے خلاف نہیں۔ دونوں ہی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اور ان کا وقوع بھی ہو رہا ہے۔ متناقض باتوں میں سے ایک ہی وقوع میں آسکتی ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت

بوجہ ذو المعارف ہونے کے ان دونوں معنوں بلکہ اس سے زیادہ معنوں کی بھی متحمل ہے۔ آپ کے غور کے لئے اتنا ہی جواب کافی ہے۔ فتدبر و۔

"مباہلہ اور شریعت میں تبدیلی کے عنوان کے تحت" آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے جواب میں عرض ہے کہ مباہلہ کے مسئلہ میں حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مباہلہ کی حقیقت وہی ہے۔ جو آپ نے بیان کی ہے۔ مسنون طریق میں مباہلہ میں جماعت شامل ہونی چاہیئے۔ گو کسی کے ابناء اور نساء کسی وجہ سے شامل نہ ہو سکتے ہوں تو نہ سہی۔ لیکن مباہلہ میں دونو طرف سے جماعت ہو۔ تب بھی مباہلہ مسنون ہوگا۔ کیونکہ نجران کے عیسائی اپنی عورتوں اور ابناء کو مدینہ میں ساتھ نہیں لائے ہوئے تھے۔ جن کو مباہلہ کی دعوت دی گئی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان سے مباہلہ کے لئے ان کی عورتوں کی غیر موجودگی میں بھی تیار ہو گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اَبْنَاءَنَا وَ اَبْنَاءَكُمْ وَ نِسَاءَنَا وَ نِسَاءَكُمْ کی قیود اتفاقی ہیں یعنی میسر ہونے پر موقوف ہیں۔ البتہ دو نو طرف سے جماعتوں کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے۔ کہ تا عذاب جو مکذبین پر نازل ہو وہ مشتبہ نہ رہے لیکھرام کے متعلق دراصل مباہلہ کی جو بنیاد پڑ رہی تھی۔ وہ پیشگوئی میں تبدیل ہو گئی۔ اس لئے اس پر مباہلہ کا اطلاق مجازی ہوگا۔ اسی طرح یک طرفہ بد دعا سے جو شخص ہلاک ہو۔ اس پر بھی مباہلہ کا اطلاق مجازاً ہوگا نہ کہ حقیقتاً۔

ہم اپنے اس مضمون کو اس بات پر ختم کرتے ہیں کہ جس نبوت کے دعوٰی پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "ہم بھی نبوّت کے مدعی پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اور لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کے قائل ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوّت پر ایمان رکھتے ہیں"۔ ہم احمدی بھی لعنت بھیجتے ہیں کیونکہ ہم ہرگز یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ تشریعی یا مستقلہ نبوّت کے مدعی تھے اور آپ پر وحی نبوّت یعنی تشریعی وحی نازل ہوئی۔ ہمارے نزدیک وحی ولایت جو حضرت مسیح موعودؑ کو حاصل تھی۔ چونکہ بدرجۂ کمال امور غیبیہ پر مشتمل تھی۔ اس لئے ایسی وحی نبوت ہی ہوتی ہے جو آپ کو زیرِ سایہ نبوت محمدیہ آنجناب کی اتباع سے ملی تھی۔ اس لئے آپ امتی بھی ہیں اور نبی بھی۔ وحی ولایت کے "..." کا نام ہی امتی نبوّت یا نبوّتِ ظلّیہ ہے۔ جو محدثیّت تک بھی ملتی ہے۔ اور محدثیت سے بالا درجہ پر بھی۔ پس حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے ہرگز کبھی بھی اس نبوّت کا دعوٰی نہیں کیا۔ جس کے مدعی پر آپ نے لعنت بھیجی۔ جو تشریعی اور مستقلہ نبوت کا دعوٰی ہے۔ ایسا دعوٰی ہمارے نزدیک آج بھی کفر ہے اور اس کا مدعی ملعون۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اس وقت تک امت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی برکت سے ہزارہا اولیاء ہوئے ہیں۔ اور ایک وہ بھی ہوا جو امتی بھی ہے اور نبی بھی۔ حسب بیان حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۸۔ اس تحریر کی رُو سے آپ کا یہ لکھنا کہ سال ۱۹۰۱ء سے پہلے والے مرزا صاحب سال ۱۹۰۱ء

کے بعد والے مرزا صاحب پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ صریح غلط بیانی ہے جس نبوت پر آپ نے لعنت بھیجی ہے۔ اس کا آپ نے کہیں دعویٰ نہیں کیا۔ پس تقویٰ اور دیانت کی راہ کو نہ چھوڑیئے۔

بے شک حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لکھا ہے کہ:۔

"ہاں یہ ممکن ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ دنیا میں بروزی رنگ میں آجائیں۔ اور بروزی رنگ میں اور کمالات کے ساتھ اپنی نبوّت کا بھی اظہار کریں۔" (ایک غلطی کا ازالہ صہ ۱۳)

ہمارے نزدیک آپ کا یہ بیان امکان کے پیش نظر درست ہے۔ اور حقیقۃ الوحی (طبع اوّل) صہ ۳۹۱ کی عبارت "نبی کا نام پانے کے لئے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس نام کے مستحق نہیں۔" کا تعلق تیراں صد سال کے زمانہ سے ہے۔ آگے جو یہ ذکر ہے کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ ایسا شخص ایک ہی ہو گا۔ اس کا تعلق بھی مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ تک کسی نبی کے نہ آنے سے ہے۔ جب ایک امتی نبی آگیا۔ تو حدیث میں جس ایک ہی نبی کی بشارت دی گئی تھی وہ تو پوری ہو گئی جب اس کی نبوّت جو آچکا، ختم نبوت کے منافی نہ ہوئی تو امکاناً ہزار نبی بھی اگر اسی رنگ میں آجائے تو اس کی نبوّت، ختم نبوّت کے منافی نہیں ہو گی۔ فتدبر۔

حرفِ آخر

آپ نے اپنی آیات قرآنیہ میں تطبیق دینے والی چھٹی کے صـ۲ پر لکھا ہے کہ

"میرے ۳۰ راپریل ۱۹۷۶ء والے خط کا جواب دیتے وقت درج ذیل مزید وضاحت اور سوالات کو بھی مدنظر رکھیں۔ اور ان کا جواب بھی مہیا فرمائیں۔ تاکہ ایک ہی دفعہ فیصلہ ہو جائے۔ کیونکہ میں درحقیقت مرزا صاحب کی کتابیں پڑھتے پڑھتے بالکل بیزار ہو چکا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ جُوں جُوں مزید کتابیں پڑھتا ہوں توں توں اُلجھنوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

اس کے جواب میں واضح ہو کہ آپ کی پریشانی اور اُلجھنوں کا باعث اور بیزاری کی وجہ درحقیقت سُوءِ ظنّی کا حجاب ہے۔ جن لوگوں نے قرآن مجید کو حُسنِ ظنّی سے نہیں پڑھا۔ وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور آپ کے منجانب اللہ ہونے کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ بلکہ یضلّ بہ کثیرًا کا مصداق ہیں۔ قرآن جیسے معجزانہ کلام کو پڑھکر بعض لوگوں نے کہدیا۔

"اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ"

کہ یہ ہے کیا؟ صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

پس وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہ کرنے

کی کوشش کی۔ قرآن کریم کی ہدایت ہے اجتنبوا کثیرًا من الظنّ انّ بعض الظنّ اثم۔ کہ ظن کرنے سے بہت اجتناب کریں۔ کیونکہ بعض ظن گناہ ہوتے ہیں۔

ہم نے آپ کی ہمدردی اور خیر خواہی کے لئے آپ کی خواہش کے مطابق کوشش کی ہے۔ کہ آپ کے تمام سوالوں کا جواب اپنے اس آخری خط میں دے دیں۔ اور پھر آپ کے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دیں کیونکہ ہدایت خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اور تسلّی اور اطمینان اسی کی جانب سے آتا ہے۔ پس آپ بیکار بحثوں کو چھوڑ کر اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کریں اور اسی سے مدد چاہیں۔ اور اسی سے دریافت کریں۔ کہ بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام اپنے دعوےٰ میں صادق ہیں یا نہیں۔ لیکن یہ منزل بھی بڑی کٹھن ہے۔ جب تک انسان خالی الذہن ہو کر اور اپنے آپ کو جاہل سمجھ کر رجوع الی اللہ نہ کرے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا زنگ دُور نہیں ہو سکتا۔

بہرحال دُعا ہی ایک آخری ہتھیار ہے۔ جس سے کام لینے کی طرف ہم آپ کو توجہ دلا سکتے ہیں۔ اور جو سچے دل سے تضرع اور ابتہال کے ساتھ اپنے آپ کو بے علم اور جاہل سمجھتے ہوئے اللہ تعالےٰ کی طرف توجہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دُعا کو ضرور سُنتا ہے۔ اس نے فرمایا ہے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ نیز اس نے فرمایا ہے:۔ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ

اصل بات یہ ہے کہ سب برکت کی بنیاد تقویٰ اور حُسن ظنّی ہے اگر یہ نہ ہو تو مذہب ایک کھلونا ہے۔ جس سے لوگ کھیلتے رہتے ہیں۔

حضرت بانی سلسلۂ احمدیہ علیہ السلام نے اسلام کے سوا کسی اور مذہب کی طرف دعوت نہیں دی۔ وہ اسلام جس کے ارکان پانچ ہیں یعنی اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور روزے رکھنا۔ اور حج کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ ان ارکانِ اسلام میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ پھر ہمارے لئے آپ کو امت کا مسیح موعود اور امتی نبی ماننے میں کیا خطرہ ہے۔ اگر وہ سچے ہیں تو ہمیں دوہرا ثواب ملے گا۔ اور آپ انکار سے اپنے پہلے ثواب کو بھی کھو بیٹھیں گے۔ اگر حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ سچے نکل آئے تو قیامت کے دن آپ گھاٹے میں رہیں گے۔ اور ہم لوگ فائدے میں۔ اور بصورت دیگر ہم اور آپ برابر ہوں گے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ ہم خدا تعالے کے فضل سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام پر قائم ہیں۔ پس عقلمندی یہ ہے جو گھاٹے کے سودے سے بچے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے۔ کہ آپ بد ظنّی چھوڑ دیں اور حسن ظن سے کام لیں۔ ہم نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور آپ کے لئے بہت محنت کی ہے۔ کہ آپ کے جواب میں ہمیں ایک کتاب لکھنا پڑی ہے۔ اس لئے ہماری طرف سے اس چٹھی کا

آخری فیصلہ سمجھیں جس کے آپ متمنی ہیں۔

آپ نے صرف ایک غلطی کا یعنی تیئیس ۲۳ سالہ معیار کے متعلق اپنے ایک اعتراض کے غلط ہونے کا اعتراف کیا ہے مگر ہمارے کسی جواب کی صحت کا آپ نے اعتراف نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی طبیعت میں بہت قبض ہے۔ خدا تعالےٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ آپ کے لئے بسط کی حالت پیدا کرے۔ ہم بھی دُعا کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ آپ کا سینہ کھول دے۔ کیونکہ سینہ کھلے بغیر انسان حق کو نہیں پا سکتا۔ اس کی ضرورت تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی تھی۔ جو سیّد الانبیاء تھے اور خدا نے اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ کہہ کر آپ کی اس ضرورت کو خود پورا فرما دیا۔ اور پھر کئی لوگوں کے سینے قبولِ اسلام کے لئے کھول دیئے۔ جس کا سینہ کھل جاتا ہے۔ اُسے ایک نور دیا جاتا ہے اس نور کے ذریعہ ظلمتیں اور تاریکیاں جو الجھنوں اور پریشانیوں کی صورت میں آتی ہیں پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ اس لئے خدا تعالےٰ سے شرح صدر طلب فرمائیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کے ساتھ ہو۔ اور آپ کو شرح صدر عطا کرے۔ اور آپ کی رہنمائی فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ اٰمِیْن۔

یہ واضح رہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی ہے اس کی ذمہ داری نظارتِ اصلاح وارشاد پر ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالےٰ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ گو آپ اپنے خطوط انہی کی طرف ایڈریس کرتے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے جوابات کو انہوں نے

نہیں پڑھا۔ اس لئے یہ ہمارے جوابات ہیں۔ اگر ان میں درحقیقت کوئی خامی ہو تو اس کی ذمہ داری حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ امید ہے اب آپ مزید خط و کتابت سے ہمارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ خط و کتابت میں تو ایک آدھ سوال کا جواب مانگا جا سکتا ہے۔ خطوں کے جواب میں کتابوں کا لکھنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ اگر کچھ وقت نکال کر آپ ربوہ تشریف لائیں تو بالمشافہ گفتگو کر کے ہم آپ کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن تسلی کے ضامن نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ خدا تعالےٰ کی طرف سے آتی ہے۔ ربوہ تشریف لانے کی صورت میں آپ کے قیام و طعام کے ذمہ دار ہم ہوں گے۔ فقط والسلام

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٭

نوٹ:- ہم اپنی طرف سے یہ بحث ختم کر چکے تھے۔ لیکن اس مضمون کے ہماری طرف سے جمیل احمد صاحب کو بھجوائے جانے سے پہلے ان کی ایک اور تنقیدی چٹھی جو بعض نئے سوالات پر بھی مشتمل تھی موصول ہوئی۔ لہٰذا اب اس کا جواب بھی آگے درج کیا جا رہا ہے۔

قاضی محمد نذیر ناظر تصنیف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ
ھُوَالنَّــــــاصِرُ

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

مکرمی۔ اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

آپ کے آخری مضمون مرسلہ از سکھر مورخہ ۲۸ر جولائی ۱۹۷۶ء کا جواب حسبِ وعدہ ارسالِ خدمت ہے اور ہم نے یہ جواب معقول سمجھکر ہی دیا ہے۔ مگر آپ کا یہ مضمون اور ہمارا یہ جواب بھی حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ کی نظر سے نہیں گذرا۔ جس طرح ہمارا پہلا اور دوسرا مضمون بھی ان کی نظر سے نہیں گذرا۔ پس آپ کے مضامین سوائے پہلے مضمون کے ان کی نظر سے نہیں گذرے۔ لہٰذا جو جواب ہم دے رہے ہیں، وہ اپنی ذمہ داری پر دے رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ پر عائد نہیں ہوتی۔ گو آپ مخاطب انہیں ہی کرتے ہیں۔

آپ نے حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود کی یہ پیشگوئی پیش کی ہے کہ:۔

"میرے فرقے کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال
حاصل کریں گے کہ اپنے سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور
نشانوں کی رُو سے سب کا مُنہ بند کر دینگے"

اس کے پیش کرنے سے آپ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مُنہ بند کیا جائے اور اگر آپ کا مُنہ بند نہ ہُوا تو گویا آپ اس پیشگوئی کو غلط سمجھیں گے۔

جناب من! پیشگوئی میں منہ بند کر دیں گے کے الفاظ بطور محاورہ لاجواب کر دیں گے کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ سو ہم نے خدا تعالیٰ کے فضل اور اس کی دی ہوئی توفیق سے آپ کو لاجواب کر دیا ہے باقی رہا باتیں کرنا اور استہزاء کرنا سو اس میں تو آپ "ملاں آں باشد کہ چپ نہ شود" کا مصداق ثابت ہو رہے ہیں۔ ورنہ مسیح موعود علیہ السّلام کی پیشگوئی آپ کے حق میں پوری ہو چکی ہے۔ نہ آپ ہمارے دلائل کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ نشانوں کا۔ آپ حیات مسیح پر دراصل اسی لئے بحث پر آمادہ نہیں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اس علمی مسئلہ میں زیادہ چل نہیں سکتے۔ اس سے آپ کو اپنے اس عقیدہ کا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر بجسدہ العنصری زندہ موجود ہیں۔ پول کھل جانے کا خطرہ ہے۔ آپ حضرت اقدس کو مجنون اور پاگل تو قرار دینا چاہتے ہیں لیکن آیت یٰعیسیٰ انّی متوفّیک اور آیت کنت علیھم شھیدًا مادمت فیھم فلمّا توفّیتنی کے متعلق ان کے استدلالات کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں۔ تناقضات مفروضہ پر تو آپ کافی بحث کر چکے ہیں۔ بحث کو یہ کہکر ٹالتے رہے کہ:۔

"یہ فرض کر لیں کہ حضرت عیسےٰ فوت ہو چکے ہیں اور وہ دوبارہ دنیا میں نہیں آسکتے۔ اور یہ کہ مسیح کے نام پر آنے والے سے مراد کوئی مثیل مسیح ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو جائے گا کہ وہ مثیل مسیح مرزا صاحب ہی ہیں،

زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہو گی وہ یہی ہے کہ آنیوالا
مسیح کوئی مثیل ہے جو کوئی شخص بھی ہو سکتا ہے اور مرزا
صاحب بھی ہو سکتے ہیں نہ کہ مرزا صاحب وہ مثیل مسیح ہیں۔"

آپ کی یہ چھٹی ظاہر کرتی ہے آپ ہمیں تبلیغ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں نکلے ہیں۔ تو پھر جو کچھ ہم سمجھنا چاہتے ہیں وہ بھی سمجھائیے۔ اگر حیات عیسےٰ علیہ السلام کا ثبوت آپ فراہم کر دیں تو مرزا غلام احمد صاحبؑ کے مثیل مسیح ہونے کے دعویٰ پر آپ کو بحث کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ پھر یہی ماننا پڑے گا۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اصالتاً آئیں گے پس آپ یہ سادہ اور آسان راہ ہمیں تبلیغ کرنے کی چھوڑ کر کیوں پیچدار راہ تناقضات دکھانے کی اختیار کر رہے ہیں۔ جس سے آپ کو کچھ بھی حاصل نہ ہو گا کیونکہ آپ کبھی بھی حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کے کلام میں حقیقی تناقض اس کی مسلّمہ شروط کے ساتھ نہیں دکھا سکتے۔ آپ کے پیش کردہ مفروضہ اور مزعومہ "تناقضات پر کافی بحث ہو چکی ہے۔

اب اس آسان اور سیدھی راہ کی طرف آئیے۔ اور ایسے یقینی دلائل پیش کیجئے۔ جن سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا آسمان پر بجسدہ العنصری جانا اور بجسدہ العنصری نازل ہونا ثابت ہو۔ ایسا ثابت کرنے کے بعد ہی آپ ہم سے نزول ابن مریم کی پیشگوئی کی اس تاویل کو چھڑا سکتے ہیں کہ اس سے مثیل ابن مریم کا آنا مراد ہے۔ مگر ہمیں امید نہیں کہ آپ اس سیدھی اور آسان راہ کو اختیار کریں گے، کیونکہ اس کے اختیار

کرنے میں آپ کو اپنے اس عقیدہ کی موت نظر آتی ہے جس سے آپ چپکا رہنا چاہتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ:-

"میرے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ پہلے مرزا صاحب کو ایک عام نیک دل، صاف گو انسان ثابت کر دیا جائے کیونکہ اگر وہ ایک صحیح انسان بھی ثابت نہیں ہوتے تو ہمیں آگے بڑھ کر مزید تحقیق کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ صحیح عالم، مجدّد، محدّث یا ظلی بروزی نبی تھے یا نہیں اس لئے گزارش ہے کہ آپ پہلے یہ ثابت کریں کہ مرزا صاحب نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ قرآنی آیات سے غلط یا متناقض مفہوم نہیں نکالا۔ متناقض اور متضاد باتیں نہیں کیں۔ کیونکہ اگر مرزا صاحب خود اپنے قائم کئے ہوئے معیار کے مطابق غلط بیانی اور تناقض کی وجہ سے ایک عام نیک دل اور صاف گو انسان ثابت نہیں ہوتے بلکہ اپنے ہی قول کے مطابق پاگل یا مجنون ثابت ہوتے ہیں تو حیاتِ مسیح پر بحث کرنا بیکار ہے"

الجواب:- منکرینِ انبیاء نے انبیاء کو کبھی صحیح انسان نہیں مانا۔ بلکہ مفتری ہی قرار دیا ہے جو ان کی بدقسمتی کا ثبوت ہے۔ جنابِ من! تناقض کی تعریف کے مطابق نہ آپ حضرت مسیح موعود

علیہ السلام کے کلام میں تناقض ثابت کر سکے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں اور نہ آریہ اور عیسائی قرآن مجید میں تناقض ثابت کر سکے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں، وفات مسیح پر جو دلائل حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دیئے ہیں ان کا مقابلہ کرنے سے تو آپ عاجز ہیں اور پاگل آپ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں فستبصر و یبصرون بأیکم المفتون یہ آیت سامنے رکھیں۔ مجنون، رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی کہا گیا تھا اور خدا نے ایسا کہنے والوں کو جواب دیا تھا جو کچھ لکھا جا رہا ہے۔ وہ بتا رہا ہے کہ اے نبی تو اپنے رب کی نعمت سے مجنون نہیں۔ تمہارے کام کا اجر ملے گا۔ جو غیر منقطع ہوگا اور تو دیکھ لے گا۔ اور دنیا والے بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے دماغ خراب کس کا ہے۔ آپ لوگ بھی مسیح موعود علیہ السلام کے مقابل میں انشاء اللہ ناکام اور نامراد رہیں گے۔ یہ خدا کی تقدیر ہے۔ جو ظاہر ہو کر رہے گی۔

تذکرۃ الشہادتین میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ نے اپنے مکذبین کو جو دلائل سے استفادہ نہ کریں ذرا بے حیاء کہا ہے اور قرآن کریم نے رسول کریم صلعم کے منکروں کو شرّ البریّۃ کہا ہے۔ دیکھ لیں دونوں میں سے کونسا لفظ زیادہ سخت ہے۔ آپ نے احمدیوں کو جو آپ کو ظلی اور بروزی نبی مانتے ہیں بے حیاء کہکر اپنا سینہ ٹھنڈا کر لیا ہے۔ بہرحال اب آپ کے لئے گلہ شکوہ کا کوئی موقعہ نہیں رہا لیکن خدا آپ سے ضرور پوچھیگا کہ تم نے ہمارے مامور اور اس کے ماننے والوں کو کیوں بے حیاء کہا۔ اس کا

جواب سوچ لیں! ہمیں تو آپ پر رحم بھی آتا ہے۔ اللہ تعالےٰ دنیا میں ہی آپ کو اپنی اصلاح کا موقع دے تاکہ آپ قیامت کے دن جوابدہی سے بچ سکیں

بے شک حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سچ فرمایا ہے :-

"اگر یہ تمام مخالف مشرق اور مغرب کے جمع ہو جائیں تو میرے پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کر سکتے جس اعتراض میں گذشتہ نبیوں میں سے کوئی شریک نہ ہو"

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۷)

پس جنابِ من! دشمنانِ اسلام قرآن مجید میں تناقض دکھانے کی ناکام کوشش کرتے رہے ہیں اور آپ مسیح موعود علیہ السلام کے کلام میں تناقض دکھانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے۔ گذشتہ انبیاء کرام جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے سچے نبی تھے کیونکہ اگر وہ بھی خدا کی طرف سے نہ ہوتے۔ بلکہ کسی سازش یا منصوبے کے تحت انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور ایسی غلطیاں کرتے جس طرح مرزا صاحب نے کی ہیں۔

الجواب :- خدا کے نبی بے شک کسی سازش یا منصوبے کے تحت دعویٰ نبوت نہیں کرتے۔ مگر آپ نے یہ چبھتی ہوئی بات لکھی ہے۔ کہ گویا حضرت بانی سلسلہ کا دعویٰ کسی سازش یا منصوبے کے تحت تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا دعویٰ بھی کسی سازش یا منصوبہ پر مبنی نہیں۔ آپ نے جو دعویٰ بھی کیا خدا کی وحی کی روشنی میں کیا۔

لیکن آپ کا حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے دعویٰ کو کسی سازش یا منصوبے کا نتیجہ قرار دینا کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ اس سے حضرت اقدس کی اس بات کی سچائی کا ثبوت ہی ملتا ہے کہ جس قسم کے اعتراضات دوسرے نبیوں پر ہوئے آپ پر بھی اسی قسم کے اعتراضات کئے گئے۔ آپ کسی ایک نبی کا نام لیں جس کے دعویٰ کو اس کے منکرین نے اس کا منصوبہ نہیں جانا جب نبیوں کے منکرین انہیں مفتری علی اللہ قرار دیتے تھے تو کیا وہ ان کے دعویٰ کو منصوبہ نہیں جانتے تھے؟

دیکھئے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرعون نے کہا ان ھذان لساحران یریدان ان یخرجاکم من ارضکم بسحرھما ویذھبا بطریقتکم المثلیٰ فاجمعوا کیدکم ثم ائتوا صفًا وقد افلح الیوم من استعلیٰ یعنی موسیٰ اور ہارون دونو ملمع ساز ہیں۔ یعنی ان کا ہمارے خلاف کوئی مخفی منصوبہ ہے یہ دونو چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری زمین سے نکال دیں۔ (یعنی حکومت پر قبضہ کر لیں) اور تمہارے عمدہ مذہب کو مٹا دیں پس تم اکٹھے ہو کر تدبیر کرو اور پھر صف بستہ ہو کر آجاؤ۔ آج وہی کامیاب ہوگا جو غالب آگیا۔ یہاں فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو منصوبہ ساز قرار دیا ہے اور سیاسی لوگوں کو بھی ان دونوں کے خلاف بھڑکایا اور مذہبی لوگوں کو بھی سیاسی لوگوں کو یہ کہکر بھڑکایا کہ یہ دونوں حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور مذہبی لوگوں کو یہ کہکر بھڑکایا کہ یہ تمہارے عمدہ مذہب کو مٹانا

چاہتے ہیں اس لئے تم ان کے مقابلہ میں حیلہ سازی سے کام لو اور غلبہ پانے کی کوشش کرو۔ پس حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کو منصوبہ باز لکھ کر آپ نے کوئی نیا اعتراض تو نہیں کیا ہے آپ نے اس بات کی تصدیق کا سامان ہی فراہم کیا ہے۔ کہ آپؑ پر وہی اعتراض ہوتے ہیں جو دوسرے نبیوں پر کئے گئے آپ کی تدبیر بھی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو ناکام کرنا چاہتی ہے لیکن خدا تعالےٰ نے آپ کو الہاماً فرمایا ہے لا نبقی لک من المخزیات ذکرًا و لا نبقی لک من المخزیات شیئًا کہ تجھے رُسوا کرنیوالی باتیں باقی نہیں رہیں گی ان کا ذکر بھی باقی نہیں رہے گا۔ ان الفاظ میں کتنے عظیم الشان غلبہ کی خبر دی گئی ہے۔ پس آپ لوگ حضورؑ کے خلاف زور لگا لیں اور ناخنوں تک زور لگا لیں اور ہر قسم کی غلط بیانی سے کام لیں خدائی فیصلہ یہی ہے کہ آپ لوگ اس میں ناکام رہیں گے آپ لوگ ہرگز آپؑ کے کلام میں کوئی حقیقی تناقض ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہونگے۔

دو قسم کی غلطیوں کے عنوان کے تحت آپ نے بحوالہ چشمہ معرفت ص۲۸۶ طبع اوّل و بحوالہ تجلّیات الٰہیہ ص۲۹ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بیان سے یہ دکھایا ہے کہ نبی کریمؐ کے گیارہ لڑکے پیدا ہوئے تھے اور سب کے سب فوت ہو گئے تھے یہ غلط بات ہے۔ مرزا صاحب سے لڑکوں کی تعداد بتانے میں غلطی ہوئی ہے جو قابل معافی ہے اس معافی کی وجہ آپ یہ بتاتے ہیں کہ اصل زیر بحث لڑکوں کی تعداد نہیں بلکہ نبی کریمؐ کا خدا تعالےٰ سے گہرا تعلق ہے اور دوسری عبارت میں یہ ثابت کرنا مقصود ہے

کہ کسی کی اولاد کا مر جانا یہ ثابت نہیں کرتا کہ خدا تعالےٰ اس سے ناراض
ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نبی کریمؐ کے لڑکے فوت نہ ہوتے۔ میں نے ایسی
غلطیوں کو چھوڑ کر صرف وہ غلطیاں لی ہیں جن سے مرزا صاحب پر غلط بیانی
تناقض، قرآن مجید کے مطالب کو نہ سمجھنا یا کسی دعویٰ کے غلط ہونے کا
الزام عائد ہوتا ہے۔

آپ نے بظاہر بڑی سخاوت سے کام لیا ہے کہ حضرت مسیح موعود
علیہ السلام کی اس غلطی کو کہ آنحضرتؐ کے گیارہ لڑکے فوت ہوئے قابلِ
معافی قرار دیا ہے بدیں وجہ کہ مقصود اس جگہ آپ کا خدا تعالےٰ سے گہرا
تعلق ظاہر کرنا تھا نیز یہ ثابت کرنا کہ خدا آپ سے ناراض نہیں۔ لیکن
تعجب ہے کہ یہ سخاوت آپ سے قرآن کریم کے پانچ سو یا چھ سو یا ساٹھ سو
احکام ظاہر کرنے کے متعلق نہیں ہوئی۔ حالانکہ مقصود ان عبارتوں سے
بھی یہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام احکام پر عمل کیا جائے۔ رہا تناقض کا
مسئلہ اس کا جواب ہم آپ کو دے چکے ہیں کہ ان عبارتوں میں کوئی تناقض
نہیں بلکہ احکام القرآن کے بارے میں تینوں بیانوں کی تعداد کی وجہ
الگ الگ ہے۔ اگر آپ ان وجوہ کو بھی تسلیم نہ کریں تو آخری بیان کے
مقابلہ میں پہلے بیانوں کو منسوخ مان لیں۔ کیونکہ مسلمہ قاعدہ کے مطابق
نبی سے آخری بات ہی اخذ کی جاتی ہے۔

تاریخ سے نبی کریمؐ کے گیارہ بچوں کا وفات پانا تو ثابت ہے باقی
یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ حضورؐ کے ہاں گیارہ لڑکے ہوئے تھے یا نہیں؟

جب اس بات کا امکان ہے کہ گیارہ لڑکے ہوئے تھے تو پھر آپکی معافی کی بھی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ایک روایت تاریخ الخمیس ص۳۰۷ و ص۳۰۸ اور مدارج النبوۃ جلد ۲ ص۴۷۹ میں بعثت نبوی کے بعد آپ کے ہاں گیارہ لڑکے پیدا ہونے کی بھی آئی ہے۔ سیرت حلبیہ جلد ۳ ص۳۴۵ تا ۳۴۷ میں ان سب کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔

محدّث اور اُمتی نبی

آپنے حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کے کلام میں تناقض دکھانے کیلئے کہا ہے کہ آپ پہلے اپنے آپ کو محدث قرار دیتے رہے اور بعد میں نبی کہدیا مگر جناب من اجب ایسے دو عقیدوں کا زمانہ آپ جانتے ہیں کہ مختلف ہے تو پھر آپ حضرت اقدس کے کلام میں حقیقی تناقض کس طرح قرار دیتے ہیں جب تناقض حقیقی تب قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ بیک وقت آپ اس بات کے بھی قائل ہوں کہ آپ نبی نہیں۔ بلکہ محدث ہیں اور اس بات کے بھی قائل ہوں۔ کہ آپ نبی ہیں۔ مگر یہ بات تو پائی نہیں گئی۔ اور یہ بات آپ خوب جانتے ہیں کہ حضرت مسیح موعودؑ نے پہلا عقیدہ اپنی نبوت کو اپنی اصطلاح مخصوص میں محدثیت قرار دینے کا سانہ ۱۹۰۱ء میں ترک کر دیا تھا اور اپنے آپ کو نبی قرار دیدیا تھا۔ مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے اُمتی۔ اندریں حال پہلا عقیدہ ترک کرنے کی وجہ سے وہ حجت نہ رہا۔ اور آپنے اس کے خلاف دوسرا عقیدہ اختیار کر لیا۔ تو پھر آپ کے کلام میں حقیقی تناقض پیدا نہ ہوا۔ جس کیلئے وحدت زماں بھی شرط ہے جو ان دو عقیدوں میں موجود نہیں۔

یہ امر آپ پر واضح رہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اپنی نبوّت کی اس تفصیلی کیفیت کے بارہ میں ہمیشہ ایک ہی عقیدہ رہا ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کی ہمکلامی سے مشرف ہیں وہ آپ پر امور غیبیہ کا اظہار کرتا ہے اور اس نے آپ کو ایسے مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ کی نعمت سے سرفراز کیا جانے کی وجہ سے ہی نبی کا نام دیا ہے اس طرح کہ آپ نبی بھی ہیں اور امتی بھی۔ آپ نہ مستقل تشریعی نبی ہیں نہ مستقل غیر تشریعی نبی جو امتی نہیں کہلاتا۔ پس آپ کا عقیدہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے امتی کا پہلے بھی موجود تھا صرف اس کی تاویل محدّث یا جزئی نبی آپ نے ترک کی ہے اور وہ بھی متواتر وحی سے جس میں آپ کو صریح طور پر نبی کا خطاب دیا جانے کا انکشاف ہُوا۔

محدّث اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا نام نبی اور رسول بھی رکھا اور یہ بھی فرمایا تھا انت محدّث اللہ۔ احادیث نبویّہ میں وارد تھا کان فی بنی اسرائیل رجالٌ یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یک فی امّتی فانہ عمر کہ بنی اسرائیل میں ایسے مرد بھی ہوئے جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا تھا مگر وہ نبی نہ تھے۔ اگر میری امت میں کوئی ایسا ہے تو حضرت عمرؓ ضرور ایسے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں وارد تھا کان فی من قبلکم من الامم محدثون فان یک فی امّتی احد فعمر ابن الخطاب۔ کہ پہلی امتوں میں محدّث ہوئے ہیں اگر میری امت میں کوئی محدّث ہے تو وہ حضرت

عمر بن خطاب ضرور ہیں۔ ان دو حدیثوں سے حضرت عمرؓ کا غیر مامور محدث ہونا ثابت ہے۔ ائمۂ حدیث نے ان حدیثوں سے نتیجہ نکالا کہ محدّث وہ شخص کہلاتا ہے۔ جو نبی تو نہیں ہوتا۔ لیکن خدا تعالےٰ اس سے ہمکلام ضرور ہوتا ہے۔ پس حضرت عمرؓ ایسے محدّث تھے جنہیں خدا تعالےٰ نے نبی کا نام نہیں دیا تھا۔ علامہ ابن اثیر نے جو لغت حدیث کے امام ہیں ۔ اپنی کتاب "نہایہ" میں لکھا ہے کہ محدّثین خدا سے الہام یافتہ ہوتے ہیں۔ یہی معنیٰ "تاج العروس" میں ہیں جو لغت عربی کی مستند لغت ہے لکھے ہیں۔ حضرت مجدّد الفِ ثانی علیہ الرحمۃ نے اپنے مکتوبات جلد دوم مکتوب ۵۱ میں لکھا ہے:۔

ان کلام اللّٰہ قد یکون شفاھًا وذالک الافراد من الانبیاءِ وقد یکون لبعض الکُمّل من متابعیھم واذا کثر ھذا القسم مع واحدٍ منھم سُمّیَ مُحدثًا کما کان عمرؓ۔

ترجمہ:۔ خدا نبیوں سے بالمشافہ کلام کرتا ہے اور کبھی ایسے مکالمہ کا شرف ان کے بعض کامل متبعین کو بھی حاصل ہوتا ہے اور جب اس قسم کا کلام کسی سے بکثرت ہو تو وہ محدّث کہلاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت عمرؓ محدّث تھے۔

پھر وہ ایک مکتوب میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:۔

تابع در رنگ متبوع چناں منصبغ مے شود کہ ہیچ فرق نمے ماند

در تابع و متبوع الّا بالاصالۃ والاولیۃ والتبعیۃ والوراثۃ"

ترجمہ :- کہ تابع یعنی امتی اپنے متبوع نبی کے رنگ میں اس طرح رنگین ہو جاتا ہے۔ کہ متبوع نبی اور اس کے تابع امتی میں سوائے اصالت اور اولیّت اور تبعیّت اور وراثت کے کوئی فرق نہیں رہتا۔

قرآن مجید کی قرأت متواترہ میں تو محدّث کا لفظ موجود ہی نہیں۔ البتہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا تتنزّل علیھم الملٰئکۃ الّا تخافوا و لاتحزنوا وابشروا بالجنّۃ الّتی کُنتُم توعدون۔ نحن اولیاءکم فی الحیٰوۃ الدنیا والأخرۃ (حم سجدہ آیت ۳۰)

ترجمہ :- جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اس امر پہ پکے ہو گئے ان پر خدا کے فرشتے اترتے ہیں (یہ کہتے ہوئے کہ تم کوئی خوف اور غم نہ کرو اور اس جنت کی بشارت پاؤ جس کا تم وعدہ دیئے گئے ہو۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے مددگار ہیں اور آخرت میں بھی۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن العربی نے فتوحات مکیہ کے باب الاستقامۃ

میں اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ:۔

هٰذا التنزيل هو النبوّة العامة لا نبوّة التشريع

کہ ملائکہ کا اس طرح مستقیم الحال مومن پر کلام اتارنا نبوت عامہ ہے، تشریعی نبوت نہیں۔ گویا ان کے نزدیک نبوتِ عامہ سے حصہ مومنین مستقیم الاحوال کو بھی ملتا ہے لیکن یہ نبوّت تشریعی نہیں ہوتی۔ نبوت عامہ کو وہ دوسری جگہ نبوّة الولاية بھی کہتے ہیں۔ جو ان کے نزدیک نبوّت مطلقہ ہے اور محدثیت کو بھی اس کی ایک جزو قرار دیا ہے مگر انہوں نے نازل ہونے والے عیسیٰ کو نبوّت مطلقہ کے ساتھ نازل ہونے والا ولی قرار دیا ہے۔ گویا اس کے لئے نبوّة الولاية یعنی نبوت مطلقہ قرار دی ہے اور اسے نبی بھی کہا ہے۔ قرآن مجید کی آیت وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبيّ الّا اذا تمنّٰى القى الشيطان فى امنيته فينسخ الله مايلقى الشيطٰن ويحكم اٰيٰته (سورة حج ع ۵۲) کی ایک دوسری قرأت میں جو حدیثوں اور تفسیر درِ منثور میں درج ہے ولا نبی کے بعد ولا محدث کے الفاظ بھی مذکور ہیں۔ اس قرأت کے لحاظ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبی اور رسول کے علاوہ محدّث کے بھیجا جانے یعنی مامور ہونے کا ذکر ارسلنا کے لفظ میں موجود ہے اور اس پر نازل ہونے والی وحی کو بھی رسول اور نبی کی طرح دخلِ شیطان سے پاک قرار دیا گیا ہے۔ پس گذشتہ زمانوں میں محدّثین بھی نبیوں اور

رسولوں کی طرح مرسلین کے زمرہ میں داخل تھے۔

گو اس قرأت میں من رسول ولا نبی ولا محدّث کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ محدّث کو بھی مامور ہی قرار دیا گیا ہے لہذا اس جگہ گو نبی اور رسول اور محدث مفہوم الگ الگ رکھتے ہیں۔ جس طرح نبی اور رسول الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں لیکن ان کا مصداق ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ بعض علماء نے جیسا کہ مفرادات القرآن میں لکھا ہے آیت کریمہ یٰایّھا الرسل کلوا من الطیبٰت واعملوا صالحا میں ان رسل کو خلفاء قرار دیا ہے اور انہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ضم کرکے رسل جانا ہے سو رسول اور نبی میں۔ بعض نے عموم خصوص مطلق مانا ہے کہ ہر رسول نبی نہیں ہوتا اور ہر نبی ضرور رسول ہوتا ہے۔ مگر بعض نے نبوت کو رسالت سے عام قرار دیا ہے۔ پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدّث کی قرأت میں جن محدثین کے مرسل ہونے کا ذکر ہے ان پر نازل ہونے والے کلام کا رسولوں اور نبیوں کی طرح دخل شیطان سے منزّہ ہونا اور ان کا مامور ہونا تو بہرحال مذکور ہے۔ اس لئے یہ محدّثین مرسلین میں داخل ہونے کی وجہ سے خدا سے امور غیبیہ پر اطلاع پاکر تبشیر و انذار کا کام ضرور کرتے تھے کیونکہ خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین۔ (سورۃ کہف آیت ۵۷) اور نبیوں کے

متعلق فرمایا۔ فبعث اللہ النّبییّن مبشّرین ومنذرین۔ (البقرہ آیت ۲۱۳) اور رسولوں کے متعلق فرمایا۔ رسلا مبشرین ومنذرین (نساء: ۱۶۵)

پس گو ان محدثین کو کوئی الگ کتاب یا شریعت نہ دی جاتی تھی لیکن وہ مرسلین میں داخل تھے۔ اور ایک حد تک نبی اور رسول ضرور تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی نبی اور رسول امتی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لکھا:۔

"اسلام کی اصطلاح میں نبی اور رسول کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ کامل شریعت لاتے ہیں یا بعض احکام شریعت سابقہ کے منسوخ کرتے ہیں یا نبی سابق کی امت نہیں کہلاتے اور براہ راست بغیر استفاضہ کسی نبی کے خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔"

(الحکم جلد ۳ نمبر ۲۹ مکتوب ۱۸۹۹ء)

یہ اصطلاحی تعریف نبوت لکھنے کے بعد آپ نے لوگوں کو اپنے متعلق غلط فہمی سے بچانے کے لئے ساتھ ہی تحریر فرمایا:۔

"اس لئے ہوشیار رہنا چاہیئے کہ اس جگہ یہی معنی نہ سمجھ لیں۔"

جناب من! یہ تعریف استقرائی ہے اور سابقہ انبیاء کو ملحوظ رکھکر قیاس کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ یہ رائج تھی اور درست سمجھی جاتی

تھی۔ اس لئے جب خدا تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو نبی اور رسول کہا تو بوجہ امتی ہونے کے آپ اس تعریف کے مطابق نبی نہیں کہلا سکتے تھے۔ اس لئے آپ نے خبردار کیا کہ آپ کو اس قسم کا نبی (یعنی تشریعی نبی یا براہ راست مستقل نبی) نہ سمجھ لیا جائے۔ پس تشریعی نبی اور مستقل نبی ہونے کا شروع سے لیکر تادمِ واپسیں آپ نے کبھی دعویٰ نہیں کیا۔

چونکہ خدا تعالےٰ نے آپ کو نبی اور رسول بھی کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ انت محدّث اللہ۔ اس لئے آپ نے اپنے متعلق نبی کے لفظ کو تبادیل محدّث اختیار کیا۔ اور (نبی صرف تشریعی اور مستقل نبی ہی کو جانا اور نبوت تشریعی یا نبوّتِ مستقلہ کے مقابلہ میں اپنی نبوّت کو جزوی نبوت قرار دیا۔ اور محدّث کے متعلق اپنی اجتہادی اصطلاح میں محدّث کے تمام کمالات مذکورہ کو آخری حد تک لیکر محدث کے ایک معنے بیان فرما دیئے جن میں اپنے حالات اور واردات کے علاوہ دیگر مجددین کے حالات و واردات کو بھی ملحوظ رکھا۔ اور محدّث والی قرأت ثانیہ کو بھی ملحوظ رکھا۔ اور حدیث لم یبق الا المبشرات کے پیش نظر رکھا۔

"یہ عاجز خدا تعالےٰ کی طرف سے اس امّت کے لئے محدّث ہو کر آیا ہے۔ اور محدّث بھی ایک معنی سے نبی ہی ہوتا ہے گو اس کے لئے نبوّتِ تامہ نہیں مگر تاہم جزوی طور پر وہ

ایک نبی بھی ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے ہمکلام ہونیکا
ایک شرف رکھتا ہے۔ امور غیبیہ اس پر ظاہر کئے جاتے
ہیں۔ اور رسولوں اور نبیوں کی طرح اس کی وحی کو بھی
دخل شیطان سے منزہ کیا جاتا ہے۔ اور مغز شریعت
اس پر کھولا جاتا ہے اور بعینہٖ انبیاء کی طرح مامور
ہوکر آتا ہے۔ اور انبیاء کی طرح اس پر فرض ہوتا ہے
کہ اپنے تئیں باواز بلند ظاہر کرے اور اس کا انکار
کرنے والا ایک حد تک مستوجب سزا ٹھہرتا ہے۔ اور
نبوّت کے معنی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ امور متذکرہ
بالا اس میں پائے جائیں . . . . مگر یہ بات
بحضور دل یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ نبوّت جس کا ہمیشہ
کے لئے سلسلہ جاری رہے گا۔ نبوّتِ تامہ نہیں جیسا کہ
میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ وہ صرف ایک جزوی نبوّت ہے
جو دوسرے لفظوں میں محدّثیت کے اسم سے موسوم ہے
جو انسانِ کامل کے اقتداء سے ملتی ہے۔ جو مستجمع جمیع
کمالاتِ نبوّت تامہ یعنی ذات ستودہ صفات حضرت
سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔
ناعلم ارشدک اللہ تعالیٰ ان النبی محدث والمحدث
نبی باعتبار حصول نوع من انواع النبوّۃ۔"

(توضیح مرام طبع اوّل صفحہ ۱۸-۱۹)

اس اقتباس کے آخری فقرہ کا ترجمہ یہ ہے کہ

جان لے خدا تعالیٰ تجھے ہدایت دے کہ بیشک نبی محدّث ہے اور محدّث بھی نبوّت کی قسموں میں سے ایک قسم کی نبوت رکھنے کی وجہ سے نبی ہے۔

اس سارے بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو نبوّت تشریعی اور نبوّت مستقلہ کا کوئی دعوٰی نہیں تھا جو پہلے انبیاء کو پہلے براہ راست حاصل ہوتی رہی۔ بلکہ آپ کو اسی نبوّت کا دعوٰی تھا۔ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ جو مستجمع جمیع کمالات نبوّتِ تامہ ہیں۔ مندرجہ بالا عبارت میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو اپنی اجتہادی اصطلاح میں محدّث کی تعریف کی ہے اس میں آخری حد تک پہنچنے والا محدّث مراد ہے۔ اور ساتھ ہی یہ تحریر فرمادیا ہے کہ:۔

"نبوّت کے معنی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ امور متذکرہ بالا اس میں پائے جائیں" (توضیح مرام ص۱۸)

پس مذکورہ بالا سات ارکان و اجزاء محدّث کے لحاظ سے یہ محدّثیت معنوی طور پر غیر تشریعی نبوّت تھی۔ مگر چونکہ نبوّت کی معروف اور مروج اصطلاح میں یہ بات پاتے تھے۔ کہ امتی اور نبی میں تناقض ہوتا ہے یعنی کوئی نبی امتی نہیں کہلاتا۔ اس لئے آپ نے نبوّتِ تامہ کو اپنی اصطلاح میں نبوت تشریعیہ و نبوت مستقلہ قرار دیا اور اپنے تئیں

اس اصطلاح میں نبی قرار نہیں دیا۔ بلکہ فرق کرنے کے لئے اپنی اصطلاح میں اپنے آپ کو جزئی نبی لکھا۔ اور بالفاظِ دیگر اُسے محدّث قرار دیا اور محدّث کو بھی جزئی نبی کے معنی میں نبی کہنا جائز رکھا۔ اور یہ بھی بتادیا کہ ویسے ہر نبی محدث بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ علی وجہ الکمال شرف مکالمہ من اللہ الہیہ رکھتا ہے۔ اس لئے آپ نے اپنے متعلق الہام الٰہی انت محدث اللّٰہ کے الفاظ کی یہ تاویل کی کہ آپ اپنی اس اصطلاح محدث کے لحاظ سے جزئی نبی ہیں۔ نبی کے ساتوں اجزاء تو آپ میں موجود ہیں۔ لیکن چونکہ نبی کے لئے اصطلاحی تعریف نبوّت میں امتی نہ ہونے کی شرط ہے اور یہ شرط آپ میں پائی نہیں جاتی۔ اس لئے آپ اسلام کی اس معروف اصطلاح میں نبی اور رسول نہیں۔ توضیح مرام کا مندرجہ بالا بیان ۱۸۹۱ء کا ہے۔ جبکہ آپ اپنے مسیح موعود ہونے کا اعلان کرچکے ہوئے تھے۔ چونکہ آنے والے مسیح کو حدیثوں میں نبی اللہ بھی کہا گیا تھا۔ اس لئے اس وقت آپ نے اپنے نبی ہونے کو بتادیل محدث پیش کیا "تا مسلمانوں کو یہ دھوکہ نہ لگے کہ آپ مستقلہ نبوّت کا دعویٰ کررہے ہیں۔ کیونکہ ایک امتی شخص امتی رہتے ہوئے نہ تشریعی نبوت کا دعویٰ کرسکتا تھا نہ غیر تشریعی مستقلہ نبوت کا۔ کیونکہ نبوت کی استقرائی اصطلاح میں نبی کے لئے امتی نہ کہلانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس وقت کے ماحول میں اپنی نبوّت کا اس سے زیادہ مرتبہ بیان ہی نہیں کرسکتے تھے۔ ہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس جزئی نبوت کا ایک نام آپ نے ایک پہلو

سے نبی اور ایک پہلو سے امتی قرار دیا ہے۔ تا آپ کے متعلق تشریعی اور مستقلہ نبوت کا شبہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ ازالہ اوہام میں آپ تحریر فرماتے ہیں :-

"ہاں یہ سچ ہے کہ آنے والے مسیح کو نبی بھی کہا گیا ہے اور امتی بھی۔ . . . . اسی لئے براہین احمدیہ میں بھی اس عاجز کا نام امتی بھی رکھا اور نبی بھی۔"

(ازالہ اوہام ص۵۳۳ طبع اوّل)

نیز یہ لکھنے کے بعد کہ خاتم النبیین ہونا ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا کسی دوسرے نبی کے آنے میں مانع ہے آگے بطور وضاحت تحریر فرمایا۔

"ہاں ایسا نبی جو مشکوٰۃ نبوت محمدیہ سے نور حاصل کرتا ہے اور نبوت تامہ نہیں رکھتا۔ جس کو دوسرے لفظوں میں محدث کہتے ہیں وہ اس تحدید سے باہر ہے۔"

اور دلیل اس تحدید سے باہر ہونے کی یہ تحریر فرمائی :-

"کیونکہ وہ بباعث اتباع اور فنا فی الرسول ہونے کے جناب ختم المرسلین کے وجود میں ہی داخل ہے۔ جیسا کہ جز کل میں داخل ہوتی ہے۔"

(ازالہ اوہام ص۵۷۵ طبع اوّل)

پس کامل نبی کا بھی امت محمدیہ میں تب ہی آنا ممکن ہو سکتا ہے ، کہ وہ بباعث اتباع اور فنا فی الرسول کے جناب ختم المرسلینؐ کے وجود میں

داخل ہو جیسا کہ جزو کل میں داخل ہوتی ہے پس کامل ظلی نبی بھی خاتم النبیین کی اس تحدید سے باہر ہو سکتا ہے جبکہ وہ ایک پہلو سے نبی ہو اور ایک پہلو سے امتی بھی۔ لہذا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو جو مستقل نبی اور رسول ہیں اس تحدید سے باہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کا آنا تو صریح طور پر خاتم النبیین کی آیت کے منافی ہونے کے لحاظ سے محال ہے کیونکہ مستقل نبی امتی نہیں ہوتا۔ کہ امتی نبی کا اوپر کی دلیل کے مطابق نبوت مطلقہ کے ساتھ آنا آیت خاتم النبیین کے منافی نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ مشکوٰۃ نبوتِ محمدیہ سے نور حاصل کرنے والا ہوگا۔ اس لئے وہ بھی خاتم النبیین کی تحدید سے باہر ہوگا کیونکہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی شرط سے مقام نبوت پائے گا۔ اور ختم المرسلین سے اس کا وجود بلحاظ نبوت الگ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس میں نبوتِ محمدیہ کی نبوتِ مطلقہ کا ہی انعکاس تام ہوگا۔

اب صورتِ حال یوں ہوئی کہ سنہ ۱۹۰۱ء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو وضاحت اور تصریح سے نبی قرار دے دیا۔ اور اس بارہ میں متواتر وحی نازل فرمائی تو اس سے آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور افاضہ روحانیہ سے آپ کا ایک اُمتی بھی واقعی نبی ہو سکتا ہے مگر وہ ہوگا ایک پہلو سے امتی اور ایک پہلو سے نبی۔ پس امتی ہونا اس صراحت سے مانع نبوت نہ رہا۔ اور معروف اصطلاحی نبوت قابلِ ترمیم قرار پائی کیونکہ وہ جا ح

نہ تھی۔ اور وہ ایک امتی کے نبی ہونے میں روک تھی۔ پس محدث کی اصطلاحی تعریف جو آپ نے اپنے اجتہاد سے فرمائی تھی۔ وہ اس صراحت اور انکشاف کے بعد قابل حجت نہ رہی۔ اس سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان خاتمیت کی پوری حقیقت کھل گئی کہ ایک امتی بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض سے مقام نبوت پا سکتا ہے لیکن پہلے انبیاء کے افاضہ سے ان کا امتی محدثیت کے عام مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ یہ خاتم النبیین کا ہی کمال ہے کہ آپ کی پیروی کمالات نبوت بخشتی ہے اور آپ کی توجہ روحانی نبی تراش ہے۔ یہ قوتِ قدسیہ کسی اور نبی کو نہیں ملی۔ پس فنا فی الرسول ہونے کی برکت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین کے افاضہ کی حد صرف یہ نہ ہوئی کہ اس سے محدثیت کی حد تک کمالاتِ نبوت ملتے ہیں بلکہ اس کی حد یہ ثابت ہوئی کہ خود نبوت بھی ظلی اور طفیلی طور پر آپ کے فیض سے مل سکتی ہے۔

اس انکشافِ جدید سے نبوت کے حقیقی معنی میں ترمیم لازم آئی اور آپ نے تحریر فرمایا۔

> "نبی کے حقیقی معنوں پر غور نہیں کی گئی۔ نبی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا سے بذریعہ وحی خبر پانے والا اور شرف مکالمہ مخاطبہ سے مشرف ہو۔ شریعت کا لانا اس کے لئے ضروری نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ صاحبِ شریعت رسول کا متبع نہ ہو۔ پس ایک امتی کو ایسا نبی قرار دینے میں کوئی محذور

لازم نہیں آتا۔" (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۳۸)
چشمۂ معرفت میں لکھا:۔

"خدا کی یہ اصطلاح ہے جو کثرت مکالمات و مخاطبات کا نام اس نے نبوّت رکھا ہے۔ یعنی ایسے مکالمات جن میں اکثر غیب کی خبریں دی گئی ہیں۔" (چشمہ معرفت ص۳۲۵)

جناب من! یہ آپ کی ناسمجھی ہے کہ عقیدہ نبوّت میں اس تبدیلی سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کلام میں آپ کو کوئی تناقض نظر آتا ہے اس لئے آپ انہیں ایک نیک انسان بھی ماننے کو تیار نہیں۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ در اصل تناقض جو محال ہوتا ہے وہ اس صورت میں محال ہوتا ہے کہ بیک وقت دو متناقض باتیں ایک شخصیّت میں متحقق سمجھی جائیں۔ لیکن جب دونوں باتوں کا زمانہ الگ الگ ہو تو پھر حقیقی تناقض وقوع میں نہیں آتا۔ پس آپ کے کلام میں حقیقی تناقض تب ہوتا جب دوسرا عقیدہ اختیار کرنے پر آپ نے اپنا پہلا عقیدہ ترک نہ کیا ہوتا۔ لیکن پہلا عقیدہ تو آپ نے ترک کر دیا۔ اور وحیٔ الٰہی کی روشنی میں دوسرا عقیدہ اختیار کر لیا تو حقیقی تناقض نہ پایا گیا۔ چنانچہ خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس بظاہر تناقض کے پیدا ہونے کی وجہ بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ کہ میری کلام میں کچھ تناقض نہیں۔ میں تو خدا کی وحی کی پیروی کرنے والا ہوں۔ جب تک مجھے اس سے

علم نہ ہوا۔ مَیں وہی کہتا رہا جو اوائل میں مَیں نے کہا اور جب مجھ کو اس کی طرف سے علم ہوا تو مَیں نے اس کے مخالف کہا۔ مَیں انسان ہوں۔ مجھے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں۔ بات یہی ہے جو شخص چاہے قبول کرے یا نہ کرے۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۰)

اگر آپ دو وقت کے عقیدوں کو جن میں سے پہلے کو ترک کرکے دوسرے کو اختیار کیا گیا ہو قابلِ اعتراض امر جانتے ہیں۔ اور ایسا کرنے والا آپ کے نزدیک ایک عام نیک آدمی بھی ثابت نہیں ہوتا تو پھر ہم یہ جاننے اور سمجھنے کے لئے مجبور ہوں گے کہ آپ کو علمِ منطق سے کوئی مس نہیں اور یہ خیال کرنے کے لئے بھی مجبور ہونگے کہ آپ کو اسلام چونکہ ورثہ میں ملا ہے۔ اس لئے آپ مسلمان ہیں۔ ورنہ اگر آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو شاید تناقض کی یہ غلط بحث آپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانے سے محروم رکھتی۔ کیونکہ اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر اپنی شان کے بارہ میں پہلے بیان سے مختلف انکشاف وحی الٰہی کے ذریعہ ہوا ہے۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی پہلے عقیدہ سے مختلف انکشاف وحی الٰہی کے ذریعہ ہوا تھا۔ دیکھئے۔ مکہ مکرمہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہو چکی تھی کہ وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرًا و نذیرًا۔ کہ اے نبیؐ ہم نے تم کو سب لوگوں کی

طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اس آیت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام پہلے نبیوں پر فضیلت رکھنے کا استدلال ہو سکتا تھا لیکن بوجہ انکسار طبع اپنی نبوت کے تقریبًا ۱۸ سال تک آپؐ نے تمام انبیاء سے اپنے افضل ہونے کا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ جب بھی کسی نے آپؐ کو موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت دی تو آپؐ نے فرمایا۔ لاتخیّرونی علیٰ موسیٰ۔ کہ مجھے موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو اور جب کسی نے آپؐ کو خیرالبریّۃ (تمام مخلوق سے بہتر) کہا تو آپ نے فرمایا۔ ذالکَ ابراھیم۔ یہ تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کے ذکر پر بھی فرمایا۔ لاتفضلونی علیٰ یونس بن متی کہ مجھے یونسؑ بن متی پر فضیلت نہ دو۔

لیکن جب آپؐ کی نبوّت پر قریبًا ۱۸ سال گذر گئے تو آپؐ پر آیت خاتم النبیّن نازل ہوئی جس سے بالصراحت یہ جان گئے کہ آپؐ اپنی شان اور مرتبہ میں تمام انبیاء پر فضیلت رکھتے ہیں اور آپؐ نے فرمادیا۔ فضلت علی الانبیاء بستٍ (صحیح مسلم) کہ مَیں چھ باتوں میں سب انبیاء سے افضل ہوں۔ اس حدیث میں پانچویں وجہ فضیلت اُرْسِلْتُ الی الخلق کافّۃً" بیان فرمائی کہ مَیں سب مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہوں اور چھٹی وجہ اپنا خاتم النبیّن ہونا بیان فرمائی۔ اور ایک دوسری حدیث میں یہ بھی فرمادیا۔ لو کان موسیٰ حیًّا لما وسعہ الا اتباعی۔ کہ اگر موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو انہیں میری پیروی کے بغیر

چارہ نہ ہوتا۔ نیز ایک حدیث میں یہ بھی فرما دیا۔ انا سید النبیین من الاولین والاخرین (دیلمی) کہ میں تمام پہلے اور پچھلے نبیوں کا سردار ہوں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بعض نادان موحدوں کے بالمقابل جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دیگر انبیاء پر کلی فضیلت کے قائل نہ تھے اور دلیل میں لاتفضلونی علیٰ یونس بن متی کو پیش کرتے تھے آئینہ کمالات اسلام میں یہ تحریر فرمایا۔

"یہ نادان نہیں سمجھتے کہ اگر وہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی وہ بطور انکسار اور تذلل ہے جو ہمیشہ حضرت سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی۔ ہر ایک بات کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے۔ اگر کوئی صالح اپنے خط میں احقر عباد اللہ لکھے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شخص درحقیقت تمام دنیا یہاں تک کہ بت پرستوں اور تمام فاسقوں سے بدتر ہے اور خود اقرار کرتا ہے کہ وہ احقر عباد اللہ ہے کس قدر نادانی اور شرارتِ نفس ہے۔"

(آئینہ کمالاتِ اسلام صد ۱۶۳)

ہم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس بیان کو درست مانتے ہیں، کہ لاتفضلونی علیٰ یونس بن متی، والی حدیث نبویؐ انکسارِ طبع کی بناد پر ہے۔ بلکہ یہ بھی مان لیتے ہیں کہ لاتخیرونی علیٰ موسیٰ والی حدیث

اور حضرت ابراہیم کو خیر البریۃ قرار دینے والی حدیث بھی انکسار طبع کی بناء پر ہے ورنہ در حقیقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل تھے اور اپنی نبوت کے پہلے دن سے ہی افضل تھے۔ پس آپ کا یہ بیان ہمارے اوپر کے بیان کو مضر نہیں کہ آنحضرت صلعم نے اپنی شان اور مرتبہ کے متعلق دو وقتوں میں مختلف خیالات کا اظہار فرمایا اور ۱۸ سال تک اپنے آپ کو کسی نبی سے افضل نہیں کہا۔ بلکہ بوجہ انکسار آپ کو افضل قرار دینے والوں کو ایسا کہنے سے منع فرمایا۔ لیکن خاتم النبیین کی آیت نازل ہونے پر یہ انکسار ترک فرما دیا۔ اور برملا اور واشگاف الفاظ میں تمام انبیاء پر اپنے افضل ہونے کا اعلان فرما دیا۔ اور یہ بھی فرما دیا۔ کہ اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں میری پیروی کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ اور یہ بھی فرما دیا کہ میں پہلے اور پچھلے نبیوں کا سردار ہوں۔ اب آپ کی پہلی ہدایت بظاہر اس بات کی نقیض نظر آتی ہے۔ کہ میں موسیٰؑ۔ ابراہیمؑ اور یونسؑ وغیرہ سے افضل ہوں۔ اگر ہم آپ کی پہلی ہدایت پر عمل کریں۔ لا تخیرونی علی موسیٰ پر تو ہمارا عمل ہو گا لیکن فضلت علی الانبیاء بست پر ہمارا عمل نہیں رہے گا۔ پس ان دونوں باتوں کو بیک وقت اختیار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے اجتماع نقیضین لازم آتا ہے۔ لہذا یہ دو باتیں دو وقتوں کی قرار پائیں گی۔ انکسار پر مشتمل روایات پہلے وقت کی ہی ہو سکتی ہیں۔ نہ ان کا فضلت علی الانبیاء بست کے وقت کی قرار دینا معقول امر ہے۔ نہ بعد کی قرار دینا معقول امر ہے۔

جنابِ من! آپ لکھتے ہیں کہ

"یہ باتیں آنحضرت صلعم نے انکسار کے طور پر اور دوسرے انبیاء سے لوگوں کی عقیدت و محبّت کو قائم رکھنے کے لئے کہی تھیں کسی غلط انکشاف کی بناء پر نہیں۔"

پھر اس کے بعد فضلت علی الانبیاء کے پیشِ نظر نادان موحدوں کی حمایت میں آپ لکھتے ہیں:-

"یہ باتیں آنحضرتؐ نے دراصل تفضیلِ کلّی کی تردید کرنے کے لئے کہیں اور بتا دیا تھا۔ کہ مجھے صرف ان چھ باتوں میں دوسرے تمام انبیاء پر فضیلت حاصل ہے جیسا کہ ان موحدوں کا خیال ہے، جن کی مرزا صاحب نے مخالفت کی۔"

جنابِ من! آپ کی ان تحریروں سے آپ کا یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ خاتم النبیین کی آیت کے نزول سے پہلے باقی پانچ امور مندرجہ حدیث فضلت علی الانبیاء کے مطابق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ انکشاف ہو چکا ہوا تھا کہ یہ امور جزوی فضائل ہیں۔ لہٰذا انکسار کے طور پر اور دوسرے انبیاء سے لوگوں کی عقیدت اور محبت کو قائم رکھنے کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے امّت کو فرما دیا تھا کہ آپؐ کو حضرت موسیٰؑ حضرت یونسؑ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فضیلت مت دو۔ پس جب انکسار کے موجب کے ساتھ بموجب آپ کے زعم کے یہ دوسرا موجب بھی مدِنظر تھا کہ تا لوگوں کی انبیاء سے عقیدت اور محبت قائم رہے

ورنہ یوں آپ پر منکشف تھا کہ یہ امور جزوی فضائل ہیں ان میں سے کوئی بھی کلی فضیلت پر دال نہیں۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا بھی آپ کی انبیاء پر جزوی فضیلت کا مظہر ہے تو پھر خاتم النبیین کی آیت کے نازل ہونے پر ان چھ جزوی فضائل کے ہوتے ہوئے آپ نے اپنے انکسار کا طریق کیوں ترک فرما دیا۔ اور اس طرح اپنی فضیلت کا اظہار کر کے انبیاء کے بارہ میں لوگوں کی عقیدت اور محبت کو کیوں ٹھیس پہنچائی اور اپنا ۱۸ سال پہلے کا مستحسن طریق کیوں ترک کر دیا۔ کیا یہ دونوں طرز عمل آپ کو باہم متناقض و متخالف نظر نہیں آتے۔ آپ اس کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کر سکے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انکسار والے پہلے طریق کو کیوں ترک فرمایا ہے۔ جبکہ جزوی فضائل کا انکشاف آپ پر پہلے سے تھا۔ مگر انکسار طبع کی بناء پر آپ اپنے آپ کو نبیوں پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ اگر خاتم النبیین کی آیت نازل ہونے پر بھی آپ پر کلی فضیلت کا انکشاف نہ ہوا بلکہ اسے بھی جزوی فضیلت ہی جانا تو پھر انکسار طبع والے امر کو ترک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہاں اگر یہ سمجھا جائے کہ خاتم النبیین کی آیت سے دوسرے انبیاء پر کلی فضیلت کا علم ہو گیا جو پہلے نہیں تھا اور پہلے پانچ امور کو صرف جزئی فضائل ہی جانتے تھے تو البتہ اس طرز عمل میں تبدیلی کی وجہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے مگر افسوس ہے کہ آپ نادان موحدوں کی حمایت میں کمربستہ ہو کر ایسی راہ اختیار

کر رہے ہیں جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل میں اجتماع نقیضین لازم آتا ہے۔ یعنی ایک ہی وقت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو انبیاء پر فضیلت دینے سے اپنی امت کو منع کرتے تھے۔ اور اسی وقت ہی تمام انبیاء پر اپنے کو فضیلت بھی دے دی۔ اور آپ کے زعم کے مطابق انکسار طبع کو بھی ترک کر دیا اور دوسرے لوگوں کو اپنے انبیاء کے بارہ میں عقیدہ اور محبت میں ٹھیس لگنے کا خیال بھی نہ رکھا یا ایک ایسی غلط پوزیشن ہے جو آپ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دینا چاہتے ہیں۔

لیکن تعجب ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دو وقتوں کے دو عقیدوں کو جو آپس میں تخالف رکھتے تھے جن میں سے پہلے کو آپ نے ترک کر دیا۔ اور دوسرے کو اختیار کر لیا۔ حقیقی تناقض قرار دیتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اجتماع نقیضین کے قائل ہو کر آپ انہیں رسول اللہ مانتے ہیں۔ اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے دو عقیدوں میں جبکہ دونوں کو بیک وقت متحقق نہیں مانا جا رہا آپ حقیقی تناقض قرار دے کر آپ کے نیک آدمی ہونے سے بھی انکار کر رہے ہیں گویا آپ کا ماپ تول صحیح نہیں۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ اِعدلوا ھواقرب للتقویٰ

پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام میں حقیقی تناقض نہ پایا جانے اور اجتماع نقیضین وجود میں نہ آنے کی صورت صرف اسی

صورت میں تسلیم کی جا سکتی ہے کہ دوسرے انبیاء پر آپ کو فضیلت دینے سے امت کو منع کرنے والی احادیث کسی پہلے زمانہ کی ہوں۔ اور فضلت علی الانبیاء بستٍ والی حدیث بعد کے زمانہ کی ہو۔ اس امر کا قوی ثبوت کہ فضلت علی الانبیاء والی حدیث واقعی بعد کی ہے جبکہ آپ کی نبوت پر ۱۸ سال گذر چکے تھے یہ ہے کہ اس سے پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اُعطیت خمسًا کے الفاظ فرمائے تھے کہ مجھے پانچ باتیں دی گئی ہیں اور فرمایا تھا کہ یہ اور انبیاء کو نہیں دی گئیں۔ اس طرح انبیاء پر اپنا امتیاز تو ظاہر فرمایا تھا۔ مگر ان کی بناء پر تمام انبیاء پر فضیلت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ یہ پانچ باتیں وہی ہیں جو فضلت علی الانبیاء بستٍ والی حدیث میں درج ہیں جبکہ خاتم النبیین کی چھٹی بات کا آپ پر انکشاف ہوا۔ جبکہ آپ کی نبوت پر قریبًا اٹھارہ سال گذر چکے تھے۔ اس وقت آپ نے اپنی فضیلت کا اعلان فرمایا جو جزوی فضیلت نہیں کہلا سکتی۔ پس خاتم النبیین کی آیت سے آنحضرت کا دوسرے انبیاء پر کلی فضیلت کا ہونا ثابت نہ ہوتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم انکسار طبع کا پرانا طریق چھوڑ کر اس آیت کے نزول پر تمام انبیاء پر فضیلت رکھنے کا اعلان نہ فرماتے۔ پس جب تک آپ آیت خاتم النبیین کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دیگر تمام انبیاء پر کلی فضیلت تسلیم نہ کریں۔ آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں حقیقی تناقض پیدا ہونے کو نہیں اٹھا سکتے۔ یہ تو مانا جا سکتا ہے۔ کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین کی آیت کے نزول سے پہلے باقی
پانچ امتیازات کو جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اوتیت خمسًا
والی حدیث میں بیان کئے جزوی فضائل خیال کرتے ہوں گے تب ہی آپ
نے انکسار طبع کی وجہ سے ان پانچ امور کی بناء پر اپنے آپ کو دوسرے
انبیاء سے افضل نہ کہا۔ اگر خاتم النبیین کی آیت سے بھی آپ اپنی کلی
فضیلت نہ سمجھتے تو پھر پرانا طریق انکسار طبع کا جاری رکھتے تا دوسرے
نبیوں سے لوگوں کو جو عقیدت اور محبت ہے (بقول آپکے اے جمیل احمد صاحب)
وہ بھی مجروح نہ ہوتی۔ پس پرانے طریق کو تبدیل کرنا اس امر کا حتمی ثبوت ہے،
کہ فضلت علی الانبیاء بستّ کی حدیث کے بیان کے وقت آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم آیت خاتم النبیین کی بناء پر اپنی تمام انبیاء پر کلی
فضیلت رکھنے کا عقیدہ اختیار کر چکے تھے اور جزوی فضیلت رکھنے
کا عقیدہ ترک فرما چکے تھے۔ پس جب تک یہ مختلف مضمون پر مشتمل احادیث
دو وقتوں کی نہ ہوں۔ اور جب تک فضیلت دینے سے امت کو روکنے
والی حدیثیں پہلے زمانہ کی نہ سمجھی جائیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے
کلام وعقیدہ میں حقیقی تناقض ماننا پڑے گا۔ پس جناب من! ان دونو
قسم کی حدیثوں کو ایک وقت کی قرار دے کر آپ نادان موحدوں کی
حمایت کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنی نادان دوستی
کا ثبوت مہیا کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس طرح آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ
وسلم کے کلام میں حقیقی تناقض اور اجتماع النقیضین کا پایا جانا تسلیم کرنے

والے قرار پا رہے ہیں۔ پس اگر آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دوستی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں۔ تو نادان موحدوں کی حمایت کر کے انبیاء پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کلی فضیلت رکھنے سے انکار نہ کریں۔

اس وضاحت اور تفصیل کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تبدیلی عقیدہ کے متعلق الحق المبین ص۲۰۲ سے آپ کے پیش کردہ اقتباس پر آپ کے اعتراضات کا الگ جواب دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ کی سب باتوں کا جواب اوپر کے مضمون میں موجود ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اٹھارہ سال بعد اپنی پوری شان کا انکشاف ہوا۔ اور یہ تدریجی انکشاف قابلِ اعتراض امر نہیں۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر اپنی شان اور مرتبہ کے متعلق تدریجی انکشاف ہرگز قابلِ اعتراض نہیں۔

تبدیلی عقیدہ وقوع میں آنے پر اشتہار ایک غلطی کے ازالہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ بھی لکھا ہے:۔

"جس جس جگہ مَیں نے نبوت یا رسالت سے انکار کیا ہے صرف ان معنوں سے کیا ہے کہ مَیں مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں اور نہ مَیں مستقل طور پر نبی ہوں مگر ان معنوں سے کہ میں نے اپنے رسول مقتدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے لئے اس کا نام پا کر اس کے واسطے سے علم غیب پایا ہے رسول اور نبی ہوں مگر بغیر

کسی جدید شریعت کے۔ اس طور پر نبی کہلانے سے مَیں نے کبھی
انکار نہیں کیا بلکہ انہی معنوں سے خدا نے مجھے نبی اور رسول
کرکے پکارا ہے۔"

جنابِ من! آپ کے نزدیک یہ بیان درست نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بیان مِن وعَن درست ہے۔ کوئی شخص بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ شروع سے لے کر تادمِ واپسین کبھی حضرت مسیح موعودؑ نے تشریعی یا مستقل نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہو کیونکہ ہمیشہ اپنی کتابوں میں آپ ایسا دعویٰ کرنے سے انکار کرتے رہے ہیں۔ اور اس بیان میں آپ کا یہ لکھنا بھی درست ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض کے واسطہ سے علمِ غیب پانے کے معنوں میں آپ نے نبی کہلانے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ چنانچہ توضیح مرام میں محدّث کی ہی اپنی اجتہادی تعریف پیش کرنے کے بعد جس میں سات اجزاء نبوت بیان کئے یہ تحریر فرمادیا تھا:۔

"نبوّت کے معنی بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ امورِ متذکرہ بالا اس
میں پائے جائیں۔" (توضیح مرام طبع اوّل ص۱۸)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ معنوی طور پر نبوت پانے سے آپ اس وقت بھی انکار نہیں کر رہے تھے۔ جب آپ نے بہ پیرایۂ محدثیت جزوی نبوت پانے کا دعویٰ کیا تھا۔ توضیح مرام کے ص۱۹ پر اس بات کا اعتراف بھی موجود ہے کہ یہ نبوت انسانِ کامل کے اقتداء سے ملتی ہے۔ جو مستجمع جمیع کمالاتِ نبوت تامہ ہے۔ یعنی ذاتِ ستودہ صفات حضرت سیدنا ومولانا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم

پھر ازالہ اوہام میں بھی آپ نے فرمایا:۔

"سو یہ بات کہ اس کو (مسیح موعودؑ) امتی بھی کہا اور نبی بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں شانیں امتیت اور نبوت کی اس میں پائی جائیں گی۔ جیسا کہ محدثیت میں ان دونوں شانوں کا پایا جانا ضروری ہے"۔ (ازالہ اوہام ص۳۸۲)

پس معنوی طور پر نبی کہلانے سے آپ نے کبھی انکار نہیں کیا۔ پس اپنی نبوت کی تفصیلی کیفیت کے لحاظ سے آپ کا دعویٰ شروع سے لیکر اخیر تک ایک ہی رہا۔ آپ نے اپنے مضمون کے صفحہ ۱۶ پر لکھا ہے:۔

"مرزا صاحب نے لکھا ہے۔ "جن لفظوں کو قرآن شریف اصطلاحی طور پر بعض معنے کے لئے خاص کر لیتا ہے اور اپنے بیان میں بخوبی سمجھا دیتا ہے کہ فلاں معنی کے لئے اس نے فلاں لفظ خاص کر رکھا ہے۔ اس معنی سے اس لفظ کو صرف اس خیال سے پھیرنا کہ کسی لغت کی کتاب میں اس کے اور معنی بھی آئے ہیں الحاد ہے"۔

(ازالہ اوہام ص۶۶۱ طبع اوّل)

اس کے بعد ازالہ اوہام سے یہ عبارت بھی آپ نے پیش کی ہے۔

"قرآن کریم نے بعض الفاظ لغت سے لیکر اصطلاحی طور پر ایک معنی کے لئے خاص کر دیئے ہیں جیسے صوم صلوٰۃ رحمانیت رحیمیت، توفی اور ایسا ہی اللہ تعالےٰ بھی اور کئی

اور الفاظ۔ سو اصطلاحی امر میں لُغت کی طرف رجوع کرنا
حماقت ہے۔" (ازالہ اوہام ص۵۳۵ طبع اوّل)

ان دو عبارتوں کو پیش کر کے آپ معترض ہیں:۔

"مرزا صاحب نے لفظ نبی کی اصطلاح کے مفہوم کے لئے
لغت کی طرف رجوع کیا۔" اور " یہ بھی یاد رہے کہ نبی کے
معنی لغت کی رو سے یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے اطلاع پاکر
غیب کی خبر دینے والا۔ پس جہاں یہ معنی صادق آئیں گے
نبی کا لفظ بھی صادق آئے گا۔"
(اشتہار ایک غلطی کا ازالہ شائع کردہ ۱۹۰۱ء)

الجواب اگر ہمیں مغالطہ دینا نہیں چاہتے تو پھر آپ خود غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان عبارتوں کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ جن لفظوں کو قرآن کریم نے اصطلاحی طور پر استعمال کیا ہے ان کے لئے لغت کی طرف رجوع کرنا صریح الحاد اور حماقت اور تفسیر بالرائے ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآنی آیات میں استعمال کردہ اصطلاحی معنی رکھنے والے لفظ کے کسی اور قرآنی آیت میں ایسے معنے نہ لینے کے لئے لغت کے کسی اور معنی کی طرف رجوع کرنا تفسیر بالرائے اور الحاد و حماقت ہے۔ جو قرآن کریم کے مدِّ نظر اصطلاحی مفہوم کے خلاف ہوں لیکن اگر لغت اس کے وہ معنی بھی بیان کرتی ہو جو خود قرآن کریم میں مدِّ نظر ہیں تو ان معنی کو تائیداً لغت سے پیش کرنا یہ نہ الحاد ہو گا نہ حماقت۔ بلکہ اس صورت میں تو لغت کے ان معنی کی طرف

رجوع کرنے سے اس بات کا ثبوت ملے گا کہ لغت نویسوں نے بھی سمجھ لیا ہے کہ اس لفظ کے اصطلاحی قرآنی معنی کیا ہیں۔ کیونکہ لغت کی کتابوں میں جہاں ایک لفظ کے ایک سے زائد معنی بیان ہوتے ہیں ان میں لغت نویس اصطلاحی معنی بھی لکھ دیتے ہیں۔ لغت میں مندرج ان اصطلاحی معنی کی طرف رجوع جو قرآنی معنی کے لئے مؤید ہوں نہ صرف جائز بلکہ انسب ہے کیونکہ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جو شخص قرآن میں ایک لفظ کے بطور اصطلاح ایک خاص معنی بیان کرتا ہے اس کو علمائے لغت کی بھی تائید حاصل ہے کہ یہ لفظ ان خاص معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اگر کوئی لفظ قرآن سے باہر استعمال ہوا ہو تو لغت کے کسی ایسے معنے کی طرف رجوع کرنا کہ جو معنی وہاں چسپاں ہوں اس قاعدہ کلیہ کی خلاف ورزی نہ ہو گی۔

پس جنابِ من! آپ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کے بیان کردہ کلیہ کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔ اگر مغالطہ دہی کے لئے نہیں تو اس میں آپ کی ناسمجھی ضرور ہے آپ ذرا پہلے حوالے پر غور کیجئے۔ اس کے الفاظ میں آپ نے یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے "اس معنی (اصطلاحی معنی۔ ناقل) سے اس لفظ کو صرف اس خیال سے پھیرنا کہ کسی لغت کی کتاب میں اس کے اور معنی بھی آئے ہیں صریح الحاد ہے"۔ آپ ذرہ بھی "کے لفظ پر غور فرمائیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ لغت میں درج کردہ ایسے معنی کی طرف لفظ کو پھیرنا الحاد ہے۔ جو لغت میں ان قرآنی اصطلاحی معنی اور ان کے

علاوہ بصورت اشتراک لفظی کے لکھے گئے ہوں۔ پس قرآن مجید کے اندر کسی آیت میں ایسے معنی کی طرف رجوع تفسیر بالرائے صریح الحاد اور اور حماقت ہوگا۔"

لیکن لغت میں قرآن مجید کے یہ بیان کردہ اصطلاحی معنی بھی اگر موجود ہوں۔ تو ان معنی کی طرف رجوع تو نہ تفسیر بالرائے ہے نہ الحاد۔ نہ حماقت۔ بلکہ یہ تفسیر باللغت ہوگی جو مؤید قرآنی اصطلاح ہو۔

پس جناب من! جب آپ اس کلیہ کو نہیں سمجھ سکے۔ تو آپ اس کا صحیح استعمال کیسے کر سکتے تھے۔ اس لئے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ قرآن سے باہر نبی کے ان معنی کو معلوم کرنے کے لئے جن معنی میں آپ کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا جو عام عرفی اصطلاح کے خلاف معنی رکھتا تھا۔ لغت کی طرف رجوع کرنا بالکل جائز ہے۔ اور اس کلیہ کی خلاف ورزی نہیں۔ کیونکہ غلطی کا ازالہ لکھنے سے پہلے بھی آپ نے اپنی کتابوں میں اپنے متعلق خدا کی طرف سے استعمال کردہ نبی کے معنی کے لئے لغت کی طرف رجوع کیا تھا۔ ایک غلطی کا ازالہ لکھنے کے وقت تو آپ پر پورا انکشاف ہوچکا تھا۔ کہ قرآنی معنی میں نبی کے لئے امتی نہ ہونا کوئی ضروری شرط نہیں بلکہ نبیؑ کے معنی کے لئے لغت عربی قرآنی معنوں ہی کی مؤید ہے۔ اس لئے لغوی معنی کی طرف جو مؤید قرآن ہی رجوع نہ الحاد حماقت ہے نہ تفسیر بالرائے۔

پس اشتہار غلطی کے ازالہ میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا نبی کے لفظ کے قرآنی معنی بیان کرنے کے بعد لغت کی طرف رجوع صرف یہ ثابت

کرنے کے لئے ہے کہ ان قرآنی اصطلاحی معنی کی تائید علمائے لغت نے بھی کی ہے۔ اشتہار ایک غلطی کے ازالہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لغت کے کسی ایسے معنی کی طرف رجوع کیا ہی نہیں جو نبی کے لفظ کے قرآنی تصور کے خلاف ہوں اور تفسیر بالرائے۔ اور صریح الحاد وحماقت قرار پا سکیں۔ چنانچہ دیکھئے آپ کی پیش کردہ ایک غلطی کے ازالہ کی عبارت سے پہلے حضور علیہ السلام یہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"نبی کے معنے لغت کی رُو سے یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے اطلاع پا کر غیب کی خبر دینے والا۔"

"پس جہاں بھی یہ معنی صادق آئیں گے نبی کا لفظ بھی صادق آئیگا اور نبی کا رسول ہونا شرط ہے کیونکہ اگر وہ رسول نہ ہو تو غیب مصفّٰی کی خبر اس کو مل نہیں سکتی اور یہ آیت روکتی ہے لا یظھر علٰی علٰی غیبہٖ احدًا الّا من ارتضٰی من رسول۔"

"اب اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ان معنوں کی رُو سے نبی سے انکار کیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ امت مکالمات ومخاطبات الٰہیہ سے بے نصیب ہے کیونکہ جس کے ہاتھ پر اخبار غیبیہ من جانب اللہ ظاہر ہونگے بالضرورت اس پر مطابق آیت لا یظھر علٰی غیبہٖ کے مفہوم نبی کا صادق آئیگا۔" (اشتہار ایک غلطی کا ازالہ)

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضور قرآنی معنی کی تائید میں لغت کو پیش کر رہے ہیں کیونکہ لغت میں نبی کے درج کردہ معنی بھی قرآن کے اصطلاحی معنوں کے خلاف نہیں، بلکہ مؤید ہیں۔ پس حضرت اقدس علیہ السلام نے اس عبارت میں نبی کے لفظ کے لئے لغت کے کسی ایسے معنی کی طرف رجوع نہیں کیا جو قرآنی معنی سے اختلاف رکھتے ہوں۔

یہ تو ہے آپ کے سوال کا جواب جس سے ظاہر ہے کہ آپ یا تو اس کلیہ کو نہیں سمجھ سکے جو قرآنی اصطلاح کے متعلق حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے تحریر فرمایا ہے یا دانستہ مغالطہ دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے ازالہ اوہام ص۶۲۶ طبع اوّل والی پہلی عبارت ادھوری پیش کی ہے۔ ورنہ دوسرا اقتباس جو ص۵۳۳ سے آپ نے نقل کیا ہے اس کا مضمون پہلے اقتباس کے آگے بھی موجود ہے جسے آپ نے درج نہیں کیا۔ اور لغت کی طرف مطلق رجوع کو حماقت کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے آپ نے پہلے اقتباس کو ادھورا چھوڑا اور محض غلط فہمی پیدا کرنے کی خاطر دوسرے اقتباس کو پیش کر دیا۔ تاکہ بہرحال لغت کی طرف رجوع کو حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ کے کلام میں حماقت کہنا بھی دکھا سکیں۔ حالانکہ اس جگہ بھی قرآنی اصطلاحی معنی کے خلاف معنی اخذ کرنے کے لئے لغت کی طرف رجوع کو حماقت قرار دینا ہی مراد ہے جیسا کہ پہلے اقتباس سے ظاہر ہے۔ ذیل میں ہم آپ کی توجہ کے لئے پہلے حوالہ کا پورا اقتباس درج کر دیتے ہیں۔

"بعض چالاکی سے قرآن شریف کے کھلے کھلے ثبوت پر پردہ

ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ توفّی کا لفظ لُغت کی کتابوں میں کئی معنوں پر آیا ہے۔ حالانکہ اپنے دلوں میں خوب جانتے ہیں کہ جن لفظوں کو قرآن شریف اصطلاحی طور پر بعض معنی کے لئے خاص کر لیتا ہے اور اپنے متواتر بیان سے بخوبی سمجھا دیتا ہے کہ فلاں معنی کے لئے اس نے فلاں لفظ خاص کر رکھا ہے۔ اس معنی سے اس لفظ کو صرف اس خیال سے پھیرنا کہ کسی لُغت کی کتاب میں اس کے اور معنی بھی آئے ہیں صریح الحاد ہے۔ مثلاً کتب لغت میں اندھیری رات کا نام بھی کافر ہے مگر تمام قرآن شریف میں کافر کا لفظ صرف کافر دین یا کافر نعمت پر بولا گیا ہے اب اگر کوئی شخص کفر کا لفظ الفاظ مروجہ فرقان سے پھیر کر اندھیری رات اس سے مراد لے اور یہ ثبوت دے کہ لغت کی کتابوں میں اس کے یہ معنی بھی لکھے ہیں تو سچ کہو اس کا یہ ملحدانہ طریق ہے یا نہیں۔ اسی طرح کتبِ لُغت میں صوم کا لفظ صرف روزہ میں محدود نہیں بلکہ عیسائیوں کے گرجا کا نام بھی صوم ہے اور شتر مرغ کے سرگین کو بھی صوم کہتے ہیں۔ لیکن قرآن شریف کی اصطلاح میں صوم صرف روزہ کا نام ہے۔ اور اسی طرح صلوٰۃ کے لفظ کے معنی بھی لغت میں کئی ہیں۔ مگر قرآن شریف کی اصطلاح میں صرف نماز

اور درود اور دعا کا نام ہے۔ یہ بات سمجھنے والے جانتے ہیں۔ کہ ہر ایک فن ایک اصطلاح کا محتاج ہوتا ہے اور اہل اس فن کے حاجات کے موافق بعض الفاظ کو متعدد معنوں سے مجرد کر کے کسی ایک معنی سے مخصوص کر لیتے ہیں مثلاً طبابت کے فن کو دیکھئے کہ بعض الفاظ جو کئی معنے رکھتے ہیں صرف ایک معنی میں اصطلاحی طور پر محصور ومحدود رکھے گئے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی علم بغیر اصطلاحی الفاظ کے چل ہی نہیں سکتا۔ پس جو شخص الحاد کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کے لئے سیدھی راہ یہی ہے کہ قرآن شریف کے معنی اس کے مروجہ اور مصطلحہ الفاظ کے لحاظ سے کرے ورنہ تفسیر بالرائے ہوگی۔"

(ازالہ اوہام صفحہ ۲۶۶-۲۶۷ طبع اوّل)

آخری خط کشیدہ عبارت سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے اندر کسی اصطلاحی لفظ کو قرآنی مصطلحہ معنوں میں نہ لینا تفسیر بالرائے ہوگی۔ قرآن سے باہر کسی اور معنی میں اس لفظ کا استعمال تفسیر بالرائے نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ تفسیر تو قرآن کی ہوتی ہے۔ اور قرآن کے معنی مصطلحہ کو چھوڑنا ہی الحاد وحماقت قرار پا سکتا ہے۔

حضرت اقدس علیہ السلام کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس جگہ حضور لفظ توفّی کے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ فرما رہے ہیں کہ:۔

"بعض چالاکی سے قرآن شریف کے کھلے کھلے ثبوت پر پردہ
ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توفی کا لفظ لغت کی کتابوں
میں کئی معنوں میں آیا ہے (یہ واضح رہے کہ توفی کے معنی
لغت کی کتابوں میں توفی اللہ فلاناً ای اماتہ یا توفی
اللہ فلاناً ای قبض روحہٗ بھی درج ہیں۔ ان معنی
کی طرف رجوع کو حضرت اقدس الحاد نہیں جانتے اور نہ حماقت
اور تفسیر بالرائے خیال کر سکتے ہیں۔ ناقل) حالانکہ اپنے
دلوں میں خوب جانتے ہیں کہ جن لفظوں کو قرآن شریف اصطلاحی
طور پر بعض معانی کے لئے خاص کر لیتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اس
لفظ کو صرف اس خیال سے پھیرنا کہ کسی لغت کی کتاب میں
اس کے اور معنی بھی آئے ہیں صریح الحاد ہے "

جنابِ من! آپ کا دل کیا کہتا ہے کیا توفی کو اس کے قرآنی اصطلاحی
معنی سے پھیرنا آپ اپنے دل میں الحاد جانتے ہیں کہ نہیں کیا آپ اس کلیہ
کو غلط سمجھتے ہیں۔ اگر آپ اس کو غلط قرار دیتے ہیں تو ہمارا دعویٰ ہے کہ
آپ اس کی تغلیط پر قادر نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کو وفات مسیحؑ کا عقیدہ
مان لینا چاہیئے۔

اس اقتباس میں حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ نے اس کلیہ کو صحیح
قرار دینے کے لئے دوسرے اقتباس کی طرح بعض مثالیں بھی دی ہیں مثلاً
لکھا ہے :-

"کتبِ لغت میں اندھیری رات کا نام بھی کافر ہے مگر تمام قرآن کریم میں کافر کا لفظ کافرِ دین یا کافرِ نعمت پر بولا گیا ہے۔"

اس مثال کو سامنے رکھکر آپ سوچیں کہ کیا قرآن میں جو کافر کا لفظ آیا ہے اسکے معنے میں لغت کی طرف رجوع کر کے اندھیری رات معنی لینا صریح الحاد حماقت اور تفسیر بالرائے ہوگی یا نہیں - اگر ہے تو اس مفہوم میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ کا بیان کردہ کلّیہ سچا ہُوا اور آپ اس کی تغلیط پر قادر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی آپ کو سمجھ لینا چاہیئے - کہ اگر لغت میں کافر کے معنی کافرِ دین اور کافرِ نعمت بھی لکھے ہوں - تو ان معنی کی طرف رجوع بھی اس کلیہ کی خلاف ورزی نہ ہوگی بلکہ اس کی تائید ہوگی اور مؤیدات سے فائدہ اٹھانا اس صورت میں نہ الحاد ہوگا نہ حماقت نہ تفسیر بالرائے ہوگی بلکہ تفسیر بالقرآن کے ساتھ تفسیر باللغۃ بھی ہوگی جو مؤید قرآن ہوگی - ہاں قرآن مجید سے باہر کفر کا لفظ اندھیری رات کے معنوں میں بھی استعمال ہوسکیگا جبکہ وہاں اصطلاحی معنی چسپاں نہ ہو سکتے ہوں - اور اندھیری رات کے معنے ہی چسپاں ہو سکتے ہوں - حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ علیہ السلام نے لکھا ہے :-

"اسی طرح کتبِ لغت میں "صوم" کا لفظ صرف روزہ میں محدود نہیں - عیسائیوں کے گرجا کا نام بھی صوم ہے اور شترمرغ کے سرگین کو بھی صوم کہتے ہیں لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں صرف روزہ کا نام ہے۔"

حضور کی پیش کردہ یہ مثال بھی اس کلیہ کی موید ہے اس مثال میں حضور نے صوم کی اصطلاح قرآن کو لیا ہے۔ جو روزہ کے معنی میں ہے اور فرمایا ہے کہ لغت میں روزہ کے علاوہ اس کے دو اور معنی علیسائیوں کا گرجا اور شتر مرغ کا سرگین کے بھی لکھے ہیں۔ لہذا قرآن شریف میں صوم کے معنی عیسائیوں کا گرجا مراد لینا یا شتر مرغ کا سرگین یہ صریح الحاد اور حماقت اور تفسیر بالرائے ہو گی۔ لیکن لغت میں جو روزہ کے معنی لکھے ہیں۔ ان معنی کی طرف رجوع جائز ہو گا۔ کیونکہ وہ قرآن کے اصطلاحی معنی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور اس کے مفہوم کے مؤید ہیں۔ ہاں قرآن مجید سے باہر اس لفظ کا دوسرے معنوں میں استعمال بھی جائز ہو گا۔

تیسری مثال میں آپ نے صلوٰۃ کا لفظ لیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"اسی طرح صلوٰۃ کے لفظ کے معنی بھی لغت میں کئی ہیں۔ مگر قرآن کریم کی اصطلاح میں صرف نماز اور درود اور دعا کا نام ہے۔"

اب سوچیئے! نماز۔ درود اور دعا کے معنی چھوڑ کر قرآن میں اگر صلوٰۃ کے کوئی اور وضعی معنی مراد لیں مثلاً (آگ کے تعلق سے) آگ میں داخل کرنا یا ہونا اور کسی اور امر کی نسبت سے تکلیف اٹھانا لیں تو یہ صریح الحاد اور حماقت اور تفسیر بالرائے ہو گی۔ لیکن لغت کے بیان کردہ معنی نماز اور درود اور دعا کی طرف رجوع قرآنی آیات کو

سمجھانے کے لئے جائز ہوگا۔ الحاد و حماقت یا تفسیر بالرائے نہیں ہوگی بلکہ تفسیر باللغۃ ہوگی جو قرآنی معنی کی مؤید ہوگی نہ قرآن کے مخالف۔ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ کہ کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس لغت کے ان معنی کی طرف رجوع کو جو قرآنی اصطلاح سے مطابقت رکھتے ہوں۔ صریح الحاد حماقت اور تفسیر بالرائے خیال کرے۔

لغت میں نبی کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ وہ المخبر عن المستقبل بالهام من الله و ما يتعلق به تعالیٰ ہیں کہ نبی کے معنی ہیں الہام الٰہی سے مستقبل کے متعلق اور خدا تعالےٰ سے متعلق باتوں کےبارہ میں خبر دینے والا۔ یہ معنی محاورۂ قرآن مجید کے مخالف نہیں اس لئے ان معنوں سے قرآنی معنوں کی تائید حاصل کرنا جو آیت لایظہر علی غیبہ احدًا الا من ارتضٰی من رسول میں بیان ہوئے ہیں۔ لغت کی طرف رجوع قرآن مجید کے بیان کردہ معنوں کے خلاف نہیں۔ تفسیر بالرائے اور الحاد اور حماقت لغت کے ان معنی کی طرف رجوع کرنا کلیۃ کا منشاء ہے جو معنی قرآنی محاورہ کے خلاف ہوں۔ قرآن مجید نے نبوت کا وہی تصور مدنظر رکھا ہے جو لغت میں نبی کے معنوں میں مدنظر ہے آیتؑ ما كان لبشرٍ ان يؤتيه اللهُ الكتابَ والحكمَ والنبوةَ میں النبوۃ کے لغت میں بیان کردہ معنی ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے النبوۃ کا عطف الحکم اور الحکم کا الکتاب پر کیا ہے۔ چونکہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ضروری ہے اس لئے النبوۃ

کا تصور الحکم اور الکتاب سے الگ مفہوم میں کرنا ہوگا۔ کیونکہ گو بعض نبی الکتاب یعنی شریعت جدیدہ بھی لائے۔ حکومت کے ساتھ بھی آئے۔ جیسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور بعض نبی بغیر کسی جدید شریعت کے آئے اور حکومت بھی رکھتے تھے۔ جیسے حضرت سلیمانؑ مگر بعض انبیاء ایسے بھی تھے جو نہ کوئی جدید کتاب شریعت لائے نہ وہ صاحب حکومت تھے مگر نبی ضرور تھے جیسے حضرت یحییٰ اور زکریا علیہما السلام۔ ان کی نبوت کا تصور وہی تھا جو لغت میں بیان کردہ نبی کے اصطلاحی معنی میں ملحوظ ہے۔ قرآن مجید کی آیت لایظہر علیٰ غیبہ کے الفاظ میں لغت میں بیان کردہ نبی کا اصطلاحی مفہوم ہی مدنظر ہے اور اظہار علی الغیب کا مرتبہ رکھنے والے نبی کے لئے قرآن مجید نے اِلّا من ارتضیٰ من رسول میں اس نبی کے لئے رسول ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ ہاں ہر نبی اور رسول کے لئے قرآن مجید نے ان معنوں میں الکتاب ملنے کا ضرور ذکر کیا ہے کہ انہیں شریعت کا علم دیا جاتا ہے خواہ وہ شریعت جدیدہ لائے یا کسی پہلی شریعت کے تابع کیا گیا ہو۔

جناب من! آپ صرف ایک غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ جس سے ہم نے آپ کو نکالنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

آگے آپ نے ازالہ اوہام طبع اول ص۵۷۵ سے مندرجہ ذیل عبارت پیش کی ہے :-

"خاتم النبیّین ہونا ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کسی دوسرے نبی کے آنے سے مانع ہے۔ ہاں ایسا نبی جو مشکوٰۃ نبوتِ محمدیّہ سے نور حاصل کرتا ہے اور نبوتِ تامہ نہیں رکھتا جس کو دوسرے لفظوں میں محدّث کہتے ہیں وہ اس تحدید سے باہر ہے۔"

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی اس عبارت پر آپ کا سوال یہ ہے:۔

"پہلے ختم نبوت کی تحدید سے صرف محدث ہی باہر تھا۔ پھر ظلّی بروزی نبی کو بھی اس تحدید سے باہر کر دیا۔"

الجواب درحقیقت تو امّتی نبی یا بالفاظ دیگر ظلّی اور بروزی نبی بھی پہلے ہی اس تحدید سے باہر تھا۔ البتہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسے بصورت محدث کی اپنی اجتہادی تعریف کے اس تحدید سے باہر قرار دیا تھا۔ اور محدّث کی یہ تعریف دراصل امتی نبوت ہی کی تعریف تھی۔ جو ظلّی اور بروزی طور پر مل سکتی تھی۔ واضح رہے کہ خاتم النبیّین کے لفظ میں ایک پیشگوئی مخفی تھی۔ اس لئے جب حضرت مسیح موعودؑ کو اپنی شان کے متعلق نبوت کی تعریف بہ پیرایۂ محدّث کے بعد جو اجتہادی تعریف تھی خدا کی طرف سے متواتر وحی کے ذریعہ صریح طور پر نبی کا خطاب پانے کا علم ہوا۔ تو آپ نے پہلی تعریف ترک فرما دی۔ اور اپنی شان محدثوں سے بالا سمجھ لی۔ اور خدا کی وحی کی روشنی سے اپنی بروزی اور ظلّی نبوّت جو پہلے بھی آپ کو حاصل تھی خاتم النبیّینؐ کی تحدید سے باہر سمجھ لیا۔ کیونکہ

امتی نبی اور ظلی اور بروزی نبی بھی مشکوٰۃ رسالت محمدیہ سے ہی فیضیاب تھا۔ پس ہمیں تو اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آتی۔ قل ربّ زدنی علمًا کی دعا خود خدا تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سکھائی تھی جس کے نتیجہ میں آپ کو ایک نیا علم دیا گیا۔ چنانچہ پہلے بوجہ انکسار آپ اپنے آپ کو نبیوں سے افضل نہ جانتے رہے اور اٹھارہ سال کے بعد خاتم النبیین کی آیت نازل ہونے پر آپ اپنے تئیں تمام نبیوں سے افضل جاننے لگے۔ پس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ خدا کی دین سے کیونکر انکار کر سکتے تھے۔ اسی لئے دونوں ہی نے اپنے انکسار کی حالت کو ترک کرکے خدا کی حکم کے مطابق اپنی شان کے پہلے سے بلند تر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور دونوں نے پہلی بات کے خلاف بات کہہ دی اور لوگوں کی مخالفت سے نہیں ڈرے۔ پس شان کے بارہ میں تدریجی انکشاف چونکہ حقیقی تناقض کا حامل نہیں ہوتا اس لئے قابلِ اعتراض نہیں۔

اگر خاتم النبیین کی آیت سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کلّی فضیلت کا دعویٰ نہ سمجھا ہوتا اور اس کے نزول پر بھی صرف اپنی جزوی فضیلت کے انبیاء پر قائل ہوتے تو پھر انکسار طبع کی وجہ سے جو ہمیشہ آپ کے لازمِ حال تھا اس کو ترک کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور نہ اس بات کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی دوسرے انبیاء سے محبت و عقیدت کو قائم رکھنے کے لئے پہلے

طریق کو کیوں ترک فرمایا اور پہلے طریق کے خلاف کیوں تمام انبیاء پر اپنی فضیلت کا اعلان کر دیا۔

جنابِ من! آپ نے لکھا ہے کہ:۔

"۱۹۰۱ء میں جب مرزا صاحب نے محدثیت سے انکار کر کے نبوت کا دعویٰ کیا تو محدث پر علوم غیب کا دروازہ جو پہلے کھلا تھا بند کر دیا اور لکھا" اگر خدا تعالیٰ سے غیب کی خبریں پانیوالا نبی کا نام نہیں رکھتا تو پھر بتلاؤ کس نام سے اسے پکارا جائے اگر کہو کہ اس کا نام محدث رکھنا چاہیئے تو میں کہتا ہوں، کہ تحدیث کے معنی کسی لغت کی کتاب میں اظہار غیب نہیں ہیں...."
"قرآن شریف بجز نبی بلکہ رسول ہونے کے دوسروں پر علوم غیب کا دروازہ بند کرتا ہے جیسا کہ آیت لا یظھر علیٰ غیبہٖ احدًا من ارتضیٰ من رسولٍ سے ظاہر ہے"

(اشتہار ایک غلطی کا ازالہ مورخہ ۵ ر نومبر ۱۹۰۱ء)

جنابِ من! اشتہار ایک غلطی کا ازالہ کی یہ عبارتیں درج کرنے کے بعد اعتراض کرنے کے لئے آپ لکھتے ہیں:۔

ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی ۱۹۰۱ء سے پہلے اور بعد کی تحریروں میں تناقض واقع ہو گیا ہے بلکہ قرآن مجید کی ایک ہی آیت میں ایک ہی لفظ رسول میں پہلے محدث کو شامل کر کے پھر اسے خارج کر کے ایک طرف تناقض کا ثبوت مہیا کیا تو دوسری طرف یہ بھی ثابت کر دیا کہ مرزا صاحب قرآن مجید کو سمجھنے

میں گنندہ ذہن واقع ہوئے ہیں۔ بیس سال تک وہ لفظ رسول کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ بیس سال تک لفظ رسول میں محدث کو بھی شامل رکھا اور اس پر علوم غیبیہ کا دروازہ کھلا رکھا لیکن محدثیت سے انکار کرنے کی خاطر اس پر علوم غیب کا دروازہ بند کر دیا۔ اور لفظ رسول میں صرف نبی اور رسول کو شامل رہنے دیا"۔

الجواب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جس بناء پر محدثیت سے انکار کیا وہ بنیاد غلط نہیں۔ جنابِ من! آپ کا یہ لکھنا خود آپ کی غلطی ہے۔ کہ "وہ بنیاد ہی غلط ہے"۔ آپ نے "ایام الصلح" حاشیہ صا۱۷ سے جو عبارت اپنے مضمون میں درج کی ہے۔

"قرآن شریف میں ہے فلا یظھر علی غیبہ احدًا الّا من ارتضی من رسولٍ یعنی کامل طور پر غیب کا بیان کرنا صرف رسولوں کا کام ہے دوسرے کو یہ مرتبہ عطا نہیں ہوتا رسولوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں خواہ نبی ہوں یا رسول یا محدث اور مجدّد ہوں"۔

اس سے ظاہر ہے کہ آیت لایظھر علی غیبہٖ احدًا اِلّا من ارتضی من رسول میں ہی آپ کی نبوت اور رسالت کی بنیاد بھی موجود تھی جب آپ نے محدث کو رسولوں میں شامل کیا تھا تو محدّث کے لئے نبی کہلانا بھی جائز رکھا تھا۔ چنانچہ جناب من! آپ نے خود اپنے مضمون میں تسلیم کیا ہے "جب تک مرزا صاحب نے محدّث ہونے کا دعویٰ کر رکھا تھا

اس وقت سوائے نئی شریعت کے نبوت کی تمام صفات محدّث میں پائی جاتی تھیں "

اس امر کے ثبوت میں آپ نے برکات الدعا صلا سے ذیل کا حوالہ بھی پیش کیا ہے :-

" صاحب وحی محدثیت اپنے متبوع نبی کا پورا ہمرنگ ہوتا ہے اور وہ بغیر نبوت اور تجدید احکام (یعنی نئی شریعت والی نبوت کے - ناقل) وہ سب امور بطور انعام واکرام وارد ہوتے ہیں جو نبی پر وارد ہوتے ہیں "

جنابِ من! ہم آپ کا یہ بیان درست سمجھتے ہیں کہ مرزا صاحب نے اس عبارت میں نئی شریعت لانے والا نبی ہونے سے انکار کیا ہے - سو آپ پر واضح ہو کہ یہ اقرار تو حضرت مرزا صاحبؑ کو ہمیشہ رہا ہے کہ آپ نئی شریعت لانے والے نبی اور رسول نہیں، بلکہ آپ نے تو مستقل نبی (یعنی غیر امتی - غیر تشریعی نبی ہونے سے بھی ہمیشہ انکار کیا ہے) اور اپنے تئیں محدث کہتے ہوئے بھی غیر تشریعی من وجہ نبی اور من وجہٍ امتی قرار دیتے تھے اور محدّث میں دونوں شانیں امتیّت اور نبوّت کی تسلیم کرتے تھے - ۱۹۰۱ء میں بھی آپ نے نئی شریعت لانے یا مستقل نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا -

توضیح مرام میں محدث کے لئے جو سات باتیں آپ نے ضروری قرار دی تھیں ان کے بیان کرنے کے بعد صاف لکھ دیا تھا :-

"نبوت کے معنی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ امور متذکرہ بالا اس میں پائے جائیں"۔ (توضیح مرام صفحہ ۱۸ طبع اوّل)

پس محدثیت کے پیرایہ میں جس نبوت کا آپ کو دعویٰ تھا سنہ ۱۹۰۱ء میں بھی آپ کا دعویٰ انہیں سات اجزائے نبوت سے کسی زائد امر پانے کا نہیں ہوا پس تفصیلی کیفیت آپ کی نبوت کی شروع سے لے کر تا دم واپسین ایک ہی رہی ہے۔ جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ صرف تادیل میں ہوئی کہ پہلے آپ نے اس نبوت کا دوسرا نام محدثیت رکھا اور بعد میں یعنی سنہ ۱۹۰۱ء میں اس کا دوسرا نام محدثیت رکھنا ترک کر دیا۔ تو اس سے آپ کے کلام میں کوئی حقیقی تناقض جو قابل اعتراض ہوتا ہے ہرگز نہیں پایا گیا۔ کیونکہ حقیقی تناقض اجتماع نقیضین کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اور ایک عقیدہ کو ترک کرکے اس کی بجائے اس کے متناقض عقیدہ کو اختیار کرنے سے جبکہ دونوں عقیدوں کا زمانہ الگ الگ ہو اجتماع نقیضین قرار نہیں پا سکتا۔ پس آپ پر تبدیلیٔ عقیدہ کی بناء پر حقیقی تناقض پیدا ہونے کا اعتراض بے بنیاد ہے۔

ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ تفصیلی کیفیت کے لحاظ سے آپ کی نبوت میں ان دونوں زمانوں میں، بجز اس تادیل کے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا کہ سنہ ۱۹۰۱ء سے پہلے آپ اپنی نبوت کا دوسرا نام محدثیت قرار دیتے تھے کیونکہ نبوت کی معروف اصطلاحی تعریف میں نبی کے لئے کسی نبی کا امتی نہ کہلانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں جب آپ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنی نبوت کے متعلق صراحت اور وضاحت ہو گئی تو آپ نے سمجھ لیا کہ امتی

ہونا خدا کی اصطلاح اور قرآنی اصطلاح میں واقعی نبی ہونے میں روک نہیں
لہذا آپ نے اپنی محدث والی اجتہادی اصطلاح ترک فرمادی۔ لیکن
مجددین کے جزوی نبی اور جزوی رسول ہونے سے آپ نے کبھی انکار نہیں
کیا۔ ہاں کامل مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ مشتمل بر امور غیبیہ پانے والا تیرہ سو سال
میں آپ نے بموجب احادیث نبویہ صرف اپنے وجود کو قرار دیا۔ جیسا کہ
حقیقۃ الوحی ص۳۹۱ سے ظاہر ہے۔ تبدیلی عقیدہ کے وقت آپ کی محدث
کی اجتہادی تعریف مندرجہ توضیح مرام ص۱۸ در اصل واقعی نبوت کی تعریف
ثابت ہو چکی تھی۔ اور امتی ہونا مانع نبوت نہیں تھا۔ اس لئے محدث کی
یہ اجتہادی تعریف نبی کی تعریف سمجھی جائے گی جو واقعی نبی ہوتا ہے نہ کہ
محض محدث۔ محدث کے معنوں کے لئے آپ کی تعریف مندرجہ توضیح مرام
اس وجہ سے اب حجت نہ رہی تھی کہ آپ اسے منسوخ کر چکے ہیں۔ مزید
اسے نبوت کی تعریف سمجھنے لگے تھے۔ اس لئے آپ کو اس اجتہادی تعریف
کے مطابق محدث قرار دینا درست نہ رہا۔ بلکہ نبی قرار دینا درست ثابت
ہوا۔ لہذا اس کے بعد آپ صرف اسی طرح محدث کہلا سکتے تھے جس طرح
ایک نبی علی وجہ الکمال مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ کا شرف رکھنے کی وجہ سے محدث
کہلا سکتا ہے۔ گویا نبی کو محدث کہنے کا صرف اتنا مفہوم ہوتا ہے کہ یہ شخص خدا
کے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف ہے اور یہ مفہوم لغت میں مندرجہ محدث کی اصطلاحی
تعریف میں موجود تھا۔ اس لئے آپ نے لغت میں پیش کردہ مفہوم کے
مطابق محض محدث کہلانے کو اپنی شان اور مرتبہ کے اظہار کے لئے کافی نہ سمجھا۔

کیونکہ لغت عربی میں محدّث کی اصطلاح کے مفہوم میں اس پر امر غیب کا اظہار ضروری شرط قرار نہیں دیا گیا تھا بلکہ لغتِ عربی میں صرف نبی کے لئے اخبارِ غیبیہ پر اطلاع پانا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے آپ نے اشتہار ایک غلطی کے ازالہ میں لکھا کہ:۔

"اگر خدا تعالیٰ سے غیب کی خبریں پانے والا نبی کا نام نہیں رکھتا تو پھر بتلاؤ کس نام سے اس کو پکارا جائے اگر کہو اس کا نام محدّث رکھنا چاہیئے تو میں کہتا ہوں تحدیث کے معنی کسی لغت کی کتاب میں اظہار غیب نہیں ہے اور نبی کے معنی اظہار امر غیب ہے۔"

پس آپ کو نبی محدث کہنا اب بھی جائز ہے نبی کا لفظ ترک کر کے محض محدث محدث کہنا جائز نہیں۔ پس تبدیلی عقیدہ کے بعد آپ صرف اسی طرح محدث کہلا سکتے ہیں۔ جس طرح ہر نبی کو محدّث کہنا جائز ہے لیکن محض محدث نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ اس سے نبوت کی نفی کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ فافہم وتدبّر

حضرت اقدسؑ نے محدث کی توضیح مرام میں جو اجتہادی تعریف کی تھی اس میں اپنی واردات ملحوظ تھیں۔ جن میں امور غیبیہ کا اظہار بھی تھا۔ جب محدث کی یہ اجتہادی تعریف دراصل نبوت کی تعریف قرار پا گئی تو قرآنی بیان کے مطابق امور غیبیہ علی وجہ الکمال پانا صرف واقعی نبی اور رسول کی شرط قرار پایا نہ کہ مجددین محدثین کے لئے شرط۔ ہاں مجددین امت چونکہ مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف ہوتے رہے ہیں اور حدیث نبوی لَقَد

یبق من النبوۃ الا المبشرات کے مطابق انہیں المبشرات یعنی امور غیبیہ سے حصہ ملتا رہا ہے۔ کیونکہ المبشرات والے حصہ نبوت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مومنوں کی رؤیا صالحہ بھی داخل ہیں۔ اس لئے مجددین محدثین جزوی طور پر نبوت اور رسالت کے بھی حامل ہوتے رہے ہیں اور انہیں نبوت مطلقہ کے بالمقابل صرف جزوی نبی اور رسول کہنا جائز ہے۔ ورنہ واقعی نبی وہی کہلا سکتا ہے جسے خود خدا تعالے نے بکثرت امور غیبیہ پر اطلاع بھی دیتا ہو اور خود اس کا نام نبی اور رسول بھی اس کے الہامات میں رکھدے۔ مولانا جلال الدین رومی نے تو پیر حکمت کو بھی نبیٔ وقت کہا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

چوں بدادی دست خود در دست پیر   پیرِ حکمت کو علیم است و خبیر
آں نبیٔ وقت باشد اے مرید   کہ از و نورِ نبی آمد پدید

کہ جب تو پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے ایسے پیر کے ہاتھ میں جو پیر حکمت ہے۔ عالم دین اور حالات سے واقف ہے تو اے مرید وہ پیر نبیٔ وقت ہوگا۔ کیونکہ اس سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور ظاہر ہو رہا ہوگا پس ظلی طور پر مجددینِ اُمّت کو علی قدرِ مراتبِ ظلیت جزوی نبی اور رسول کہنا جائز ہے۔

واضح رہے کہ حضرت مسیح موعودؑ بیس سال تک اپنی محدثیت کے اعلان پر قائم نہیں رہے بلکہ یہ عرصہ اٹھارہ سال کا بنتا ہے مگر محدث کی تعریف جو آپ نے ۱۸۹۱ء میں کی۔ وہ دراصل واقعی نبوت کی ہی تعریف ثابت

ہوئی ہے۔ اس لئے آپ کا محدثیت کے پیرایہ میں نبوت کا دعویٰ بھی دراصل امتی نبی ہونے کے بعد کے دعویٰ سے بلحاظ تفصیلی کیفیت کے مطابقت ہی رکھتا تھا۔ لہذا آپ شروع دعویٰ سے ہی امتی نبی تھے اور تادم واپسین یہی آپ کا دعویٰ رہا۔ آپ نے کبھی بھی مستقل شریعت لانے یا مستقل نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

حضرت مرزا صاحب قرآن مجید کو سمجھنے میں کند ذہن نہ تھے۔ بلکہ بڑے ذہین تھے۔ رسول کے لفظ میں آپؑ کے نزدیک جزوی طور پر مجددین و محدثین بھی داخل تھے۔ اس کا آپؑ نے کبھی انکار نہیں کیا۔ لہذا کند ذہن ہونے کا الزام بھی باطل ہے۔ اور تناقض پایا جانے کا الزام بھی باطل ہے۔

آئندہ آنے والا مثیلِ مسیح

حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ جس دعوتِ عامہ کی تخم ریزی ہوئی ہے اس کی تکمیل آپ کی خلافت کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ اس دوران میں یا اس کی تکمیل پر اگر کوئی اور مثیلِ مسیح آئے جس کا امکان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مسلّم ہے تو وہ آپ کا ظل اور خلیفہ ہی ہوگا۔ پس آئندہ آنے والا مجدد یا مثیل مسیح آپ کا ظل اور خلیفہ ہی ہو سکتا ہے۔ دعوتِ عامہ کے کام کی تکمیل ابھی باقی ہے اس کی تکمیل غلبہ اسلام پر ہو جائے گی انشاء اللہ تعالےٰ۔ تخم ریزی حضرت مسیح موعودؑ

کے ذریعہ ہو چکی ہے یہی تخم بڑھیں گے اور انہیں کی آبیاری کے لئے کوئی مثیل مسیح بھی آسکتا ہے۔ جو مجدّد بھی ہو۔ مگر وہ آپ کا خلیفہ اور جانشین بھی ہوگا۔ سو مسیح اور مہدی کے الفاظ سے مسیح موعود اور مہدی معہود مراد ہیں۔ تبلیغ ہدایت میں حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کی مراد یہ ہے کہ ان کے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے مسیح موعود اور مہدی معہود حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام ہی ہیں اور آئندہ کے لئے کسی ایسے شخص کی آمد سے انکار کیا ہے جو ان کے کام کا اعادہ کرے۔ انہی کے کام کو جاری رکھنے کے لئے کسی مثیل مسیح یا مجدّد کا جو ان کا خلیفہ بھی ہو آپ نے ہرگز انکار نہیں کیا۔ بلکہ اقرار ہی کیا ہے چنانچہ آپؓ تبلیغ ہدایت میں لکھتے ہیں :۔

"ظاہر ہے کہ کسی مامور و مرسل کا جو کام بتایا جاتا ہے وہ کامل طور پر اس کی زندگی میں پورا نہیں ہو جایا کرتا۔ بلکہ اس کے ذریعہ صرف اس کام کی تخم ریزی ہوا کرتی ہے پھر بعد میں خدا تعالےٰ اس کے خلفاء اور اس کی جماعت کے ذریعہ آہستہ آہستہ اس کام کو انجام تک پہنچاتا ہے۔"
(زیر عنوان مسیح موعودؑ کے کام کی تخم ریزی مکمل ہو چکی ہے ۲۴۲)

یہ عبارت معترض کی پیش کردہ عبارت سے آگے کی ہے۔ پس معترض نے اعتراض کی خاطر ادھوری عبارت پیش کی ہے۔ ہماری پیش کردہ عبارت کے بعد آگے چل کر حضرت صاحبزادہ صاحبؓ مسیح موعودؑ کی علامات کے ذیل میں لکھتے ہیں :۔

"ساری علامات خود مدعی کی ذات میں پوری ہونی ضروری بھی
نہیں ہوتیں بلکہ بعض اس کے بعد اس کے خلفاء اور متبعین میں
پوری ہوتی ہیں کیونکہ اس کے خلفاء اور متبعین اس سے الگ
نہیں ہوتے در اصل علامات بیان کرتے ہوئے صرف سلسلہ
کے بانی کے نام لے دیا جاتا ہے۔ مگر عملاً بعض باتیں خود اس
میں ظاہر ہوتی ہیں اور بعض اس کے خلفاء اور متبعین میں ظاہر ہوتی
ہیں اور سب اس کی علامات کہلاتی ہیں۔ کیونکہ وہ اس
سلسلہ کا بانی ہوتا ہے اور باقی اس کے پیرو۔ یعنی وہ اصل
ہوتا ہے اور باقی فرع"

(تبلیغ ہدایت صفحہ ۲۹ مطبوعہ نظارت اشاعت لٹریچر)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ مسیح موعودؑ کی بعض علامات حضرت مرزا بشیر احمد صاحب
کے نزدیک بھی آپ کے خلفاء کے ذریعہ پوری ہوں گی جس کے لئے مسیح موعود
کا وجود اصل ہے اور وہ خلفاء مسیح موعود کی فرع ہیں اسطرح مسیح موعود میں
ہو کر وہ سب مثیل مسیح ہیں پس حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا مسیح موعودؑ
سے کوئی اختلاف نہیں ہے یہ صرف آپ کی سمجھ کا قصور ہے۔

دَابَّةُ الْاَرْض

نزول المسیح میں حضرت مسیح موعود کا قرآن مجید کو ذوالمعارف
قرار دینا درست ہے۔ لیکن آپ کے ذوالمعارف ہونے کی بناء پر آپ کا یہ

بیان بھی درست ہے کہ :-

"قرآن شریف فرماتا ہے کہ آخری زمانہ میں دو قسم کے دابۃ الارض پیدا ہو جائیں گے۔ (۱) ایک تو علماء بے عمل جن کے دل زمین کے ساتھ چسپاں ہوں گے زمین کی شہرت چاہیں گے۔ (۲) دوسرا طاعون کا کیڑا جو بطور سزا دہی ظاہر ہوگا۔ سو اس زمانے میں دونوں باتیں ظہور میں آگئیں۔" (نزول المسیح ص۴۲ طبع اول)

مگر آپ اس پر معترض ہیں کہ :-

"ظاہر ہے کہ مرزا صاحب نے ایک ہی آیت میں لفظ دابۃ الارض کے پہلے تو مجازی معنی "علماء ظاہر" بیان کئے اور بعد میں اس کے لغوی یا حقیقی معنی طاعون کا کیڑا بتائے۔ پھر ان دونوں میں تناقض کو دفع کرنے کے لئے بتایا کہ اس لفظ کے بیک وقت دونوں معنے لینا درست ہے۔ اور ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی قرآنی معارف اس طرح بتدریج کھلے تھے اس طرح مرزا صاحب نے دو غلطیاں کیں۔ (۱) پہلی غلطی یہ کی کہ ایک ہی آیت میں ایک ہی لفظ دابۃ الارض کے مجازی معنی اور حقیقی یا لغوی معنی اکٹھے کر دیئے جو علم لغت کی رو سے امر محال ہے (۲) دوسری غلطی یہ کی کہ ایک بہت بڑا جھوٹ بولا گویا محمد صلے اللہ علیہ وسلم بھی

قرآنی آیات کا مطلب و مفہوم بیان کرتے ہوئے ایسی
غلطیاں کرتے رہتے ہیں اگر مرزا صاحب نے جھوٹ نہیں
بولا تو بتایا جائے۔ کہ کس کا مطلب بیان کرتے ہوئے آنحضرت
نے پہلے تو ایک لفظ کے صرف مجازی معنی بیان کئے
پھر کچھ عرصہ بعد اس لفظ کے حقیقی یا لغوی معنی بیان کئے
اور پھر تناقض کو دور کرنے کے لئے دونوں معنوں
کو اکٹھا کر دیا اور اسے قرآنی معارف میں تدریج کا
نام دیا۔"

الجواب آپ کے یہ دونوں اعتراض غلط ہیں اور دوسرا اعتراض
نہایت ہی بیجا اور سراسر افترا اور جھوٹ ہے۔ آپ کے
پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دابۃ الارض کے معنی سواری کا جانور
اس کی حقیقت عرفیہ عامہ ہے۔ اور اس حقیقت عرفیہ عامہ کے مقابلہ میں
دابۃ الارض سے کسی خاص قسم کا انسان مراد لینا مجاز ہے۔ اور
طاعون کے جراثیم بھی اسی حقیقت عرفیہ عامہ کے مقابلہ میں مجاز ہی ہیں
پس اس جگہ دو مجازی معنی ہی دابۃ الارض کے ایک حقیقت
عرفیہ کے بالمقابل بیان ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو علم بلاغت سے کچھ
مس ہے تو آپ کو جاننا چاہیئے کہ حقیقت عرفیہ کے مقابلہ میں حقیقت
لغویہ بھی مجاز بن جاتی ہے۔ قرآن مجید کی آیت وما من دابۃٍ
فی الارض الا علی اللہ رزقھا (ہود آیت ۶) میں تمام جاندار

مخلوق کے لئے یہ لفظ استعمال ہُوا ہے ۔ یہ عرف خاص قرآنی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اخرجنا لهم دابةً من الارض والی آیت میں دابّة الارض کے دونوں معنی مجازی ہیں ۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان الله و ملٰئکته یصلّون علی النّبی یاایّها الذین اٰمنوا صلّوا علیه و سلّموا تسلیمًا۔ اس آیت میں خدا اور فرشتوں کے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجنے کا ذکر ہے اور مومنوں کو آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کی ہدایت ہے۔ لیکن اس جگہ یصلّون میں صلوٰۃ کا لفظ خدا اور ملائکہ کے لئے دو معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ مراد خدا کے نبی پر صلوٰۃ سے خدا کی رحمت خاصہ کے لئے ملائکہ کو حکم دینا ہے۔ اور ملائکہ کی طرف سے صلوٰۃ سے تعمیل حکم مراد ہے اس طرح خدا اور ملائکہ کی صلوٰۃ الگ الگ مفہوم رکھتی ہیں اور مومنوں کی صلوٰۃ سے مراد آگے والی آیت میں محض دعا کرنا ہے۔ جس کے مقابلہ میں رحمت کے لئے حکم دینا اور رحمت کے حکم کی تعمیل کرنا دونوں مجازی معنی ہیں ۔ جو ایک لفظ میں جمع ہیں۔

افسوس ہے کہ دوسری غلطی بیان کرنے میں آپ نے حضرت مسیح موعودؑ کی طرف منشاء متکلم کے خلاف یہ منسوب کر دیا ہے کہ گویا محمد صلے اللہ علیہ وسلم بھی قرآنی آیات کا مفہوم بیان کرنے میں ایسی غلطیاں کرتے رہے۔

جنابِ من! یہ آپ کا افتراء ہے نہ حضرت مرزا صاحب علیہ السّلام

نے ایسا کہا ہے نہ ان کے کسی فقرہ کے ایسے معنی لئے جا سکتے ہیں
آپ نے تو فرمایا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی قرآنی معارف
تدریجاً کھلے۔ اس کا یہ مطلب نکالنا گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم
قرآنی آیات کا مفہوم بیان کرنے میں غلطیاں کرتے تھے صریح افترا ہے
اور رسول کریمؐ پر ذوالمعارف آیات کا مفہوم تدریجاً کھلنا ہر گز قابلِ اعتراض
نہیں اس میں قطعاً کوئی جھوٹ بولنے کا شائبہ نہیں۔ خود رسول کریمؐ نے
فرمایا ہے قرآن کریم کا ایک ظاہر ہے اور اس ظاہر کا بطن بھی ہے ظاہر
کے مقابلہ میں بطن بہرحال دوسرے معنی ہونگے۔ خدا کا رسول کریمؐ کو یہ دعا
سکھانا قل رب زدنی علماً معارف قرآنی کے کھلنے کے لئے بھی
استدعا ہے۔ چنانچہ دیکھئے آیت الذین یومنون بالغیب کی
تفسیر میں رسول کریمؐ کے دو مختلف وقتوں کے دو قول مذکور ہیں (۱) ایک
قول یہ ہے عن نویلہ بنت اسلم قالت قامت الظھر
والعصر فی مسجد بنی حارثہ فاستقبلنا مسجد ایلیا فصلینا
سجدتین ثم جاءنا من یخبرنا ان رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم قد استقبل البیت الحرام فتحول الرجال
مکان النساء والنساء مکان الرجال وصلینا السجدتین
الباقیتین ونحن مستقبلوا البیت الحرام فبلغ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذلک فقال اولٰئک قوم
اٰمنوا بالغیب۔ (تفسیر درمنثور جلد ۱ ص۲۶ زیر آیت الذین یومنون بالغیب)

ترجمہ:- نویلہ بنت اسلم سے روایت ہے اس نے کہا۔ بنی حارثہ کی مسجد میں ظہر و عصر کی نماز قائم ہوئی تو ہم نے ایلیا، کی مسجد (بیت المقدس) کی طرف منہ کیا اور دو رکعتیں ادا کیں۔ تو ایک آدمی ہمیں خبر دینے آیا۔ کہ رسول کریمؐ نے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر لیا ہے اس پر مرد عورتوں کی جگہ آ گئے اور عورتیں مردوں کی جگہ چلی گئیں۔ تو ہم نے باقی دو رکعتیں نماز کی قبلہ رُخ ہو کر ادا کیں یہ بات رسول کریمؐ کو پہنچی۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لائے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا۔ سُنی ہوئی حدیث نبویؐ پر عمل کرنا خواہ راوی ایک شخص ہو ایمان بالغیب ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ راوی صحابی ہو جس سے حدیث خود کانوں سے سُنی جائے۔

(۲) دوسرا قول ہے۔ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیتنی قد لقیت اخوانی فقال لہ رجل من اصحابہ اخوانک قال بلی انتم اصحابی و اخوانی یاتون من بعدی یومنون بی و لم یرونی ثم قرأ الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ۔ (درمنثور جلد ا صفحہ ۲۶-۲۷)

ترجمہ:- حضرت انسؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہؐ نے فرمایا۔ کاش میں اپنے بھائیوں سے ملتا۔ اس پر آپؐ کے اصحاب میں سے ایک نے کہا۔ اپنے بھائیوں سے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں تم لوگ میرے اصحابی ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے وہ مجھ پر ایمان لائیں گے

اور انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا - پھر آپ نے الذین یؤمنون بالغیب کی آیت پڑھی - اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد آکر ایمان لانے والے لوگوں کو بھی جنہوں نے آپ کو دیکھا نہیں اور معنوں میں الذین یؤمنون بالغیب کا مصداق قرار دیا ہے اور صحابہ کرام کو اور معنوں میں اور یہ دونوں معنی باہم مختلف ہیں اور نبی کریمؐ کی طرف سے الذین یؤمنون بالغیب کی دو تفسیریں ہیں - اور جس طرح دابۃ الارض کے لفظ کے متشابہ ہونے کی وجہ سے اس کی دو تفسیریں حضرت مسیح موعودؑ نے بیان فرمائی ہیں - اسی طرح الذین یؤمنون بالغیب کی آیت میں الغیب کے متشابہ لفظ ہونے کی وجہ سے اس کی دو تفسیریں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں جو باہم مختلف ہیں - اور مصداق ان کے الگ الگ اشخاص ہیں جس طرح دابۃ الارض کے مسیح موعودؑ کے بیان کردہ دو مختلف معنوں کے مصداق الگ الگ ہیں - پس قرآن کریم کا ذوالمعارف ہونا تو ظاہر ہی ہے - اور حضرت مسیح موعودؑ کا یہ بیان بالکل سچ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی قرآنی معارف بتدریج کھلے تھے - آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں کچھ وضاحت فرمانے کی ضرورت نہیں سمجھی - کیونکہ یہ دونوں معنی ایسے ضدین نہیں جن کا ایک وجود میں تحقق تسلیم کیا گیا ہو نہ دابۃ الارض کے دونوں معنی ایسے ضدین ہیں جن کا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کسی ایک

وجود میں تحقق مانا ہو۔ ضدین کے ایک محل مقام اور وجود میں تحقق محال ہوتا ہے۔

کفر و ایمان کی بحث

بے شک حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کہا ہے کہ کافر قرار دینا احکام جدیدہ لانیوالے نبیوں کا ہی کام ہے اور مراد اس سے التزاماً کفر ہی ہے۔ التزاماً کفر اور لزوماً کفر کی دو قسمیں فقہائے اسلام میں مسلّم ہیں۔ مسیح موعودؑ نے کسی جگہ بھی اپنے منکر کو کافر قسم اوّل قرار نہیں دیا۔ جو التزاماً کفر ہے اور التزاماً کافر درحقیقت دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا اسلام کا انکار کر کے خود التزام کرتا ہے۔ اور مثلاً مسیح موعودؑ کے انکار کو دوسری قسم کا کفر قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ تشریعی نبی نہیں اس دوسری قسم کی ذیل میں اور وجوہ کفر بھی آتی ہیں۔ تبھی مثلاً مسیح موعودؑ کا انکار کہہ کر اسے دوسری قسم کا کفر قرار دیا گیا ہے پس یہ کفر قسم دوم قسم اوّل سے الگ نوع کا ہے۔ کیونکہ ایک جنس کی دو نوعیں ایک دوسرے سے تبائن اور تخالف رکھتی ہیں۔ یہ دونوں جنس میں جا کر تو ایک قسم بنتی ہیں۔ لیکن نوع کے لحاظ سے ہمیشہ مختلف ہوتی ہیں پس التزاماً کفر حقیقۃً دائرہ اسلام سے خروج ہے۔ اور لزوماً کفر حقیقۃً دائرہ اسلام سے خروج نہیں اس کیلئے دائرۂ اسلام سے خروج کا لفظ تغلیطاً ہی استعمال ہو سکتا ہے نہ کہ ظاہراً اور حقیقۃً۔ جیسا کہ ظالم کو یہ جان کر کہ وہ ظالم ہے قوت دینے والے کے لئے رسول کریمؐ نے خرج من الاسلام

کے الفاظ استعمال کئے ہیں - مواخذہ کے مسئلہ میں بھی التزاماً کفر اور لزوماً کفر ایک گونہ مشترک حیثیت کے حامل ہوتے ہیں - یعنی ان پر اتمام حجت ہوجانے کی صورت میں مواخذہ ہوگا اور اتمام حجت نہ ہونے کی صورت میں مواخذہ نہیں ہوگا - حضرت مسیح موعودؑ نے صاف لکھ دیا

"کسی کے کفر اور اس پر اتمام حجت کے بارے میں فرد فرد کا حال دریافت کرنا ہمارا کام نہیں یہ اس کا کام ہے جو عالم الغیب ہے یہ بات حقیقۃ الوحی میں موجود ہے اور یہ بھی وہاں لکھا ہوا موجود ہے - کہ ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے نزدیک جس پر اتمام حجت ہو چکا ہے اور خدا کے نزدیک جو منکر ٹھہر چکا ہے وہ مواخذہ کے لائق ہوگا"

(حقیقۃ الوحی صہ ۱۷۹)

آگے چل کر آپ نے یہ بھی لکھا ہے :-

"ہاں ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں - کہ ہم اس کی نسبت نجات کا حکم دیں - اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے ہمیں اس میں دخل نہیں -

ہمیں دعویٰ سے یہ کہنا نہیں چاہیئے - کہ فلاں شخص پر اتمام حجت نہیں ہوا - ہمیں کسی کے باطن کا علم نہیں ہے"

جناب من ! ان عبارتوں کے سیاق میں آپ کی پیش کردہ یہ عبارت پڑھی جائے کہ :-

"جس قادر توانا نے اپنے رسول کو بھیجا اس کی اس میں
کسرِ شان ہے نیز تخلف وعدہ لازم آتا ہے کہ باوجود
اس کے کہ اس نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ میں اپنی حجت
پوری کروں گا۔ پھر بھی وہ مکذبین پر حجت پوری نہ کر سکا"
(حقیقۃ الوحی صلاا طبع اوّل)

آپ کا حضرت مرزا صاحب مسیح موعود علیہ السلام کی تحریروں کو جادو کی پٹاری کہنا محض استہزاء ہے جو منکرین رسل کا شیوہ رہا ہے اور خدا تعالیٰ خود اس پر افسوس سے فرماتا ہے۔

یا حسرۃً علی العباد ما یأتیھم من رسولٍ الّا کانوا بہٖ یستھزءون۔ کہ ان بندوں پر افسوس ہے کہ ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا مگر وہ اس سے استہزاء کرتے ہیں۔

ہم احمدی انبیاء کے DIVINE RIGHT یعنی عصمت کے تو قائل ہیں لیکن انبیاء کی طرح بادشاہوں کے لئے ایسے حق کے قائل نہیں ہاں قرآن مجید میں خدا کی شان یہ ضرور بیان کی گئی ہے۔ قل اللّٰھمّ مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعزّ من تشاء وتذلّ من تشاء بیدک الخیر انّک علیٰ کلّ شیءٍ قدیر۔ (آل عمران آیت ۲۷)

کہدے اے خدا تو ملک کا مالک ہے۔ جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے

اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بے شک تو ہر شے پر قادر ہے۔

پس خدا کا مسلمانوں سے حکومت چھین کر انگریزوں کو دینا اس کی مشیّت کے ماتحت تھا۔ چونکہ مسلمان اس وقت حکومت کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس لئے ان سے حکومت چھین کر خدا تعالیٰ نے ان پر انگریزوں کو مسلّط کر دیا۔ لیکن اس میں بھی خدا تعالیٰ کے مدّنظر اسلام کے لئے ایک بھلائی تھی۔ چونکہ اس حکومت نے اپنی سب رعایا کو مذہبی آزادی دیدی اس لئے خدا نے مسیح موعودؑ کو مثیل عیسیٰ علیہ السلام کے طور پر کھڑا کر دیا وجوہِ مماثلت میں سے ایک وجہ اس کا غیر حکومت کے ماتحت آنا بھی تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی رومن حکومت کے ماتحت رہے تھے جو بُت پرستوں کی حکومت تھی۔

ہم اپنے پہلے جواب میں بتا چکے ہیں کہ غیر مسلم حکومت کی وفاداری سے اطاعت کے صرف یہ معنی ہیں کہ قانون شکنی نہ کی جائے گویا غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کو فساد پیدا کرنے اور قائم شدہ امن کو خواہ وُہ غیر مسلم حکومت کے ذریعہ قائم ہُوا ہو۔ آیت قرآنیہ لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (الاعراف آیت ۵۷) کے مطابق برباد کرنے کی اجازت نہیں۔ غیر مسلم حکومت بھی تعاون چاہتی ہے اس لئے یہ تعاون فرض ہے اور خدا کا حکم ہے۔ تعاونوا علی البرّ والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ (المائدہ آیت ۲)

کہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہم تعاون کرو۔ گناہ اور سرکشی میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔ چونکہ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو پرسنل لاء کے ماتحت مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے نیکی کی راہیں کھلی تھیں اور بدی کی راہیں شریعت محمدیہ کے مطابق پہلے ہی بند تھیں حکومت انہیں چوری اور بدکاری پر مجبور نہیں کرتی تھی۔ فوجیوں کی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لئے جو عورتیں مہیا کی جاتی تھیں ان کے مہیا کرنے کے لئے مسلمان مجبور نہیں کئے جاتے تھے چونکہ ایسی باتوں پر تعاون خلاف شرع تھا۔ اسلئے حضرت مسیح موعودؑ نے مسلمانوں کو انگریزوں سے ایسے امور میں تعاون کی ہدایت نہیں دی۔ جو خلاف شرع ہوں۔ ابھی تک پاکستان میں بھی حدود شرعیہ نافذ نہیں ہوئیں۔ تو کیا آپ اس حکومت کی بھی وفاداری سے اطاعت نہیں کریں گے بلکہ منافقت سے ہی اطاعت کریں گے۔ کیونکہ بغاوت تو آپ کرنا نہیں چاہتے۔ اور آپ کے نزدیک وفاداری سے اطاعت اور بغاوت کے درمیان بھی کوئی حالت ہے۔ مگر ہمیں تو وہ حالت منافقت ہی نظر آتی ہے۔ اس لئے حضرت مسیح موعودؑ نے مولوی محمد حسین کو انگریزوں کی حکومت میں سلطان ٹرکی کو اپنا واجب الحکم بادشاہ ماننے کی صورت میں منافقت قرار دیا۔ مگر آپ نے اس بیان پر ایک مفروضہ پیش کیا ہے جسے ہم درست نہیں سمجھتے۔ ہم اپنی حکومت کے وفادار ہیں۔ منافقانہ طور نہیں۔ سچے دل سے وفادار ہیں۔ گو بعض باتوں

میں ہمیں حکومت سے اختلاف بھی ہے لیکن ہمارے امام مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز ہمیں کبھی یہ حکم نہیں دے سکتے اور نہ دیتے ہیں کہ قانون شکنی کی جائے اور بدامنی پیدا کی جائے۔ اور ملک میں فساد پھیلا یا جائے چنانچہ آپ نے صاف طور پر اپنے حالیہ خطبات میں جماعت کو دلائل کے ساتھ اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ قانون شکنی سے بچیں۔ اور جماعت کے بچوں کو بھی یہی تلقین فرمائی جو تربیت حاصل کرنے کے لئے ربوہ آئے ہوئے تھے۔ آپ کے خطبات شائع شدہ ہیں اس لئے احمدی وفاداری میں منافقت اختیار نہیں کر سکتا۔ جس ملک میں بھی وہ رہتا ہو۔ چونکہ مسیح موعود علیہ السلام کی قرآن مجید کی روشنی میں ہدایت ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کی جائے اس لئے خلیفہ کوئی ایسا حکم کسی احمدی کو نہیں دے سکتا کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں میں منافقت کے ساتھ حکومت کی اطاعت کریں۔ ہمیں حکومت کی بعض باتیں ناپسند ہو سکتی ہیں لیکن ان کے ازالہ کی صورت ایجی ٹیشن کے ذریعہ کرنا ہمارا مسلک نہیں۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ حکومت کی اصلاح کے لئے دعائیں کی جائیں اور خدا کو اس بات پر قادر سمجھا جائے کہ وہ شر کو دور کر سکتا ہے

آپ نے جو آیات اس مضمون کی پیش کی ہیں۔ جن کا مضمون یہ ہے کہ مومن کافروں، یہودیوں یا عیسائیوں کو ولی نہ بنائیں۔ اس کا جواب ہم اپنے پہلے مضمون میں دے چکے ہیں۔ اب پھر سن لیں اور یاد رکھیں کہ

کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یہ بھی فرماتا ہے:۔

لایتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من
دون المؤمنین ومن یفعل ذٰلک فلیس
من اللہ فی شیءٍ اِلَّا اَن تتقوا منھم تقٰۃ
ویحذرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر۔
(آل عمران آیت ۲۸)

ترجمہ:۔ مومن کافروں کو اپنا ولی نہ بنائیں۔ مومنوں کو چھوڑ کر جو
ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کچھ بھی تعلق نہیں رہے گا۔
سوائے اس صورت کے کہ ولی بناتے ہوئے تم ان کافروں
سے اپنا بچاؤ کرلو اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا
ہے۔ یعنی کافر حکام سے ڈرو نہیں، صرف خدا سے ڈرو
اور اللہ کی طرف ہی تمہاری بازگشت ہے۔

اس آیت میں کافروں کی ولایت کو مومنوں کے لئے صرف اس صورت میں
جائز قرار دیا گیا ہے کہ مومن ان سے اپنا پورا بچاؤ کرلیں۔ پس جو
غیر مسلم حکومت مداخلت فی الدین کرتی ہے صرف وہ مسلمانوں کی ولی امر
اور حقیقی دوست نہیں ہو سکتی۔ اس آیت کے سیاق میں ہی قل
اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع
الملک ممن تشاء والی آیت نازل ہوئی ہے جس سے ظاہر ہے
کہ اگلی آیت میں حکومت کی ولایت کا ہی ذکر ہے اور غیر مسلم حکومت سے

دوستی اور اس کو ولی امر تسلیم کرنا اس آیت سے اسی صورت میں جائز ہو گا کہ اپنی مذہبی آزادی کا تحفظ حاصل کر لیا جائے۔ باقی رہے سیاسی امور تو سیاسی امور میں غیر مسلم حکومت کا تعاون اس حد تک ضروری ہو گا کہ قانون شکنی نہ کی جائے۔ بدامنی پیدا نہ کی جائے اور فساد فی الارض کو ہوا نہ دی جائے۔

سزائیں اسلامی حدود وہاں ہی نافذ ہوں گی جہاں خالص اسلامی حکومت قائم ہو۔ غیر اسلامی حکومت میں اسلامی حدود نافذ کرلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسلامی حدود کو وہ حکومت نافذ کر سکتی ہے۔ جو خود اسلامی ہو۔ اسلام نے بدی سے روکنے کے لئے تین طریقے بیان کئے ہیں۔ طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے روکے۔ اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اگر زبان سے روکنے کی طاقت بھی نہ ہو تو دل میں بُرا جانے۔ لیکن یہ آخری صورت کمزور ترین ایمان کی صورت ہے۔ پس غیر حکومت میں کسی بدی کو طاقت سے نہ روک سکیں تو خدا کا رسول ہمیں مجبور نہیں کرتا کہ ہم اس بدی کو ہاتھ سے روکنے کے لئے ملک میں فساد برپا کریں۔ بلکہ یہ پسند فرماتا ہے کہ ہم اسے وعظ و نصیحت و تبلیغ کے ذریعے روکنے کی کوشش کریں۔ اور اگر کوئی وعظ و نصیحت کی بھی اہلیت نہ رکھتا ہو تو دل میں بُرا مانے۔ در اصل بدی کو ہاتھ سے روکنے کا کام اسلامی حکام کا ہے زبان سے روکنے کا کام غیر حکام

کا ہے۔ پس اسلام بدی سے تعاون کی کبھی اجازت نہیں دیتا۔ خواہ
حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔
بالآخر اس مسئلہ پر غور کریں۔ کہ انگریزوں کی غیر ملکی حکومت
قائم ہوئی۔ تو اب ہندوستان دو خود مختار سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا
ہے۔ ایک کا نام پاکستان رکھا گیا ہے۔ اور دوسری کا نام ہندوستان
رہا۔ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ کا نام دیا گیا۔ ہندوستان میں اب
غیر ملکی حکومت نہیں۔ ملک کے لوگوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے
اور مسلمان بہت بڑی اقلیت ہیں جو سب چھوٹی اقلیتوں کے ساتھ
مل کر حکومت چلا رہے ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ ایسی حکومت میں مسلمانوں
کے لئے اسلام کی ہدایت کیا ہے۔ کیا آپ کے نزدیک ہندوستان
کے مسلمانوں کے لئے ہندوستانی حکومت کے آئین کا احترام ضروری
ہے یا نہیں۔ کیا مسلمانوں کی وفاداری ہندوستانی حکومت کے منافقانہ
ہونی چاہیئے یا غیر منافقانہ۔ آپ کے نزدیک جہاں حکومت مسلمان نہ
ہو وہاں مسلمانوں کے لئے آئین کی اطاعت وفاداری سے نہیں
ہو سکتی۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات آپ سے متفق
ہوں تو ان کا انجام کیا ہو گا۔ کیا آپ ان کو بھاڑ میں جھونکنا جائز
سمجھیں گے۔ آپ ہندوستان سے کشمیر کے بارہ میں پاکستان کی جو
لڑائی ہوئی تھی۔ اس کو جہاد سمجھتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ مودودی صاحب
نے تو اسے جہاد نہیں جانا تھا بلکہ اسلامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا تھا

آپ کے افکار کس حد تک مودودی صاحب سے ملتے ہیں۔ آپ اگر پاکستان کے از روئے قرآن مجید کس حد تک وفادار ہیں۔ کیونکہ ابھی پورا اسلامی نظام تو یہاں بھی قائم نہیں ہوا کیا آپ پاکستانی نظام کی اطاعت بھی وفاداری سے نہیں بلکہ منافقت سے کرنے کے حامی ہیں جو مودودی صاحب سے آپ کے افکار کس حد تک ملتے ہیں۔

واضح رہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں چونکہ اسلامی حکومت کا نفاذ ہو چکا تھا اس لئے خلفائے راشدین نے مسلمانوں پر کسی کافر کو حاکم نہیں بنایا لیکن حکومت کے نفاذ سے پہلے طائف سے مکہ میں داخل ہونے کے لئے آپؐ نے کافر کا تعاون فرد حاصل کیا تھا ہماری بحث تو غیر مسلم حکومت کے متعلق چل رہی تھی نہ کہ اسلامی حکومت کے متعلق۔

آپ نے اپنے مضمون کے صفحہ ۱۳ پر جو تین آیتیں سورۂ نساء کی ۱۴۴/۱۴۲ سورۃ مائدہ کی ۵/۵۱ اور سورۃ توبہ کی ۹/۲۳ درج کی ہیں۔ ان کا حل ہم نے سورۂ آل عمران آیت ۲۸ کے الفاظ الا ان تتقوا منھم تقٰۃ کی روشنی میں پیدا کر دیا ہے۔ غیر مسلم حکومت کی وفاداری سے اطاعت اس استثنائی صورت سے ثابت ہے اور ان تین آیتوں کے بعد آپ نے سات آیتیں پیش کی ہیں جن میں ذکر الٰہی سے غافلوں، کافروں منافقوں اور دین کو جھٹلانے والوں کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے اور آخری آیت میں گناہگار اور کافر کی اطاعت سے روکا ہے۔ ان

میں پہلی سورۃ کہف کی آیت ۲۸ اور دوسری سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ اور تیسری سورۃ شعراء کی آیت ۱۵۱ ہے اور چھٹی سورۃ القلم کی آیت ۶۸ اور ساتویں سورۃ الدھر کی آیت ۲۴ ہے یہ سب سورتیں تو مکی ہیں چوتھی اور پانچویں دونوں آیتیں نمبر ۱ و ۴۸ سورۃ الاحزاب اور سورۃ الدھر کی ہیں - جو مدنی ہیں - مدینہ میں تو اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی اور کافروں نے مسلمانوں سے لڑائی شروع کر رکھی تھی اور منافقین سے ان کی ساز باز تھی اس لئے ان دونوں آیتوں میں نبیؐ کو ہدایت کی گئی کہ کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیں - کیونکہ کافر منافقوں کے ذریعے دھوکہ دے کر کوئی فتنہ پیدا کر سکتے تھے - اس لئے نبی کو یہ ہدایت دینے سے مقصود دراصل کافروں اور منافقوں کو ان کی بات مانا جانے سے مایوس کیا جانے کے لئے بھی یہ آیات نازل ہوئیں اور نبی کو محتاط کرنے کے لئے بھی کہ منافق خیر خواہی کا رنگ ظاہر کر کے دھوکا نہ دے جائیں - اور کسی بڑے فتنے کا موجب نہ بن جائیں

مکی آیات میں جو کافروں کی بات ماننے سے منع کیا گیا ہے تو یہ بات خاص مداہنت کی ترغیب تھی - کہ کچھ عقائد کے اظہار میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نرمی اختیار کرلیں - مثلاً ان کے بتوں کی تنقیص چھوڑ دیں - تو اس کے بالمقابل وہ بھی نرم رویہ اختیار کرلیں گے - چنانچہ سورۃ القلم کی آیت ودّوا لو تدھن فیدھنون اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ مکّہ میں کافر مداہنت

ہی کرانا چاہتے تھے۔ اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی جہاد کو جو مکہ میں شروع ہو چکا تھا اس تدبیر سے روکنا چاہتے تھے۔ چنانچہ الفرقان کی آیت میں نبی کریمؐ کو ہدایت کی گئی لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا کہ کافروں کا کہا نہ مانو اور قرآن مجید کے ذریعہ ان سے جہاد کبیر کرو۔ اس آیت میں قرآن مجید کی تبلیغ کے لئے مجاہدہ کو اللہ تعالٰے نے جہاد کبیر کا نام دیا ہے۔ ورنہ مکہ میں جہاد بالسیف کی تو اجازت نہ تھی۔ افسوس ہے کہ آپ نے اس آیت کا ترجمہ غلط درج کیا ہے۔ کیونکہ آپ اس آیت کا ترجمہ لکھتے ہیں "اور کافروں کی اطاعت نہ کیجئے، بلکہ ان سے بڑے زور سے جہاد کیجئے۔ اس جگہ آپ نے "بہٖ" کے لفظ کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ جس کے معنے ہیں اس کے ذریعہ اور اس کا مرجع قرآن مجید ہے پس معنے ہوئے قرآن کے ذریعہ اور جاھدھم کو ساتھ ملا کر ترجمہ ہوا۔ ان سے (کافروں) قرآن کے ذریعہ جہاد کر پھر اس جہاد کا نام آگے جہاد کبیر رکھا ہے۔ پس مکی آیتوں میں یہ احکام ہرگز نہیں دیئے گئے کہ مکہ کی حکومت کی بغاوت کر دی جائے۔ اگر ان آیات میں کافروں کی اطاعت نہ کرنے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو مکی حکومت کی بغاوت کا حکم ملتا تو پھر آپؐ کے طائف جانے کے بعد شہریت کے حقوق سے محروم کئے جانے پر مکہ میں ان کے قانون کے مطابق کافر سے تعاون حاصل کرکے داخل نہ ہوتے بلکہ مکہ سے

اسی وقت ہجرت کر جاتے۔ اور پھر جمعیت بنا کر جارحانہ اقدام کرتے۔ حالانکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ شہریت کے حقوق قاعدہ کے مطابق حاصل کر کے مکہ میں رہے اور جب کافروں نے آپ کے قتل کا فیصلہ کر دیا۔ تو خدائی حکم کے ماتحت آپ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ تشریف لے گئے۔

جناب من! ذرا سوچیئے تیس کروڑ مسلمان اس وقت بھی غیر مسلموں کی حکومتوں میں بستے ہیں اگر آپ کی پیشکردہ آیات انہیں یہ سبق دیتی ہیں کہ وہ اپنی ملکی حکومت جس میں حاکم اعلیٰ غیر مسلم ہیں اور اس کے ماتحت حکام بھی زیادہ تر غیر مسلم ہیں اطاعت نہ کریں۔ تو مسلمانوں کا ان سلطنتوں میں رہنا مشکل ہو جائے۔

پس اِلّا ان تتقوا منہم تقٰۃ کی شرط کے مطابق انہیں غیر حکومت کی وفاداری سے اطاعت کا حق حاصل ہے۔ لیکن آپ باوجود ان آیتوں کے اس حکم کے کہ وہ اطاعت نہ کریں آپ انہیں برخلاف ان آیات کے اطاعت کی اجازت تو دیتے ہیں مگر وفاداری سے نہیں۔ یہ طریق آپ کا قرآن مجید سے گویا تمسخر دکھائی دیتا ہے جو بقول آپ کے کافروں کی اطاعت سے تو صاف منع کرتا ہے مگر آپ مسلمانوں کو بے وفائی کے ساتھ اطاعت کی اجازت دیتے ہیں۔ خدا را ان قرآنی آیات کو بازیچہ نہ بنائیے۔ دیکھئے سورۃ الممتحنہ آیت ۸ و ۹ میں خدا تعالےٰ فرماتا ہے:۔

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین

ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم و
تقسطوا الیھم انّ اللّٰہ یحب المقسطین۔
انما ینھٰکم اللّٰہ عن الذین قٰتلوکم فی
الدّین و اخرجوکم من دیارکم و ظاھروا
علیٰ اخراجکم ان تولّوھم و من یتولّھم
فاولٰئک ھم الظّٰلمون۔۔

ترجمہ:۔ تمہیں اللہ ان لوگوں سے نیک سلوک کرنے اور انصاف
کا معاملہ کرنے سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین کے
بارہ میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے باہر
نہیں نکالا۔ وہ تو صرف تمہیں ان لوگوں سے ولایت (دوستی)
رکھنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارہ میں
جنگ کی۔ اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا۔ یا
تمہارے گھروں سے نکالا جانے میں مدد دی اور جو ایسے
لوگوں کو ولی بنائے تو ایسے لوگ (مسلمان) ظالم (بے انصاف)
ہیں۔

یہ آیت مسلمانوں سے دینی لڑائی نہ کرنے والوں اور ان کو ان کے
گھروں سے نہ نکالنے والے غیر مسلموں سے دوستی (ولایت) کے تعلق
سے منع نہیں کرتی۔ لہذا ایسے لوگوں سے نیک سلوک اور انصاف
کی ہدایت ہے۔ مگر آپ قرآن مجید سے یہ حکم نکالنا چاہتے ہیں کہ ایسے

غیر مسلموں سے نیک سلوک نہ کیا جائے کیونکہ ان کی حکومت میں رہتے ہوئے ان سے بیوفائی کو آپ جائز رکھتے ہیں جو نیک سلوک اور انصاف کا معاملہ نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک بد سلوکی اور بے انصافی کا ہی معاملہ ہے۔ جسے خدا تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔

پس جنابِ من! آپ کا عقیدہ اسلام کو داغدار کرنے والا ہے اور یہ دنیا میں قائم ہو جائے تو سخت فتنہ کا موجب ہوگا۔ آپ اسلام سے نادان دوست کا معاملہ نہ کریں۔ بیوفائی کے ساتھ غیر مسلموں کی اطاعت اگر آزادی ہے۔ تو یہ آزادی قابل شرم ہے۔ فتدبر ولا تکن من العادین۔

آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بادشاہ کے سامنے درخواست اجعلنی علیٰ خزائن الارض سے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ انہوں نے کلی اختیارات کا مطالبہ کیا تھا۔ جو بادشاہِ وقت نے پورا کر دیا اور بادشاہت سے دست بردار ہو گیا۔ آپ کے نزدیک اجعلنی علیٰ خزائن الارض کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے کوئی اعلیٰ عہدہ دے دو۔ یا وزیر خزانہ بنا دو (آپ کا آخری مضمون ص۱۴۲) دلیل اس کی آپ اگلی آیت بتاتے ہیں۔ کذٰلک مکّنّا لیوسف فی الارض۔ آپ لکھتے ہیں کہ تمکین فی الارض حکومت یا اقتدار کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ ذی القرنین کے متعلق آیا ہے۔ انّا مکّنّا لہ فی الارض۔ ہم نے ذی القرنین کو زمین پر حکومت عطا فرمائی تھی۔

کسی دوسرے کے ماتحت کوئی اعلیٰ عہدہ نہیں۔ اگر حضرت یوسف بادشاہ کے
ماتحت ہوتے اور اس کی وفاداری سے اطاعت ضروری سمجھتے تو بادشاہ
کے نافذ کیے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے بھائی بن یامین کو
کیسے روکتے ؟ (مضمون ص۱۴۳)

الجواب جنابِ من! آپ کی یہ بات کہ بادشاہِ مصر حضرت یوسفؑ کے
حق میں تختِ حکومت سے دستبردار ہو گیا تھا تاریخ کے بھی
خلاف ہے اور قرآن مجید کی آیت ماکان لیاخذ اخاہ فی دین
الملک کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ اس آیت کا تعلق اس زمانہ سے ہے،
جب خوشحالی کے سات سالوں کے بعد یوسف علیہ السلام کے بھائی قحط کے
سال کے وقت غلہ لینے کے لئے مصر میں آئے۔ پس اس آیت سے ظاہر ہے
کہ اس زمانہ میں شاہی قانون تو رائج تھا لیکن بقول آپ کے حضرت
یوسف علیہ السلام نے اسے توڑا۔ جب توڑا تو قائم ہوتے ہوئے توڑا
گیا اور اس سے ثابت ہو گیا کہ بادشاہ تو در اصل فرعونِ مصر ہی تھا ہاں
اس نے بہت بڑے اہم عہدہ پر انہیں اختیار دے دیا تھا جس کی بناء پر
خدا نے فرمایا تھا کذٰلک مکنّا لیوسف فی الارض کہ اس طرح
ہم نے یوسف کو زمینِ مصر میں اقتدار دیا۔ ذی القرنین کے اقتدار میں فرق ہے
یوسف علیہ السلام کو اقتدار ایسا حاصل تھا جیسا کہ وزیر اعظم کو ہوتا
ہے۔ ہمارے نزدیک یوسف علیہ السلام نے ملکی قانون توڑا نہیں۔ بلکہ
الٰہی تدبیر کے ماتحت اس کے ٹوٹنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ معلوم ہوتا ہے

قانون یہ تھا کہ کوئی غیر ملکی مصر میں بلاجرم کرنے کے روکا نہیں جا سکتا تھا اس طرح حضرت یوسفؑ اپنے بھائی بن یامین کو مصر میں بلاجرم قانوناً روک نہیں سکتے تھے۔ لیکن ان سے بھول کر بھائی کے بار دانہ میں پیمانہ رہ گیا اور ان پہ چوری کا الزام لگ گیا۔ اور ان کے بھائیوں نے تلاش کنندگان کو کہدیا تھا کہ جس کے پاس سے ملے وہی اس کی سزا ہے اس لئے ایسی تدبیر سے وہ بھائی کے پاس رہ گئے۔ شاہی قانون بھی نہ ٹوٹا۔ اور بھائی بھی اس تدبیر سے پاس رہ گیا۔ اس امر کو خدا تعالے نے کذٰلک کدنا لیوسف ما کان لیأخذ اخاہ فی دین الملک کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ ملک کا قانون شاہی بھی جاری تھا جسکی تعمیل ہو گئی اور بادشاہ جس کا قانون جاری تھا وہ بھی یوسف علیہ السّلام کے علاوہ کوئی شخص تھا۔ یوسف علیہ السلام بادشاہ نہ تھے۔

آپ نے لکھا ہے کہ ہندوستان کو آزادی دلانے کا سہرا ان لوگوں کے سر ہے جو پرسنل لا میں آزادی حاصل کرنے کے باوجود مطمئن نہیں ہوئے اور انگریزوں پر بغاوت کا خوف طاری رکھا۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ مسلم لیگ نے جو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی کوئی ایسا اقدام نہیں کیا۔ جو باغیانہ ہو بلکہ قانون کے اندر رہتے ہوئے آزادی کا مطالبہ کیا۔ قائد اعظم پہلے کانگریس میں شامل تھے لیکن ۱۹۳۰ء میں جب کانگریس نے سول نافرمانی کا ریزولیوشن پاس کیا تو آپ اس سے

علیحدہ ہو گئے۔ کہ اس سے ملک میں خونریزی ہو گی۔ اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ پس جن مسلمانوں نے کانگریس کا ساتھ دیا۔ انہوں نے خود قرآنی تعلیم کے خلاف عمل کیا۔

جناب من! پیش دستی کر کے جنگ کرنے کو جرم قرار دینے والی آیت آپ نے طلب کی ہے سو وہ آیت یہ ہے:۔

قاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقتلونکم

ولاتعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین۔ (البقرہ۔۱۹)

کہ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اور تم حد سے نہ بڑھو۔ خدا حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

مسلمانوں کو کفار سے جنگ کرنے کا حکم ان کے مظلوم ہونے کے بعد ملا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وانّ اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔ (الحج ۳۹) کہ ان لوگوں (مسلمانوں) کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے دشمنوں سے جنگ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے۔ کہ وہ ظلم کئے گئے ہیں وھم بدءوکم اوّل مرّۃ (توبہ ۱۳) کے ماتحت انہوں نے جنگ میں پہل کی تھی۔

پس اسلام میں جہاد بالسیف کا دفاع کی خاطر حکم دیا گیا ہے سیاسی جنگ کا یہ حکم نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم بادشاہوں کو خطوط لکھے۔ ان میں جنگ کی کوئی دھمکی نہ تھی۔ بلکہ اسلام قبول کرنے پر

عذاب الٰہی سے بچنے کی بشارت تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کو جو خطوط لکھے تھے ان میں نہ دفاعی جنگ کا ذکر ہے نہ جارحانہ جنگ کے ارادہ کا ذکر ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جارحانہ اقدام تو کر ہی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ قاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم کہکر خدا تعالےٰ نے آپ کو ایسا کرنے سے روک دیا ہوا تھا۔ اور آیت اذن للّذین یقاتلون بانّھم ظلموا میں صرف دفاعی جنگ کا حکم دیا گیا تھا۔

جنابِ من! آپ پرسنل لاء کی آزادی کے ساتھ غیر مسلم حکمرانوں کی وفاداری سے اطاعت کو غلطی قرار دیتے ہیں۔ مگر قرآن مجید کی آیت الا ان تتقوا منھم تقٰۃ کی شرط کے ساتھ غیر مسلم حکومت کا ولی امر ہونا مسلمانوں کے لئے جائز قرار دیتی ہے۔ مگر آپ اسے قابلِ شرم قرار دیتے ہیں۔ سو کیا آپ کو قرآن کریم کی تعلیم سے شرم آتی ہے جس پر عمل کرنا اصولی طور پر آپ بھی ضروری جانتے ہیں۔ اگر ضروری جانتے ہیں کیونکہ آیت الا ان تتقوا منھم تقٰۃ پر آپ بھی ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر ضروری نہ سمجھیں تو پھر سارے قرآن پر آپ کا ایمان ہی نہیں۔ جس امر کو آپ غلامی کہکر قابلِ شرم قرار دیتے ہیں اس طریق کے اختیار کرنے سے اسلام کی احمدیوں کے ذریعہ دنیا میں اشاعت ہو رہی ہے۔ اور انشاء اللہ اسلام اس طریق سے غالب آئے گا۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کشف الغطاء ص۲۳ طبع اول میں درست لکھا ہے کہ قرآن میں ایسی تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ دین کو تلوار کے ساتھ مدد دی جائے مگر مراد اس سے دین کے لئے جارحانہ اقدام کی تعلیم کا قرآن میں موجود نہ ہونا ہے۔ مدافعانہ اقدام کی قرآن نے مسلمانوں کو اجازت دے رکھی ہے۔ آپ نے اس پر سوال کیا ہے۔ کہ مرزا بشیر احمد کے بقول جو جنگیں مسلمانوں نے سیاسی اغراض کے تحت لڑی تھیں ان کا مقصد دین کو تلوار کے ساتھ مدد دینا تھا یا نہیں۔ جواباً عرض ہے۔ کہ چونکہ اسلام میں صرف دفاع کے لئے جنگ جائز ہے۔ اس لئے جو سیاسی جنگیں دفاعی تھیں وہ تو اسلامی تعلیم کے مطابق تھیں اور جن جنگوں میں مسلمانوں نے جارحیت اختیار کی ہو انہیں تلوار کے ساتھ دین کو مدد دینا قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ان میں تو دین کی خلاف ورزی ہے۔ فتدبر!

احکام القرآن قرآن مجید کے احکام کے متعلق ہم نے پہلے مضمون میں بزرگوں کے اقوال سے دکھا دیا ہے۔ کہ مصرح احکام تو پانچصد ہی ہیں لہٰذا اگر اصولی اور فروعی احکام ملا کر سات صد احکام نہ بنے تو اسے گنتی ہی کی غلطی تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ مقصود تو سات صد احکام پر عمل سے ہے۔ کہ قرآن مجید کے تمام احکام پر عمل کیا جائے گنتی اصل مقصود نہیں۔ تاہم اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے شمار کرنے کی غلطی کو آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں تو خود شمار کر کے غلطی نکالیں یونہی ہم پر الزام نہ دیتے جائیں۔ کہ ہم شمار نہیں کریں گے اگر چاہیں تو

ربوہ میں آجائیں اور ہماری موجودگی میں آکر شمار کرلیں۔ ہم آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں آپ کی رہائش اور خور و نوش کا مناسب انتظام کردیا جائے گا مگر پہلے اطلاع دیں ؛

جنابِ من! موعود زلزلے کے عنوان کے تحت آپ نے ازالہ اوہام جلد اول ص۶ کی عبارت سیاق سباق سے قطع و برید کرکے پیش کی ہے، جس سے اصل حقیقت اس عبارت کی مخفی رہتی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے :۔

"حضرت مسیحؑ کی پیشگوئیوں کا حال اس سے زیادہ ابتر ہے کیا یہ بھی کوئی پیشگوئیاں ہیں کہ زلزلے آئیں گے۔ مری پڑے گی۔ لڑائیاں ہوں گی۔ قحط پڑینگے "

جنابِ من! "اس سے زیادہ ابتر ہے" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس سے پہلے بھی کوئی امر بیان ہو رہا ہے۔ جس کی نسبت سے حضرت مسیحؑ کی پیشگوئیوں کی حالت کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ پھر اگلی عبارت بھی آپ نے چھوڑ دی ہے جس میں کئی پیشگوئیاں مذکور ہیں جن کی حالت ان پیشگوئیوں سے بھی زیادہ کمتر بیان ہوئی ہے۔ اور اس جگہ بعض انجیلی پیشگوئیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو پوری نہیں ہوئیں۔ اور اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ ان پیشگوئیوں میں غلطیاں نفس الہام میں نہ تھیں بلکہ سمجھ اور اجتہاد کی غلطی تھی۔ اس کے بعد ہیرودس کو کرامت نہ دکھانے کا ذکر ہے اور بالآخر لکھا ہے :۔

اب خیال کرنا چاہیئے کہ اگر حضرت مسیحؑ میں اقتداری طور پر

جیساکہ عیسائیوں کا خیال ہے معجزہ نمائی کی قوت ہوتی تو
ضرور ہیرودس کو جو ایک خوش اعتقاد آدمی اور اُن
کے وطن کا بادشاہ تھا۔ کوئی معجزہ دکھاتے۔ مگر وہ
کچھ بھی نہ دکھا سکے۔"

(ازالہ اوہام طبع اول صفحہ ۹)

اس مضمون سے ظاہر ہے کہ مسیح کے معجزات اور پیشگوئیاں جو انجیل
میں مذکور ہیں ان پر عیسائیوں کے خیالات کے پیش نظر تنقید کی گئی ہے
اور یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ حضرت مسیح کے معجزات ایسے اقتداری نہ تھے
کہ جب چاہا دکھا دیئے۔ عیسائیوں کے خیال میں مسیح کے معجزات
ایسے اقتداری تھے کہ وہ بغیر دعاء کے جب چاہتے معجزات دکھا دیتے
تھے۔ اور یہ امر ان کی الوہیت کی دلیل ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام
عیسائیوں کی اس مزعومہ خصوصیت مسیح کو رد کرنا چاہتے ہیں مسلمان علماء
بھی عیسائیوں کے اس خیال سے کافی حد تک متاثر تھے۔ گو اپنے تئیں
وہ باذن اللہ کی توجیہ سے ان کی الوہیت کے قائل نہیں جانتے۔ حالانکہ
مسیح کو حقیقی طور پر مردوں کا زندہ کرنے والا قرار دے کر وہ بھی شرک
کے مؤید ہیں۔ حضرت مسیح موعودؑ اس امر کو ان کی غلط فہمی یا عیسائیوں
کی مفتریات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اس لئے آپ نے علماء وغیرہ کے حضرت
مسیح سے مماثلت کے دعویٰ کے متعلق مشترک اعتراض کے پیش نظر علماء
وغیرہ کو یہ جواب دیا۔ اس جگہ اول تو یہ جواب کافی ہے کہ جس مسیح کے

مسلمان لوگ منتظر ہیں اس کی نسبت ہر گز احادیث میں یہ نہیں لکھا کہ اس کے ہاتھ سے مُردے زندہ ہوں گے۔ بلکہ یہ لکھا ہے کہ اس کے دم سے کافر مریں گے۔" (ازالہ اوہام طبع اول صلا)

پھر آگے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مشترک سوال کے جواب میں یہ لکھا ہے:-

" علاوہ اس کے خود اللہ تعالٰے نے اسی غرض سے اس عاجز کو بھیجا ہے کہ روحانی مردے زندہ کئے جائیں بہروں کے کان کھولے جائیں اور مجذوموں کو صاف کیا جائے اور وہ جو قبروں میں ہیں باہر نکالے جائیں۔ اور نیز یہ بھی مماثلت ہے کہ جیسے ابنِ مریم نے انجیل میں تورات کا صحیح خلاصہ اور مغز اصلی پیش کیا تھا اس کام کے لئے یہ عاجز مامور ہے تا غافلوں کے سمجھانے کے لئے قرآن شریف کی اصلی تعلیم پیش کی جائے۔" (ازالہ اوہام صلا طبع اوّل)

آگے چل کر صلا پر مسلمان علماء اور عیسائیوں کے مشترک سوال کے پیش نظر ہی حضرت مسیح کے انجیل میں مذکور معجزات اور پیشگوئیوں پر مذاق ہی نہیں بلکہ الزامًا الخصم تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" اور مشابہت کے لئے مسیح کی پہلی زندگی کے معجزات جو طلب کئے جاتے ہیں اس بارے میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ کہ احیائے جسمانی کچھ چیز نہیں۔ احیائے روحانی

کے لئے یہ عاجز آیا ہے اور اس کا ظہور ہو گا۔ ماسوا
اس کے اگر مسیح کے اصلی کاموں کو ان حواشی سے
الگ کر کے دیکھا جائے۔ جو محض افتراء کے طور پر یا غلط
فہمی کی وجہ سے گھڑے گئے ہیں۔ تو کوئی عجوبہ نظر نہیں آتا۔
بلکہ مسیح کے معجزات اور پیشگوئیوں پر جس قدر اعتراضات
اور شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی
اَور نبی کے خوارق اور پیش خبریوں میں کبھی ایسے شبہات
پیدا ہوتے ہوں۔ کیا تالاب کا قصہ مسیحی معجزات کی
رونق کو دور نہیں کرتا۔" (ازالہ اوہام طبع اوّل ص۷)

مکرمی! اس کے بعد وہ عبارت شروع ہوتی ہے۔ جس کا کچھ ادھورا حصّہ
آپ نے اعتراض کی خاطر نقل کیا ہے۔ اس میں زلزلے اور مری اور
لڑائیاں اور قحط کی پیشگوئیوں کو الہامی لحاظ سے ابتر قرار نہیں دیا
گیا بلکہ انہیں معجزات کے مقابلہ میں مسیحؑ کے ان کے متعلق غلط اجتہادات
کے پیش نظر ابتر حالت میں قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ بوجہ اجتہادی
غلطی کے پوری نہیں ہوئیں۔ زیادہ ابتر کا لفظ اس جگہ معجزات کی
نسبت سے استعمال کیا گیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ گو معجزات کے بیان
میں حواشی کے ذریعہ نقائص پیدا کئے گئے ہیں۔ لیکن پیشگوئیوں کی حالت
اس سے بھی ابتر ہے۔ مقصود ایسے لفظ کے استعمال سے الزام خصم ہے۔
فلسطین کے تعلق میں ایسے الفاظ جو اناجیل میں ان پیشگوئیوں

کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ واقعی ان پیشگوئیوں کی کسی عظمت و شوکت پر دلیل نہیں کیونکہ ایسے حوادث اس ملک میں اکثر وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے۔

پس آپ کا یہ سوال کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کا سوال پہلے بھی بعض لوگوں نے کیا ہے۔ جس کا جواب خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دیا ہے۔ اگر آپ نے حقیقۃ الوحی کا مطالعہ کیا ہے تو وہ سوال و جواب، آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ حضور حقیقۃ الوحی کے صفحہ ۵۹ پر سوال نمبر ۴ کے ذیل میں ایک سوال و جواب یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"پہلی کتابوں اور ازالہ اوہام وغیرہ میں لکھا ہے کہ یہ بھی کوئی پیشگوئیاں ہیں۔ کہ زلزلے آئیں گے۔ مری پڑے گی۔ لڑائیاں ہوں گی۔ قحط پڑیں گے۔ لیکن اب کئی تحریروں میں دیکھا گیا ہے۔ کہ انہیں پیشگوئیوں کو جناب والا نے عظیم الشان پیشگوئیاں قرار دیا ہے۔"

الجواب:۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ میں نے انہیں پیشگوئیوں کو عظیم الشان قرار دیا ہے۔ ہر ایک چیز کی عظمت یا عدم عظمت اس کی مقدار اور کیفیت سے اور نیز اس کے حالات خاصہ یا معمولی حالات سے ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام نے جس ملک میں طاعون اور زلزلوں کی خبر دی تھی۔ وہ ملک ایسا ہے کہ اکثر اس میں طاعون کا دورہ رہتا ہے اور کشمیر کی طرح اس میں زلزلے بھی آتے رہتے ہیں قحط بھی پڑتے ہیں۔

اور لڑائیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ اور حضرت مسیح کی پیشگوئی میں نہ کسی خارق عادت زلزلہ کا ذکر ہے نہ کسی خارق عادت مری یا طاعون کا اس صورت میں کوئی عقلمند ایسی پیشگوئیوں کو عظمت اور وقعت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔

اس جگہ حاشیہ میں بھی اسی سلسلہ میں حضورؑ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہاں ممکن ہے کہ اصل پیشگوئیوں میں تحریف ہو گئی ہو۔ جبکہ ایک انجیل کی بیسیوں انجیلیں بن گئی ہیں۔ تو کسی عبارت میں تحریف ہونا کونسا ایسا امر ہے جو بعید از عقل ہو سکتا ہے مگر ہمارا موجودہ انجیلوں پر اعتراض ہے۔ اور خدا نے ان انجیلوں کو محرّف و مبدّل قرار دے کر ہمیں ان اعتراضوں کا موقعہ دیا ہے۔"

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت مسیح کی پیشگوئیوں میں جو انجیلوں میں پائی جاتی ہیں صرف معمولی اور نرم الفاظ ہیں کسی شدید اور ہیبت ناک زلزلہ یا ہیبت ناک طاعون کا ان میں ذکر نہیں ہے۔ مگر میری پیشگوئیوں میں ان دونوں واقعات کی نسبت ایسے لفظ ہیں جو ان کو خارقِ عادت قرار دیتے ہیں۔"

آگے پھر متن میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مگر جس ملک کے لئے مَیں نے طاعون کی خبر دی اور

شدید زلزلوں کی اطلاع دی ہے۔ وہ اس ملک کی حالت کے لحاظ سے درحقیقت عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں کیونکہ اگر اس ملک کی صدہا سال کی تاریخ دیکھی جائے تب بھی ثابت نہیں ہوتا کہ کبھی اس ملک میں طاعون پڑی ہے چہ جائیکہ ایسی طاعون جس میں تھوڑے ہی عرصہ میں لاکھوں انسانوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ چنانچہ طاعون کی میری پیشگوئی کے الفاظ یہ ہیں کہ ملک کا کوئی حصّہ طاعون سے خالی نہیں رہے گا۔ اور سخت تباہی آئے گی۔ اور وہ تباہی زمانۂ دراز تک رہے گی۔ اب کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ جیسا کہ اب پیشگوئی کے مطابق یہ سخت تباہیاں طاعون سے ظہور میں آئیں پہلے اس ملک میں کبھی ظہور میں آیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ رہا زلزلہ وہ بھی میری طرف سے کوئی معمولی پیشگوئی نہیں تھی بلکہ پیشگوئی میں یہ الفاظ تھے کہ ایک حصّہ ملک کا اس سے تباہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ وہ تباہی جو اس زلزلہ سے کانگڑہ اور بھاگسو خاص جوالہ مکھی پر آئی دو ہزار برس تک اس کی نظیر نہیں ملتی کہ کبھی زلزلہ سے ایسا نقصان ہوا ہے۔ چنانچہ انگریز محققوں نے بھی یہی گواہی دی ہے پس اس صورت میں میرے پر اعتراض کرنا

محض جلد بازی ہے۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۹-۱۶۰)

پس جہاں تک حضرت مسیحؑ کی کال اور مری اور جنگوں کی پیشگوئیوں کا فلسطین کے ملک سے تعلق ہے۔ جیسا کہ عیسائی سمجھتے ہیں۔ ان پیشگوئیوں کو کوئی خاص اہمیّت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن عیسائی نکتہ نگاہ سے قطع نظر اگر ان پیشگوئیوں کا تعلق مسیح کی آمد ثانی کے بعد ملک ہندوستان سے سمجھا جائے۔ تو پھر یہ پیشگوئیاں اہمیّت حاصل کر لیتی ہیں اور بانی سلسلہ احمدیہؑ کے دعویٰ مسیحیت کی مؤید بن جاتی ہیں اسی لئے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ مسیحؑ کی طاعون سے متعلقہ پیشگوئی کو اپنی کتاب کشتیٔ نوح میں ان الفاظ میں اپنی تائید میں پیش کیا ہے:۔

"اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآن شریف میں بلکہ تورات کے بعض صحیفوں میں بھی یہ خبر موجود ہے کہ مسیح موعود کے وقت میں طاعون پڑے گی بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی انجیل میں خبر دی ہے۔" (کشتی نوح صفحہ ۵ طبع اوّل)

پس تحقیق عارفانہ کے مصنف کا صفحہ ۵۲۶ پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طاعون کے بارہ میں پیشگوئی کی تائید میں انجیل متی ۲۴/۱ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بیان سے وبا پڑنے کی پیشگوئی کو پیش کرنا مسیح موعود علیہ السلام کے مذکورہ بالا بیان کے مطابق ہے۔ لہٰذا مسیح موعود علیہ السلام

اور تحقیق عارفانہ کے مصنف کے بیان میں کوئی تناقض نہیں۔

آیت مطلوبہ چونکہ تجلیات الٰہیہ کے حاشیہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لکھا ہے کہ:۔

"خدا اس سے رحیم تر ہے کہ دو قسم کے شدید عذاب ایک ہی وقت میں کسی قوم پر نازل کرے۔ یعنی ایک قہری نشانوں کا عذاب اور دوسرے انسانوں کے ذریعہ تلوار کا عذاب اور خدا تعالے نے قرآن شریف میں صاف فرما دیا ہے کہ یہ دو قسم کے عذاب ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتے"

(تجلیات الٰہیہ حاشیہ روحانی خزائن ۔۔۔)

اس پر آپ کا سوال یہ ہے:۔

"قرآن مجید کی وہ آیت لکھیں ...... کہ یہ دو قسم کے عذاب ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتے"

جناب من! آپ کی مطلوبہ آیت سورۃ انعام کی آیت ۶۵ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعًا و یذیق بعضکم بأس بعض۔ یعنی کہدو کہ خدا قادر ہے کہ عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے نازل کرے یا تمہیں مختلف گروہ بنا کر آپس میں ایک

دوسرے سے لڑا دے۔"

اُو کا لفظ جو کلمہ تردید ہے اس جگہ ظاہر کر رہا ہے کہ جنگ کا عذاب اور آفات ارضیہ یا سماویہ اکٹھے نہیں آئیں گے۔ انجیل کی پیشگوئی میں بھی مسیح کے زمانہ میں جو جنگوں اور آفات ارضیہ یعنی زلازل اور قحط اور مری وغیرہ کا ذکر ہے ان کا بھی اکٹھا آجانا مراد نہیں۔ چنانچہ یہ اکٹھے آئے بھی نہیں جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے۔

خونی مہدی اور لڑائیاں بے شک حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہی لکھا ہے کہ:-

"میرا عقیدہ کہ خونی مہدی دنیا میں آنے والا نہیں۔ تمام مسلمانوں سے الگ عقیدہ ہے۔" (کشف الغطاء ص۱۲)

نیز یہ بھی لکھا ہے:-

"مَیں کسی ایسے مسیح اور مہدی کو نہیں مانتا جو کافروں سے لڑائیاں لڑے گا۔" (کشف الغطاء طبع اول ص۳ ب)

اس جگہ دوسری عبارت میں بھی لڑائیاں لڑنے والے مسیح اور مہدی سے مراد خونی مہدی اور مسیح ہی ہے۔ مگر لڑائیوں سے مراد جارحانہ لڑائیاں ہیں اور خونی مہدی کے تصور میں یہ بات مسلمانوں کے عقیدہ میں سمائی ہوئی ہے۔ کہ وہ اشاعت اسلام کے لئے لڑائیاں لڑے گا۔ یعنی جو اسلام قبول نہیں کرے گا اسے قتل کر دے گا۔ اور اس جاہلانہ عقیدہ کو مسلمان مولوی آج بھی جائز سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ احمدیوں کے خلاف انکے

متشددانہ رویہ سے ظاہر ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں بھی اور ۱۹۷۴ء میں
بھی ان کا یہی رویہ رہا ہے۔ احمدیوں کو واجب القتل جاننا ان کے
فتووں اور عمل سے ظاہر ہے۔ ان کے نزدیک احمدیوں کا مال لوٹ
لینا جائز ہے۔ اور ہر قسم کا تشدد روا ہے۔ اور خونی مہدی کے لئے
یہ ایسی ہی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ اسی قسم کی جارحانہ لڑائیاں
لڑے گا۔ اور کافروں سے اسلام کے سوا کچھ قبول نہیں کرے گا۔
اس ظالمانہ عقیدہ کا قرآن کریم ہرگز مؤید نہیں یہ عقیدہ لا اکراہ
فی الدین کی آیت کے قطعاً خلاف ہے، پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام
کی کشف الغطاء کی دونوں عبارتوں سے یہی مراد ہے کہ آپ کسی ایسے
خونی مہدی کے آنے کو نہیں مانتے جو کافروں کے قتل سے دین کو بڑھائیگا
آپ ایک نظم میں فرماتے ہیں:۔

"ایسا گماں کہ مہدی خونی بھی آئیگا — اور کافروں کے قتل سے دیں کو بڑھائیگا
اے دوستو! یہ باتیں سراسر دروغ ہیں — بہتاں ہیں بے ثبوت ہیں اور بے فروغ ہیں"

لیکن افسوس کہ بدقسمتی سے مسلمان علماء ایسی جارحانہ کارروائیوں
کو بھی اپنی کج فہمی سے اسلامی جہاد قرار دیتے ہیں، حضرت اقدس
علیہ السلام نے اسے اسلامی جہاد نہیں جانا بلکہ اسلام کے چہرہ کو
داغدار کر دینے والا فعل جانا ہے۔ آپ کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ
بصورت قتال از روئے تعلیم قرآنی صرف مدافعانہ ہی جائز ہے لیکن
صحیح بخاری کی حدیث یضع الحرب کے مطابق آپ نے اسے ملتوی قرار

دیا ہے کیونکہ اس کی شرائط موجود نہ تھیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

اے دوستو! جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آچکا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے

اس اختتام کی تشریح میں آگے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ:۔

فرما چکے ہیں سید کونین مصطفےؐ عیسٰی مسیح جنگوں کا کردیگا التواء
جب آئیگا تو صلح کو وہ ساتھ لائیگا جنگوں کے سلسلہ کو وہ یکسر مٹائیگا۔

پس تمام جنگوں کے خاتمہ کی تشریح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے "جنگوں کے التواء" کے لفظ سے فرما دی ہے۔

اشتہار واجب الاظہار مورخہ ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء میں حضور کا اقتباس جو آپ نے اعتراض کی خاطر پیش کیا ہے اور جس کے الفاظ یہ ہیں:

"لیکن یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ آخری زمانہ میں پھر اسم احمد ظہور کرے گا اور ایسا شخص ظاہر ہوگا جس کے ذریعہ احمدی صفات ظہور میں آئیں گی اور تمام لڑائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

مگر التواء والی عبارتوں کا تمام لڑائیوں کے خاتمہ والی اس عبارت سے کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے۔ کیونکہ حضورؑ نے خود جنگوں کے اختتام کی تشریح میں التواء کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ پس خاتمہ سے مراد عارضی خاتمہ ہے۔

آپ نے اشتہار "دعوت" مورخہ ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء سے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:-

"مَیں یہ پیشگوئی کرتا ہوں کہ میرے بعد قیامت تک کوئی ایسا
مہدی نہیں آئے گا جو جنگ اور خونریزی سے دنیا میں ہنگامہ
برپا کرے اور وہ خدا کی طرف سے ہو۔"

اس تحریر میں بھی جنگ اور خونریزی سے دنیا میں ہنگامہ برپا کرنے کے الفاظ میں مدافعانہ لڑائی کی نفی مراد نہیں۔ کیونکہ ہنگامہ برپا کرنے والی جنگ جارحانہ ہی ہو سکتی ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک آئندہ کوئی ایسا مثیل مسیح نہیں آئیگا جو جارحانہ اقدامِ جنگ کرے۔ اگر کوئی مثیل مسیح کے دعویٰ کے ساتھ ایسا کرے گا تو وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوگا۔ پس آئندہ مثیل مسیح کی آمد کے امکان والی عبارتیں بھی درست ہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ کوئی ہنگامہ برپا کرنے والا سچا مثیل مسیح نہیں آئے گا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک جہاد صرف ملتوی ہے قیامت تک کے لئے منسوخ نہیں ہے۔ بے شک حضور نے اشتہار واجب الاظہار" ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء میں لکھا ہے:-

"اس فرقہ میں تلوار کا جہاد بالکل نہیں نہ اس کا انتظار ہے۔"

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی زمانہ میں اگر کفار جارحانہ لڑائی کریں تو مدافعت نہیں ہو سکتی۔ انتظار نہ کرنا امر دیگر ہے۔ اور دشمن کی طرف سے لڑائی مسلط ہو جانے کی صورت میں مدافعت کرنا امر دیگر۔ پس

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تمام ایسی عبارتوں میں کوئی تناقض نہیں اور تناقض کا نتیجہ اخذ کرنا سراسر معترض کی صریح غلطی ہے۔

پس جماعت احمدیہ ہرگز اس بات کو جائز نہیں سمجھتی کہ "اگر کوئی غیر مسلم قوم ایسے مسلمانوں کے ملک پر جو مرزا صاحب کی باتوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں اس لئے حملہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کو قتل کیا جائے۔ ان پر ظلم و ستم کیا جائے اور ان کی حکومت ختم کر کے ان کو محکوم بنا لیا جائے تو اس ملک کے مسلمانوں کے لئے فرض ہے، کہ وہ مقابلہ کے لئے تلوار نہ اٹھائیں۔"

بلکہ جماعت احمدیہ کے نزدیک ایسے موقعہ پر مدافعت کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ عملی طور پر کشمیر کی جنگ میں جو ہندوستان نے مسلط کی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اور حکومت پاکستان سے پورا تعاون کرتے ہوئے جماعت احمدیہ نے بھرپور مدافعت کی کوشش کی اور احمدی نوجوانوں کی ایک بٹالین فرقان فورس کے نام سے میدانِ کارزار میں بھیجی۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عبارتوں سے آپ اعتراض کی خاطر جو نتیجہ نکالتے ہیں۔ وہ بالکل غلط ہے۔ اور جماعت احمدیہ کا فہم اور عمل اس کی تردید کر رہا ہے۔ لہٰذا آئندہ کسی مثیل مسیح کو مدافعانہ لڑائی لڑنی پڑے تو مسیح موعود علیہ السلام کی کسی تحریر کی رو سے یہ ممنوع نہیں ہے۔

کیا حضرت عیسیٰؑ جہاد کے لئے مامور نہیں تھے؟ کے عنوان کے تحت آپ نے قرآن مجید کی آیت ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین

انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون وعدًا علیہ حقًا فی التوراۃ و الانجیل و القرآن سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی جہاد بالسیف کے لئے مامور تھے۔ آپ کا یہ استدلال اس لئے نادرست ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے اپنی حین حیات میں جہاد کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اگر وہ جہاد بالسیف کے لئے بالذات امور ہوتے تو پھر یقینًا انہیں جہاد بالسیف کی ضرورت بھی پیش آتی اور انہوں نے کبھی جہاد بالسیف کیا بھی ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسی نوبت ہی نہیں آئی اس لئے مسیح موعود علیہ السلام کا استدلال درست ہے کہ وہ جہاد بالسیف کے لئے مامور نہ تھے۔ آیت ہذا میں انبیاء کا ذکر نہیں بلکہ مؤمنین کا ذکر ہے۔ اور مؤمنین کو خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان کبھی دفاعی جنگ کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس لئے توراۃ انجیل اور قرآن میں دفاعی ضرورت کے لئے جنگ کی ضرورت پیش آنے پر مومنوں پر جنگ کا فرض عائد ہوسکتا تھا۔ ایسے وقت اگر وہ اپنے اموال اور جانیں خرچ نہ کریں۔ تو یقینًا وہ جنت کے حقدار نہیں رہتے لیکن حضرت مسیح اور ان کے وہ ساتھی اور حواری جن کو دفاعی جنگ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یقینًا وہ جنگ کے بغیر بھی جنتی تھے۔

قرآن مجید سے ظاہر ہے کہ جہاد کا حکم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کو بھی دیا گیا۔ اور مومنوں کو بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خاص حکم جہاد دی جانے والی آیت میں اللہ تعالےٰ نے نبی کے ذریعہ مومنوں کو بھی ترغیب دلائی۔ چنانچہ فرمایا۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَأْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (نساء آیت ۸۳)

اے نبی تو اللہ کی راہ میں جنگ کر۔ تیرے نفس کے سوا اور کوئی اصل مکلّف نہیں اور مومنوں کو جنگ کے لئے ابھار۔ قریب ہے کہ اللہ کافروں کی جنگ کو روک دے۔"

اس آیت میں جنگ کے لئے اصل مکلّف تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا گیا ہے۔ اور آپ کو یہ حکم بھی ہے۔ کہ مومنوں کو جنگ کے لئے ابھاریں۔ اور بتایا ہے اس طرح قریب ہے کہ اللہ اس لڑائی کو روک دے جو کافروں نے شروع کی ہے۔ پس کافروں کی طرف سے جنگ شروع ہونے پر خدا تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بالذات جنگ کے لئے مکلّف قرار دیا ہے۔ اور مومنوں کو بالواسطہ مکلّف کیا گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے کہ ان کو جنگ کے لئے مکلّف کیا گیا ہو۔ یہ ہمارا آپ کو چیلنج ہے آپ ہرگز کوئی ایسی آیت پیش نہیں کرسکتے۔ پس

اس جگہ آپ کی ساری بحث سے یاد رہوا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بیان سچا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنگ کے لئے مامور نہ تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی جنگ کے لئے مامور تو ہوئے مگر مدافعانہ جنگ کے لئے نہ کہ جارحانہ اقدام کے لئے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ازالہ اوہام میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ کسی خونی مہدی کا امکان ہے اور نہ ہی ہمارے علم میں خلیفۃ المسیح نے کسی جگہ یہ بات لکھی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجیل کی تعلیم میں جنگ کے لئے مامور یعنی مکلّف کئے گئے ہوتے تو پھر بالضرور انہیں جنگ کرنا پڑتی۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں جب جنگ کے لئے خدا کی طرف سے مکلّف کیا گیا۔ تو آپ کو خود بنفسِ نفیس بھی جنگ میں حصہ لینا پڑا۔

آیت زیر بحث انّ اللہ اشتری من المؤمنین کے متعلق یہ بحث ہم نے آپ کی تفسیر کے پیش نظر کی ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں المؤمنین سے مراد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ہیں۔ اور یہ آیت مدنی ہے۔ یعنی اس وقت کی ہے جب کافروں کی طرف سے لڑائی کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اور مومنین ان سے لڑ رہے تھے دشمنوں کو قتل بھی کر رہے تھے۔ اور خود بھی قتل ہو رہے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر جہاد بالسیف کرنے والوں کے متعلق خدا تعالےٰ نے توریت و انجیل اور قرآن میں جنّت

پانے کے وعدہ کا ذکر کیا ہے یہی مفہوم وعدًا علیہ حقًا فی التوراۃ والانجیل والقرآن کا ہے یقاتلون فعل مضارع اس جگہ حال کے معنوں میں ہے لہذا یہ لفظ ان مومنوں کو بتا رہا ہے جو اس آیت کے نزول کے زمانہ میں کافروں سے دفاعی جنگ لڑ رہے تھے اس جگہ موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام پر زمانہ ماضی میں ایمان لانے والے لوگوں کا کوئی ذکر نہیں۔ فافہم وتدبر۔

مناسب ہے کہ تناقض کی تعریف اس جگہ آپ کو سمجھا دی جائے دو متناقض امر ایک دوسرے کی نقیض ہوتے ہیں اور نقیض ہر شے کی اس کا رفع ہوتا ہے۔ جیسے مومن کی نقیض ہے "نہ مومن"۔ قلم کی نقیض ہے قلم نہیں۔ کاغذ کی نقیض ہے کاغذ نہیں۔ ان مثالوں میں جو متناقضین کی ہیں ہمیشہ ایک وجودی شئے میں ایک ہی بات پائی جائے گی۔ یا وہ مومن ہوگا یا نہیں۔ یا وہ قلم ہوگا یا نہیں۔ یا وہ کاغذ ہوگا یا نہیں یہ حقیقی تناقض کی صورت ہے اور اس میں آٹھ وحدتوں کا پایا جانا ضروری ہے جنہیں ایک عالم نے دو شعروں میں بیان کر دیا ہے۔ جو یہ ہیں :-

در تناقض ہشت وحدت شرط داں
وحدت موضوع و محمول و مکاں
وحدت شرط و اضافت جزو کل
قوت و فعل است در آخر زماں

پس ان آٹھ وحدتوں میں سے دو امروں میں اثبات و نفی کی موجودگی میں کسی وحدت میں بھی اختلاف ہو تو وہاں تناقض قرار دینا درست نہیں ہوگا۔

دیکھئے ہر مومن نبی اور رسول نہیں ہوتا لیکن ہر نبی اور رسول مومن ضرور ہوتا ہے۔ اب دونوں میں جو اختلاف ہے وہ تناقض کی حد تک نہیں اس لئے ایسا اختلاف جائز ہے۔ مومن اور نبی و رسول میں عموم خصوص مطلق کا تباین و تقابل پایا جا رہا ہے۔ یعنی مومن کا مفہوم عام ہے اور نبی اور رسول اس کے مقابل خاص مفہوم رکھتا ہے۔ عام کی نفی کر دی جائے تو خاص کی نفی از خود ہو جائے گی۔ لیکن خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہوگی۔ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نبی و رسول تو نہ ہو لیکن مومن ہو۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک شخص مومن نہ ہو اور خدا کا نبی اور رسول ہو۔ اگر دو امروں میں تقابلِ تضاد پایا جائے۔ جیسے زرد و سیاہ میں تضاد ہے نہ کہ تناقض تو ان دونوں کا رفع ہو سکتا ہے یعنی نفی ہو سکتی ہے جبکہ ایک شئے نہ زرد ہو نہ سیاہ بلکہ سُرخ ہو۔ لیکن تناقض میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تناقض کی صورت میں ہمیشہ دونوں میں سے ایک ہی شئے پائی جائے گی۔ اور دوسری کی نفی ہو گی۔ پس دنیا کی ہر شئے کی جب آپ "نہیں" کے لفظ سے نفی کر دیں تو نفیٔ شئے اس مثبت شئے کی نقیض ہو گی لیکن اگر اثبات اور نفی کی جہات کہیں الگ الگ ہو جائیں تو

پھران دونوں میں تناقض حقیقی نہیں پایا جائے گا۔ اگر پھر بھی ان دونوں میں اختلاف رہے تو عموم خصوص مطلق کی صورت میں ہوگا۔ یا عموم خصوص من وجہ کی صورت میں ہوگا۔ اور یہ دونوں قسم کے اختلاف جائز ہیں۔ عموم خصوص من وجہ کی صورت میں ایک شئ ایک وجہ سے پائی جاتی ہے اور دوسری وجہ سے نہیں پائی جاتی۔ جیسے مثلاً جنگ اور اس کی حلّ و حرمت کی صورت اس طرح ہو کہ جنگ حرام بھی ہے اور حلال اور ضروری بھی۔ مگر حرام ہے جب اس کی شرائط موجود نہ ہوں۔ اور حلال یا ضروری ہو جاتی ہے۔ جب اس کی شرائط موجود ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی شرائط موجود نہ تھیں اس لئے یہ دونوں جنگ کے لئے مکلّف و مامور نہ تھے۔ رسول کریمؐ کی مکّی زندگی میں اس کی شرائط موجود نہ تھیں اس لئے خدا تعالےٰ نے مکّی زندگی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جنگ کے لئے مکلّف نہیں کیا لیکن مدنی زندگی میں جب جنگ کی شرائط پائی گئیں تو آپ کو مکلّف کر دیا گیا۔ پس گو جنگ کے مسئلہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کردار میں مکّی زندگی اور مدنی زندگی میں تخالف موجود ہے لیکن اس تخالف کو تناقض کا نام دے کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کا کردار باہم نقیض تھا۔ اور آپ اجتماع نقیضین کے حامل تھے ایسا اعتراض کوئی احمق ہی کر سکتا ہے پس احمدی جنگ کے مکلّف نہیں جب تک اس کے لئے شرائط

موجود نہ ہوں۔ اور وہ جنگ کے لئے مکلّف ہیں جب اس کی شرائط پائی جائیں۔ ہمارے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی کا کردار بھی اس سلسلہ میں اسوہ ہے اور مدنی زندگی کا کردار بھی۔ ہاں مسیح موعود علیہ السلام کی جماعت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح جنگ میں ابتداء نہیں کر سکتی۔ اور اس کے ذریعہ جب غلبہ اسلام ہو جائے گا تو تمام جنگوں کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

پس جنگ ملتوی ہو گی جب اس کی شرائط موجود نہ ہوں۔ اور جنگ واجب ہو گی جب اس کی شرائط پائی جائیں۔

تابع نبی اور امّتی نبی

حضرت مسیح موعودؑ اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے کلام میں جو بظاہر تخالف نظر آتا ہے اس کی حقیقت اپنے سابقہ مضمون میں ہم تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔ اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں اس جگہ صرف یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے کلام کے مفہوم کو سیاق و سباق کے لحاظ سے متعیّن کرنا ضروری ہے۔ اور بحث میں ان اصطلاحات کو مدّنظر رکھا جائیگا جو مسیح موعود علیہ السلام نے قائم کی ہیں۔ مسیح موعود علیہ السلام کی قائم کردہ اصطلاح کی روشنی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء مستقل نبی تھے۔ خواہ وہ تشریعی تھے خواہ غیر تشریعی نبی تھے جو کسی تشریعی نبی کی شریعت کے تابع تھے۔ مگر ان غیر تشریعی

نبیوں میں کوئی بھی باوجود تشریعی نبی کے تابع ہونے کے کبھی امتی نبی نہیں کہلایا۔ کیونکہ امتی کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک کمال اس کا اپنے متبوع نبی کی پیروی اور افاضہ روحانیہ سے مستفاد ہو۔ ان معنوں میں حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کے امتی نبی نہ تھے کیونکہ حضرت ہارونؑ کو نبوت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی سے نہیں ملی تھی۔ ہاں موسیٰؑ نے نبوت ملنے پر ان کے لئے یہ دعا کی تھی۔ "اَشْرِکْہُ فِیْ اَمْرِیْ" کہ اے خدا! ہارون کو میری نبوت میں شریک کرے۔ اور خدا نے آپ کی یہ دعا قبول کرتے ہوئے فرمایا۔ اوتیت سؤلک۔ کہ تیرا سوال پورا کر دیا گیا ہے۔

پس ہارون گو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریک فی النبوۃ بطور تابع تھے لیکن مستقل نبی تھے اور براہ راست نبی بنائے گئے تھے۔ نہ موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کے بعد۔ اس لئے وہ ان معنوں میں موسیٰ علیہ السلام کے امتی نہیں جو معنی امتی کے حضرت بانئ سلسلہ احمدیہ نے بیان فرمائے ہیں لہٰذا مکرمی جمیل احمد صاحب! آپ کے مفروضہ میں اگر حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے امتی تھے تو حضرت مرزا صاحب مسیح موعود علیہ السلام کے کلام اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے کلام کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیش کردہ اصطلاحات کی روشنی میں سمجھنا پڑے گا۔ نہ اپنے کسی ایسے مفروضہ کے لحاظ سے جو ان دونوں کو مسلم نہیں۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی امتی کی اصطلاح کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد نہیں آ سکتے۔

کیونکہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل امتی نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے نبوت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے حاصل نہیں کی۔ بلکہ وہ براہ راست بغیر وسیلہ پیروی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نبی بنائے گئے تھے۔ لہذا چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل امتی نہیں ہو سکتے اس لئے خاتم النّبیّین کے بعد ان کا اصالتًا ظہور آپ کی ختم نبوت کے منافی ہے۔ ہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لحاظ سے آیت میثاق النّبیّین کے لفظ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ کے مطابق تو سب نبی ایک حد تک امتی کہلا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ انہیں نبوت دوسرے سب انبیاء سابقین کی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے وسیلہ سے نہیں ملی تھی اس لئے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل امتی نہیں کہلا سکتے۔

اس جگہ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ وسلم اصالتًا آنے کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے پر امتی نبی بنائے جائینگے تو امتی نبی کا امکان بعد از خاتم النّبیّین جائز قرار پایا اور ختم نبوت کے منافی نہ رہا۔ لہذا کسی امتی کے لئے ایسا نبی بن جانا بھی ختم نبوت کے منافی نہ ہوگا۔ البتہ پھر یہ شبہ پیدا ہو جائے گا کہ جو پہلے ہی نبی تھا اس کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے بھی نبی بن جانے میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا کمال ہوا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی کیمیا گر سونے پر کوئی بوٹی ڈالکر اسے آگ میں پگھلا کر یہ کہدے

لوہی سونا بن گیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسلوب النبوۃ ہو کر آنا
اور ان کا بعد از آمد ثانی نبی بننا کسی عالم دین کو مسلّم نہیں۔ فتدبّر۔

بالفرض اگر صرف تغیر فی النبوۃ مانیں یعنی یہ مانیں کہ ان کی نبوّت
مستقلہ امتی نبوّت میں تبدیل ہوجائے گی۔ تو اس تغیّر سے نئی
قسم کی نبوّت کا حدوث ہوگا۔ اور ایسی نبوّت بھی ختم نبوّت کے
منافی نہ ہوگی تو ایک امتی کو ایسی نبوّت ملنا ممکن ہوگا۔ اور اس
امتی کی نبوت ختم نبوت کے منافی نہ ہوگی۔

لیکن اس تغیّر فی النبوۃ کے مفروضہ کی صورت میں ایک مستقل
نبی کی جو امتی نہ ہوگا نزول کے وقت مستقل نبی کی آمد ہی ماننا پڑے گی
اور یہ امر بوجہ ختم نبوت کے منافی ہونے کے محال ہوگا۔ لہذا
حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا اپنی نبوت کے ساتھ نازل ہونے کے بعد
پیروی کر کے امتی نبوت میں تغیّر پانا ایک محال امر کو مستلزم ہونے
کی وجہ سے (یعنی ختم نبوت سے منافی ہونے کی وجہ سے) باطل قرار
دینا پڑتا ہے۔ پس حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا اصالتاً نزول بہر حال
ختم نبوت کے منافی ہے۔

معیار لَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ

مکرمی آپ نے لو تقوّل علینا بعض الاقاویل لاخذنا منه
بالیمین ثمّ لقطعنا منه الوتین کو اپنی جرح اور سوالات سے

دراصل مشکوک بنا دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ آیت کسی اور مدعی وحی والہام کی صداقت کا معیار نہیں بن سکتی۔ اور تقوّل اور افترا علی اللہ کرنے والے کی اخذ بالیمین اور قطع وتین ضروری نہیں تو پھر یہی بات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال وحی میں صادق من اللہ ہونے کی دلیل کیسے بن سکتی ہے۔ پس صحیح بات یہ ہے کہ جو نبی قطع وتین سے بچ گئے۔ ان کا صادق ہونا تو اس سے روز روشن کی طرح ثابت ماننا پڑے گا تبھی اس دلیل سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو شاعر یا کاہن کہدینے والے فائدہ اٹھا کر آپ کو صادق مان سکتے ہیں۔

بالفرض جو نبی قتل ہو گیا اس کی صداقت اگر دوسرے قرآنی معیاروں سے ثابت ہو اور اس کے بعد ایک سچا نبی جو قطع وتین سے بچا پایا گیا اسکے مامور من اللہ ہونے کی تصدیق کر دے تو پھر اس نبی کا قتل ہو جانا شہادت کی موت سمجھا جائیگا خدا نے اخذ بالیمین کے بعد قطع وتین کا ذکر فرمایا ہے قطع وتین حقیقۃً تو قتل کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ پس اگر کسی نبی کی برکات ظاہر و باہر ہوں تو اس کا قتل کیا جانا اس کے کذب کی دلیل نہ ہو گی۔

دراصل تقوّل علی اللہ مثل زہر کے ہے جو یہ زہر کھائیگا وہ ضرور ہلاک ہوگا اور جو دعویٰ وحی کے بعد بچ جائے اس کے متعلق ثابت ہو جائیگا کہ وہ متقوّل علی اللہ نہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ کی طرف جھوٹا قول منسوب کرنے والا نہیں۔ اس آیت کی رُو سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح تیئیس سال زندگی پانا بہر حال مدعی وحی کی صداقت کی دلیل ہو گی کیونکہ

اتنی لمبی عمر دعویٔ وحی کے بعد پانے کو اللہ تعالےٰ آپؐ کی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ دلیل کا محل استعمال گو خاص ہو لیکن اس دلیل کی قوت کو بہر حال عام ماننا پڑے گا۔ تبھی وہ محل خاص یا بالفاظِ دیگر مدلول خاص کے لئے دلیل بن سکتی ہے۔ قطع وتین انسانی ہاتھوں سے ہو تب بھی وہ خدا کی طرف سے سمجھی جائیگی۔ پس تیئیس سالہ مہلت اس آیت کی رو سے بطور معیار قرار دینا حضرت مرزا صاحب مسیح موعود علیہ السلام کی من گھڑت بات نہیں بلکہ علماءِ امّت اور فقہاءِ ملت کی مسلّمہ بات ہے۔

شرح عقائد نسفی ص۱۰۱ پر لکھا ہے:۔

فَاِنَّ الْعَقْلَ یَجْزِمُ بامتناع اجتماع ھذہ الامور فی غیر الانبیاء فی حق مَنْ یَعْلَمُ انّہٗ یفتری علیہ ثمّ یُمْہِلُہٗ ثلاثًا وعشرین سنۃ۔ یعنی عقل اس بات کو ناممکن قرار دیتی ہے کہ یہ باتیں ایک غیر نبی میں جمع ہو جائیں اس شخص کے حق میں جس کے متعلق خدا جانتا ہے کہ وہ خدا پر افتراء کرنیوالا ہے پھر اسکو ۲۳ سال کی مہلت دے۔

تفسیر روح البیان میں اس آیت کے متعلق لکھا ہے کہ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ اگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کوئی بات کہتے یا ایک حرف زیادہ یا کم کرکے اس وحی پر جو آپ پر نازل ہوئی لَعَاقَبَہُ اللّٰہُ وَھُوَ اکرم الناس الی اللہ فما ظنک لغیرہٖ۔ تو خدا آپؐ کو سزا دیتا۔ پھر اگر

کوئی دوسرا اس پر افترا کرے تو اس کے متعلق تیرا کیا خیال ہے (یعنی وہ بھی سزا سے بچ نہیں سکتا) (تفسیر روح البیان جلد ۴ صلا ۴۶۲)

آپ نے لکھا ہے:-

"اس بات کا ثبوت کہ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ کہ افتراء کی صورت میں ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے ہیں اور اس کی رگِ گردن کاٹ دیتے ہیں۔ اس مفہوم کو بیان کرنے کے لئے کہے ہیں کہ ایک سچا نبی اللہ تعالیٰ پر افتراء نہیں کر سکتا۔ یہ ہے کہ کبھی بھی کسی سچے نبی نے یعنی اس نبی نے جو شیطان کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اللہ تعالیٰ پر افتراء نہیں کیا۔"

یہ بات تو آپ کی صحیح ہے یہی ثابت کرنا مقصود ہے کہ سچا نبی افتراء علی اللہ نہیں کیا کرتا۔ مگر دلیل تو یہ دی ہے کہ اگر وہ افتراء کرتا تو ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اس کی رگِ گردن کاٹ دیتے پس جس کی رگِ گردن کاٹا جانے سے بچا لی گئی اس کا صادق و مصدوق ہونا تو اس آیت سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گا۔

چونکہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کی رگِ گردن وحی کے دعویٰ کے بعد قطع ہونے سے بچائی گئی۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ وہ سچے امتی نبی ہیں۔ مفتری علی اللہ نہیں۔ اگر تیئیس سال سے زیادہ وحی و الہام کے دعویٰ کے باوجود انہیں مفتری علی اللہ قرار دیا جائے تو پھر ایسا کرنے والا اس دلیل کو جو آیت لو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منه باليمين ثم لقطعنا منه الوتين کے الفاظ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

کی صداقت ثابت کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے مشکوک کرنے کا موجب ہوگا

پس مکرمی جمیل احمد صاحب! اس بحث میں آپ کی کوشش محض تشکیک آوری ہے کوئی تحقیق نہیں۔ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ کی رو سے متقوّل علی اللہ اپنے دعویٰ وحی و الہام کے بعد تیئیس سال کی لمبی مہلت نہیں پا سکتا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے بعد آپکی عمر نبوت سے یہی استدلال ہو سکتا ہے۔ آپ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اتنی عمر پانا بھی مخالفین اسلام کے لئے حجت قرار نہیں دے سکیں گے۔ کیونکہ آپ حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ کے سچا مسیح موعود ہونے میں اس استدلال کے درست ہونے سے منکر ہیں۔

بے شک حضرت مسیح موعود علیہ السلام براہین احمدیہ کے زمانہ میں یعنی دعویٰ مسیح موعود سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے قائل تھے لیکن بعد ازاں آپنے خدا تعالیٰ کی اس وحی کی روشنی میں کہ مسیح ابن مریم رسول اللہ فوت ہو گیا ہے اور اس کے رنگ میں ہو کر وعدہ کے موافق تو آیا ہے۔ (ازالہ اوہام ص۵۶۱) اس الہام کے نزول پر آپنے اسے جیسا کہ حقیقۃ الوحی میں لکھا۔ قرآن و حدیث پر پیش کیا تو قرآن کریم کی قطعیۃ الدلالت آیات اور نصوص صریحہ حدیثیہ سے بھی آپ پر یہ بات کھل گئی کہ واقعی مسیح ابن مریم وفات پا گئے ہیں۔ مگر اپنے اس الہام سے پہلے آپ حیات مسیح کے رسمی عقیدہ کے ہی قائل تھے لہذا ازالہ اوہام میں آپنے درست فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا سے الہام پاتے ہیں وہ بغیر بلائے گئے

نہیں بولتے اور بغیر سمجھائے نہیں سمجھتے اور بغیر فرمانے کے کوئی دعویٰ نہیں کرتے اور اپنی طرف سے کسی قسم کی دلیری نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر جب تک خدا تعالےٰ کی طرف سے بعض عبادات ادا کرنے کے بارہ میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی۔ اہل کتاب کی سنن دیکھیہ پر قدم مارنا بہتر جانتے تھے۔ اور بروقت نزول وحی اور دریافت اصل حقیقت کے اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ اسی لحاظ سے اپنی طرف سے حضرت مسیح ابن مریم کی نسبت براہین احمدیہ میں کوئی بحث نہیں کی گئی تھی۔ (ازالہ اوہام صـ۱۹۸ طبع اول) مگر آپ کے نزدیک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس وضاحت میں کئی غلطیاں ہیں۔ پہلی غلطی آپ نے یہ بتائی ہے کہ

"مرزا صاحب کے زمانہ میں قرآن کریم۔ احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ کرام موجود تھے۔ لیکن پھر بھی مرزا صاحب نے صرف بیہودہ اور بے اصل اور متناقض روایات کی پیروی کو لازم سمجھا۔"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے مسیح ابن مریم کی وفات کے متعلق صریح الہام ہونے سے پہلے بے شک آپ مسیح کی آمد ثانی کے رسمی عقیدہ پر تھے۔ اور اس وقت آپ نے نہ روایات کی چھان بین کی ہوئی تھی نہ قرآنی آیات میں ایسے تدبر سے کام لیا تھا۔ جس تدبر سے کام آپ نے وفات مسیح کے متعلق الہام ہونے پر لیا۔ رسمی عقیدہ پر قائم رہنے کی غلطی کو آپ نے خود تسلیم کیا ہے مگر اس غلطی سے یہ تو واضح ہے

کہ آپ کوئی منصوبہ باز نہیں تھے۔ کیونکہ براہین احمدیہ کے زمانہ میں ہی آپ کو الہام میں عیسیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ آپ کے متعلق خدائی وعدہ تھا لیکن آپ نے اس کی بناء پر مسیح موعود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ رسمی عقیدہ کی بناء پر براہین احمدیہ میں مسیح ابن مریم کی آمد کا عقیدہ لکھ دیا۔

مکرمی! دوسری غلطی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے :- کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر افتراء کیا۔ گویا آپ اہلِ کتاب کی ایسی عبادات پر بھی عمل کرتے رہے جن کو بعد میں گمراہی اور خدا تعالےٰ پر افتراء قرار دیا گیا۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ یہ الفاظ جو آپ نے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی طرف منسوب کئے ہیں "جن کو بعد میں گمراہی اور خدا تعالےٰ پر افتراء قرار دیا گیا" یہ خود آپ کا افتراء ہے۔ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام نے یہ بات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ہرگز منسوب نہیں کی۔ رہا یہ امر کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وحی نازل ہونے سے پہلے اہل کتاب کے طریق عمل فرماتے تھے سو یہ بات حدیث سے ثابت ہے۔ جس میں بیان ہوا ہے کہ :-

کان یحب موافقۃ اھل الکتاب فیما لم یؤمر بہ (صحیح بخاری جلد ۲)

کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اہل کتاب سے موافقت پسند فرماتے تھے اس بات میں جس کا آپ کو حکم نہیں دیا گیا تھا۔ دیکھ لیجیے رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے مکّی زندگی میں عبادت میں اہل کتاب میں سے یہود کا قبلہ اختیار کئے رکھا۔ اور مدینہ شریف میں ہجرت فرمائے جانیکے بعد آپ پر تحویل قبلہ والی وحی نازل ہوئی تو اس وقت آپ نے بیت المقدس کی طرف عبادت میں منہ کرنا ترک کر دیا اور امت سے بھی ترک کرا دیا اب یہ اہل کتاب کی سنت دینیہ کا ہی اتباع تھا جسے بعد میں ترک کیا گیا۔

ابنِ مریم کے نزول کی پیشگوئی کی بناء پر مسلمانوں میں یہ عقیدہ پیدا ہوا۔ کہ عیسٰی علیہ السلام خاکی جسم کے ساتھ زندہ ہیں اور انہیں کا نزول اصالتًا ہوگا۔ براہین احمدیہ کے زمانہ میں خدا تعالٰے نے جب آپ کو عیسٰی قرار دیا۔ اور بتایا کہ آپ کا آنا بھی خدائی وعدہ کے مطابق ہے تو مسلمانوں کے اس عقیدہ کو جو در اصل غلط تھا رسمی طور پر نہ کہ تحقیقی طور پر ماننے کی وجہ سے آپ نے مسلمانوں کے اس رسمی عقیدہ کا ذکر کر دیا۔ کہ حضرت عیسٰی سیاست ملکی کے ساتھ آئیں گے پس اس کے اختیار کرنے میں جس طرح دیگر علماء اجتہادی غلطی میں مبتلا تھے اسی طرح آپ بھی غلطی میں مبتلا تھے اور اجتہادی غلطی میں انسان معذور سمجھا جاتا ہے بلکہ غلط اجتہاد سے بھی حدیث نبوی کے مطابق اسے ایک اجر ہی ملتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں۔ فان اصاب فلہ اجران وان اخطاء فلہ اجرٌ واحد۔ کہ اگر مجتہد کا اجتہاد درست ہو تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر غلط ہو تو اسے ایک اجر ملے گا۔ جب خدا تعالٰی نے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام پر اصل حقیقت واضح فرما دی کہ مسیح بن مریم رسول اللہ فوت

ہو گیا ہے اور آپ نے قرآن و حدیث کے مطابق اس عقیدہ کو درست پایا۔ اور قرآن و حدیث سے اس کو پرزور دلائل سے ثابت کر دیا۔ تو اب مسیح موعود علیہ السلام کے خلاف عقیدہ رکھنا جسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم و عدل قرار دیا ہے۔ گمراہی نہیں تو اور کیا ہے اب تو اس عقیدہ کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

آپ نے تیسری غلطی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق مثال نہ دینے کی بیان کی ہے۔ اگر حدیث سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا قبل از نزول وحی اہل کتاب کی سنن دینیہ کو اختیار کرنا ایک حقیقت کا بیان ہو تو اس کی مثال نہ دینا کوئی غلطی نہیں۔ ہم نے تو اب مثال بھی پیش کر دی جو یہود والے قبلہ کی تحویل کے متعلق ہے۔

چوتھی غلطی آپ نے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی طرف یہ منسوب کی ہے کہ:۔

"ملہموں کے رویہ کے خلاف رویہ اختیار کیا۔ وہ بغیر بلائے نہیں بولتے لیکن مرزا صاحب قرآن کے حوالہ سے بولے اور غلط بولے اور بغیر سمجھائے نہیں سمجھتے اور بغیر فرمائے کے کوئی جرات نہیں کرتے اور اپنی طرف سے کوئی دلیری نہیں کرتے۔ لیکن مرزا صاحب نے قرآن مجید سے غلط مطلب سمجھا اور بڑی دلیری سے اس کا اعلان کیا۔"

الجواب:۔ سیاق کلام کے لحاظ سے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی ایسی عبارت

کا مطلب یہ ہے کہ ملہموں کو جب تک خدا تعالیٰ الہام سے خود نہ سمجھائے وہ رسمی عقیدہ پر قائم رہتے ہیں خواہ علماء نے اسے باوجود اس کے غلط ہونے کے درست اور صحیح خیال کر رکھا ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تو قرآن و حدیث کی بناء پر براہین احمدیہ میں مسیح کی حیات کو کہیں ثابت نہیں کیا۔ صرف ان کی آمد کے عقیدہ کو بیان کر دیا ہے اور خود نہ خدا کے الہام کے ذریعہ سمجھائے بغیر وفاتِ مسیح کے قائل ہوئے اور نہ اپنے تئیں مسیح موعود مانا حالانکہ براہین احمدیہ کے زمانہ میں آپ کو یٰعیسٰی انی متوفیک۔ الہام میں آپ کو عیسٰی قرار دیا گیا تھا۔ مگر آپ نے دلیری اختیار کی کہ نہ اس وقت مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا نہ کوئی ایسا اعلان کیا۔ بلکہ ایسا اعلان اس الہام کے بعد کیا جس میں کہا گیا تھا:۔

"مسیح ابن مریم رسول اللہ فوت ہو چکا ہے اور اس کے رنگ میں ہو کر خدا کے وعدہ کے موافق تو آیا ہے۔" (ازالہ اوہام)

قرآن کریم کے حوالہ آیت ھو الذی ارسل رسولہ بالھدٰی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ سے علماء کے عقیدہ مسلمہ کا ہی ذکر کیا ہے کہ غلبۂ اسلام مسیح موعود کی آمد سے وابستہ ہے۔ اس آیت میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی حیات پر روشنی ڈالتا ہو۔ چونکہ علماء حیاتِ مسیح کے قائل تھے۔ آپ نے بھی انہی کے عقیدہ کے پیش نظر غلبۂ اسلام کو مسیح موعود کے زمانہ سے وابستہ قرار دیا۔ یہ استنباط فی نفسہٖ

تو درست تھا لیکن مسیح موعود کی شخصیت کے متعلق رسمی عقیدہ میں غلطی تھی جس کی بعد میں خدا تعالےٰ نے آپ پر وفات مسیح کا الہام کر کے اصلاح کر دی پس براہین احمدیہ میں کسی آیت سے آپ نے حیاتِ مسیح پر استدلال نہیں کیا۔ مسیح کی آمد ثانی کا عقیدہ علماء کی مسلّمہ تفسیر کے مطابق اس آیت کی بناء پر پیش کیا ہے۔ اپنی طرف سے حیاتِ مسیح علیہ السلام پر براہین احمدیہ میں کوئی بحث نہیں کی۔ یہ آیت اپنے ظاہری الفاظ سے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے۔ اور اس میں یہی بیان ہوا ہے کہ آپ کی بعثت سے ہی غلبۂ اسلام مقدر ہے۔ لیکن علماء نے روایات کی بناء پر اس غلبہ کو مسیح موعود کے زمانہ سے وابستہ قرار دیا اور اس رسمی عقیدہ کا حضرت مرزا صاحب علیہ السلام نے ذکر فرما دیا ہے اور پھر خدا تعالےٰ کی طرف سے بعد میں آپ پر کھل گیا کہ علماء کی یہ تفسیر تو درست ہے مگر مسیح جس سے غلبۂ اسلام وابستہ ہے وہ میں ہوں نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کی حیات اور آمدِ ثانی کا عقیدہ غلطی سے رسمی لحاظ سے قبل از تحقیق اختیار کیا تھا اس کے متعلق فی الواقعہ اپنی طرف سے کوئی بحث نہیں کی تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مثیلِ موسیٰ کی نسبت پہلے خیال کرتے تھے کہ وہ بنی اسرائیل میں آئیگا لیکن یہ حقیقت آپ پر بعد میں کھلی کہ مثیلِ موسیٰ کی آمد کی پیشگوئی میں "تمہارے بھائیوں میں سے" کے الفاظ بنی اسمٰعیل کے متعلق ہیں نہ کہ بنی اسرائیل کے متعلق۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو آپ نے فرما دیا: "خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی۔ اور اس قوم کو دی جائے گی جو اس کا پھل لائیگی۔

یہ خدا کی طرف سے ہُوا اور ہماری نظروں میں عجیب ہے۔

پس جس امر کو آپ پانچویں غلطی سمجھ رہے ہیں اس کا جواب بھی ہمارے اوپر کے بیان میں آگیا ہے۔

آپ کا اس وجہ سے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کو علم سے کورا اور عقل سے کورا قرار دینا۔ کہ وہ پہلے حیات مسیح کے رسمی عقیدہ پر قائم تھے اور بعد میں آیات قرآنیہ سے اور احادیث صحیحہ سے اور اجماع صحابہ سے آپ پر وفاتِ مسیح ثابت ہوئی محض گستاخی ہے۔

اصل حقیقت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الہاماً وفات مسیح کے متعلق اس انکشاف سے پہلے کہ آپ مسیح کے رنگ میں خدا کے وعدہ کے موافق آئے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو مثیل مسیح سمجھنے کے ساتھ ہی مسیح کی آمد ثانی کے رسمی عقیدہ کے بھی قائل تھے۔ چونکہ یہ عقیدہ منجملہ پیشگوئیوں کے ایک پیشگوئی تھا جس کی پوری حقیقت کا ظہور واقعہ کے وقوع پر ہی ہو سکتا تھا اور قبل از ظہور اس پیشگوئی کے مسیح کی آمد ثانی کا عقیدہ محققین کے نزدیک ایسی متشابہات کی قبیل سے تھا جن کی حقیقت مفوض الی اللہ ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن وغیرہ میں زیر آیت وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ خروج دجال اور نزول عیسٰی بن مریم کو ایسے ہی امور قرار دیا گیا ہے جن کی حقیقت مفوض الی اللہ تھی۔ ہاں اکثر کا گمان یہ تھا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور اصالتًا نزول فرمائیں گے۔ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام بھی رسمًا انہیں کے ہم خیال تھے۔ پس آپ کے نزدیک

اگر یہ لوگ علم و عقل کی رُو سے کورے نہ تھے تو اسی عقیدے کی وجہ سے حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کو اس بناء پر عقل و علم سے کورا قرار دینا کہ بعد میں آپ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وفاتِ مسیح اور اپنے مسیح موعود ہونے کا انکشاف ہو گیا۔ اور آپ نے وفاتِ مسیح کے عقیدہ کی صحت کے دلائل آیاتِ قرآنیہ، احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ سے تلاش کر لئے تو آپ کا اس مسئلہ میں اجتہادی غلطی کی بناء پر مرزا غلام احمد علیہ السلام کو علم و عقل سے کورا قرار دینا محض تعصب و بدگمانی کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بدگمانی اور تعصب سے بچائے۔ اور جس کو خدا تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے چنا ہے اس کی تکذیب سے دامن بچانے کی توفیق دے۔ ہم تو آپ کے لئے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اصل ہدایت خدا کی طرف سے ملتی ہے۔

آپ نے آیت فیھا تحیون وفیھا تموتون ومنھا تخرجون سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس استدلال کا ذکر کیا ہے کہ ہر بشر اپنی زندگی زمین پر ہی گزارے گا۔ آسمان پر جسم عنصری کے ساتھ نہیں جائے گا۔ اس آیت میں فیھا کو مقدم رکھکر حصر یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ مضمون درست ہے چونکہ قبل از انکشافِ حقیقت حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کی اس مضمون کی طرف پوری توجہ نہ تھی۔ اس لئے علماء کی موافقت میں آپ نے رسمی عقیدہ کے طور پر ہی عیسٰی علیہ السلام کی دوبارہ آمد کا ذکر براہین احمدیہ

میں تحریر کر دیا۔

بالآخر عرض ہے کہ آپ کی اس آخری چٹھی کا جواب بھی آپ کو نظارت اصلاح و ارشاد کی معرفت دیا جا رہا ہے۔ حضرت امام جماعت احمدیہ مرزا ناصر احمد صاحب ایدہ اللہ تعالےٰ نے آپ کی یہ چٹھی بھی ملاحظہ نہیں فرمائی اس لئے اس کے جواب کی ذمہ داری بھی آپ (امام صاحب) پر نہیں ہے۔ بلکہ نظارت پر ہے آپ کسی بات میں انہیں مطعون کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ فقط

والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔